SEPTEMBER 2011
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
عید نمبر
http://www.pakfunplace.com

کہی سنی — مدیر — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادو خاتون — 268

نالے کو رسا باندھنے والے — انشا جی — 20

میری ڈائری سے — امت الصبور — 264

باتیں فاطمہ آفندی سے — شاہین رشید — 32

انٹرویو

عید آئی ہے — ادارہ — 22
ایمن طارق سے ملاقات — شاہین رشید — 28

ناول

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — 36

مکمل ناول

جو بچے ہیں سنگ — فرحت اشتیاق — 76
سنہری دھوپ کا موسم — نایاب جیلانی — 152

ناولٹ

سفال گر — بشریٰ سعید — 228
پہلی اور آخری قسط — آسیہ رزاقی — 114

افسانے

یوٹرن — انیسہ سلیم — 257
چودہ گلاب — روا فاطمہ — 67
توکل — مائرہ انور — 110
جب چاند نظر آئے — رابعہ افتخار شیخ — 144
سانس آس اور نراش — ام ثمامہ — 60

غزل — ندا فاضلی — 259
غزل — شہزاد نیر — 259
نظم — زہرہ نگاہ — 260
غزل — ظہور احمد — 260

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

رنگا رنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 261
خبریں و دیگر — غزل ثوبان — 278
روشن حرف — تبصیر نشاط — 275

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 266

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — صبا سحر — 282
عید کے پکوان — خالدہ جیلانی — 284

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

ستمبر 2011
جلد 39 شمارہ 5
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

http://www.paktunplace.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ عید نمبر لیے حاضر ہیں۔

ہر قوم اور مذہب کے لوگوں کے کچھ تہوار ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے انداز سے خوشی مناتے ہیں لیکن مسلمانوں کے تہواروں کا انداز جدا گانہ ہے۔ ان میں عبودیت اور تشکر کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری اور اس کی مہربانیوں پر اظہار تشکر۔

عید الفطر مسلمانوں کا مذہبی تہوار ہے۔ عید کے معنی خوشی کے ہیں لیکن وطن عزیز پر نظر ڈالیں تو کہیں بھی کوئی خوش کن منظر نہیں ہے۔

عروس البلاد کراچی جو روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا وہاں آج اندھیروں کا راج ہے اور زندگی بھی منہ چھپائے پھرتی ہے۔

اندرون سندھ بارشوں نے تباہی کی ان گنت داستانیں رقم کی ہیں۔ بے گھر، بے سرو سامان، آزمائش میں مبتلا یہ لوگ ہماری بھی آزمائش ہیں۔ ان لوگوں کا ہاتھ تھام لیں۔ ان کے درد بانٹ لیں۔ انہیں اپنی خوشیوں میں شریک کر لیں۔ یہ بھی عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ عید ہم سب کے لیے حقیقی خوشیوں کا پیغام لے کر آئے۔ وطن عزیز کے ہر گھر میں خوشیوں کا راج ہو۔

خوش خبری،

نازیہ جمیل نے اگرچہ کم لکھا ہے لیکن اچھا لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار قارئین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے عید نمبر کے لیے مکمل ناول لکھا ہے جو تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ یہ ناول ان شاء اللہ آئندہ ماہ یعنی اکتوبر کے شمارے میں شامل ہو گا۔

اس شمارے میں،

اس ماہ فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کا پہلا حصہ شامل اشاعت ہے۔ اس ناول کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ فرحت اشتیاق نے نہ صرف اپنا معیار برقرار رکھا ہے بلکہ قارئین اس ناول کو ان کی دیگر تحریروں سے بڑھ کر ہی پائیں گی۔

نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول بھی پیش کر رہے ہیں۔ نایاب جیلانی کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن مختصر مدت میں انہوں نے قارئین کے دلوں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ ساتھ نایاب کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طوالت کے باوجود ان کی کہانیوں میں تسلسل اور دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔

- آسیہ رزاقی کا ناولٹ۔ پہلی اور آخری قسط، • بشریٰ [illegible] کا ناولٹ "سفالِ گر" تکمیل کے مراحل میں،
- انیسہ سلیم، ہما فاطمہ، ام ثمامہ، رابعہ افتخار شیخ اور عائزہ [illegible] کے افسانے،
- نگہت عبداللہ کا ناول "میرے خواب لوٹا دو"، • عید آئی ہے۔ قارئین سے سروے،
- معروف فنکارہ امین طارق سے ملاقات، • [illegible] کی فنکارہ فاطمہ آفندی سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قرض اچھے طریقے سے ادا کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے زیادہ بہتر لوگ وہ ہیں جو اچھے طریقے سے ادا کرتے ہیں۔"

دعا

حضرت عبداللہ بن ابو ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوۂ حنین کے موقع پر تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (غزوہ سے واپس) تشریف لائے تو انہیں قرض ادا کر دیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تیرے گھر بار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ ادھار کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔"

فوائد و مسائل: ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے۔ اچھے طریقے سے ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادائیگی کی جائے۔

جیسی چیز لی ہو، اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے، لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔

قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعائیں دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائیگی میں شامل ہے۔

قرض خواہ کو (سخت بات کہنے کا حق ہے)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض واپس مانگنے آیا، یا کسی اور مالی حق کا مطالبہ کرنے آیا۔ اس نے کچھ (نامناسب) الفاظ کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی تادیب کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی

http://www.pakfunplace.com

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رک جاؤ' قرض والے کو اپنے ساتھی (مقروض) پر اختیار ہوتا ہے' جب تک وہ ادائیگی نہ کردے۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ایک بدو (اعرابی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کسی قرض کا تقاضا کرنے آیا جو آپ کے ذمے تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت لہجے میں بات کی' حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا۔ اگر آپ ادا نہیں کریں گے تو میں آپ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کروں گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے ڈانٹا اور کہا۔

تجھ پر افسوس! کیا تجھے معلوم نہیں تو کس سے مخاطب ہے؟ اس نے کہا میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم نے حق والے کا ساتھ کیوں نہ دیا؟"

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا۔

"اگر تمہارے پاس کھجوریں ہیں تو ہمیں قرض دے دو' ہماری کھجوریں آئیں گی تو ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔"

انہوں نے کہا۔

"میرے ماں باپ آپ پر قربان' اے اللہ کے رسول! میں حکم کی تعمیل کروں گی۔"

انہوں نے آپ کو (کھجوریں) قرض دے دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کا قرض ادا کیا اور اسے کھانا کھلایا۔

اس نے کہا۔ "آپ نے مجھے پورا حق دے دیا' اللہ آپ کو پورا دے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایسے لوگ بہترین ہوتے ہیں۔ وہ قوم پاک نہیں ہوتی' جس میں کمزور کو پریشان کیے بغیر اس کا حق نہ دیا جائے۔"

فوائد و مسائل : قرض خواہ کو سختی کا حق حاصل ہے' لیکن افضل یہی ہے کہ تقاضا کرنے میں نرمی

کی جائے اور مقروض کو مناسب مہلت دے دی جائے۔

جاہلوں کے غلط رویے کا جواب سختی سے نہ دیا جائے بلکہ برداشت کیا جائے۔

حق دار کو اس کا حق اور قرض خواہ کو اس کا قرض بن مانگے ادا کرنا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کیا جائے کہ وہ جب مانگے گا تب دے دیں گے۔

قرض (کی عدم ادائیگی) کی وجہ سے قید کرنا اور ساتھ رہنا

حضرت عمرو بن شرید رحمتہ اللہ اپنے والد (حضرت شرید ثقفی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ادائیگی کی طاقت رکھنے والا ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہو جاتا ہے۔"

(امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ کے استاد) علی بن محمد طنافسی رحمتہ اللہ نے فرمایا۔

بے عزتی کرنے سے مراد اس کی شکایت کرنا اور سزا سے مراد قید کرنا ہے۔

فوائد و مسائل : قرض بروقت ادا کرنا ضروری ہے۔ معقول عذر کے بغیر تاخیر جائز نہیں۔

اگر مقروض وقت پر قرض ادا نہ کرے تو اس کے خلاف حکمران یا قاضی سے شکایت کی جا سکتی ہے۔ حاکم اور قاضی کا فرض ہے کہ حق دار کو اس کا حق دلوائیں۔

اگر مقروض واقعی قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے یا بیت المال سے اس کی مدد کی جائے۔ بیت المال کا انتظام موجود نہ ہونے کی صورت میں دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے سے اس کی مدد کریں۔

جن جرائم میں حد نہیں ان میں مجرم کو تعزیر کے طور پر قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

مقروض

حضرت ہرماس بن حبیب رحمتہ اللہ اپنے والد (حضرت حبیب بن ثعلبہ) سے اور وہ ہرماس کے دادا (حضرت ثعلبہ تمیمی عنبری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا۔ میں اپنے ایک مقروض کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔

"(یہ جہاں جائے) اس کے ساتھ رہو۔" پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت میرے پاس سے گزرے تو فرمایا "اے بنی تمیم کے بھائی! تمہارے قیدی کا کیا بنا؟"

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت عبداللہ بن ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے ان کے ذمے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ان کی آوازیں سن لیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو آواز دی' انہوں نے کہا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنے قرض میں سے اتنا معاف کر دو۔" اور ہاتھ سے نصف کا اشارہ کیا (آدھا قرض چھوڑ دو)

انہوں نے کہا "میں نے معاف کیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابن ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا۔ "اٹھو اس کا قرض ادا کرو۔"

فوائد و مسائل : قرض خواہ مقروض سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر سکتا ہے۔

دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو صلح کرا دینی چاہیے۔ خاص طور پر وہ شخص جس کو جھگڑنے والوں پر کسی قسم کی فضیلت حاصل ہو۔ اور اس کی بات مانی جاتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کرائے۔

صلح کے لیے صاحب حق اپنا کچھ حق چھوڑ دے تو بہت ثواب کی بات ہے۔

قرض دینا

حضرت قیس بن رومی رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ حضرت سلیمان بن اذنان رحمتہ اللہ نے حضرت علقمہ رحمتہ اللہ کو ان کا وظیفہ (تنخواہ) ملنے تک کی مدت کے لیے ایک ہزار درہم قرض دیا۔ جب انہیں وظیفہ ملا تو انہوں (سلیمان) نے ان سے سختی سے (قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا۔

علقمہ رحمتہ اللہ نے ادائیگی کر دی لیکن انہیں ناراضی محسوس ہوئی (کہ اتنی سختی سے تقاضا کیا ہے) چند ماہ ٹھہر کر وہ (پھر) ان کے پاس آئے اور کہا۔

"مجھے تنخواہ ملنے تک ایک ہزار درہم قرض دے دیں۔"

انہوں نے کہا۔

"ہاں (میں بڑی خوشی سے آپ کا) احترام کرتے ہوئے (آپ کو قرض دیتا ہوں' پھر اپنی بیوی سے کہا) اے ام عتبہ! تمہارے پاس جو مہر بند تھیلی ہے' وہ لے آؤ۔ وہ لے آئیں تو (علقمہ سے) کہا۔ قسم ہے اللہ کی! یہ آپ کے وہی درہم ہیں' جو آپ نے مجھے ادا کیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی اِدھر اُدھر نہیں کیا۔"

علقمہ رحمتہ اللہ نے کہا۔ "کیا خوب! آپ نے مجھ سے جو سلوک کیا' اس کی کیا وجہ؟"

انہوں نے کہا۔ (اس کی وجہ وہ حدیث تھی) جو میں نے آپ سے سنی۔ انہوں نے کہا۔ آپ نے مجھ سے کون سی حدیث سنی؟ سلیمان نے کہا۔ میں نے آپ (علقمہ) کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو مسلمان دوسرے مسلمان کو دوبارہ قرض دیتا ہے' وہ ایک بار اتنا صدقہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔"

علقمہ رحمتہ اللہ نے فرمایا مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (واقعی) اسی طرح حدیث

http://www.pakfunplace.com

سنائی تھی۔

قرض کا ثواب

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔ میں نے کہا۔

"اے جبریل! کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟" انہوں نے کہا اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے، حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت (اور مجبوری) کی حالت ہی میں قرض لیتا ہے (کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے' اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے۔")

حضرت یحییٰ بن ابو اسحٰق ہنائی رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

ایک آدمی اپنے بھائی کو مال بطور قرض دیتا ہے' پھر وہ (مقروض) اسے کچھ تحفہ دے دیتا ہے (کیا یہ مناسب ہے؟)

انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے کوئی شخص جب (کسی کو) قرض دے' پھر (مقروض) اسے تحفہ دے یا سواری کے لیے جانور پیش کرے تو (قرض خواہ کو چاہیے کہ) وہ اس پر سواری نہ کرے اور نہ وہ (تحفہ) قبول کرے' سوائے اس کے کہ ان دونوں میں پہلے سے (تحفے تحائف کا) یہ سلسلہ جاری ہو۔"

فوت شدہ کی طرف سے قرض کی ادائیگی

حضرت سعد بن اطول جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا بھائی فوت ہو گیا اس نے تین سو درہم (ترکہ) چھوڑا اور بال بچے بھی چھوڑے۔ میں نے چاہا کہ یہ مال اس کے بیوی بچوں پر خرچ کروں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے قید ہے' اس لیے اس کا قرض ادا کرو۔"

تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا۔

اے اللہ کے رسول! میں نے اس کا (سارا) قرض ادا کر دیا ہے' سوائے دو دینار کے۔ ایک عورت ان کا دعوا کرتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت (گواہی وغیرہ) نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسے دے دو وہ سچی ہے۔"

فوائد و مسائل: بیوی بچوں پر خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مال ان کے حوالے کر دیا جائے' یا اس سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں کیونکہ مرنے والے کے ترکے میں سے بیوی کا حصہ مقرر ہے' جو باقی بچے وہ بچوں کا ہے۔

وراثت میں بعض افراد کا حصہ مقرر ہے۔ انہیں حصہ دینے کے بعد باقی مال قریبی رشتے داروں کو ملتا ہے۔ انہیں "عصبہ" کہتے ہیں۔ عصبہ افراد میں بیٹا' بھائی پر مقدم ہے۔

ترکے کی تقسیم قرض کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔

عورت کا یہ دعوا تھا کہ مرنے والے کے ذمے اس کے دو دینار تھے۔ حضرت سعد بن اطول رضی اللہ عنہ اپنے اطمینان کے لیے گواہی طلب کرتے تھے۔ عورت کے پاس گواہی نہ تھی' اس قسم کی مشکلات سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ قرض کا لین دین تحریر میں لانا چاہیے اور گواہ بھی مقرر کیے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ عورت کا دعوا درست ہے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو دینار دلوا دیے۔

قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں فوت ہونے والے کو اللہ کے ہاں قید کیا جاتا ہے لیکن یہ قید صرف جنت میں داخلے سے رکاوٹ ہے' اس کی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق نہیں بن جاتا۔ واللہ اعلم

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد (حضرت عبداللہ بن حرام انصاری رضی اللہ عنہ) فوت ہوئے تو ان کے ذمے ایک یہودی کا تیس وسق غلہ قرض تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے مہلت مانگی تو اس نے مہلت دینے سے انکار کر دیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ یہودی سے ان کی سفارش کر دیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لے جا کر یہودی سے بات چیت کی (اور یہ پیش کش کی) کہ ان پر جو قرض ہے اس کے بدلے وہ ان کی کھجوروں کا سارا پھل لے لے تو اس (یہودی) نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو مہلت دینے کو کہا تو اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجوروں کے باغ میں تشریف لے گئے اور درختوں کے درمیان چلے' پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

"پھل اتارو اور اس کا حق پورا دے دو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد انہوں نے پھل اتار کر تیس وسق کھجوریں اس (یہودی) کو دے دیں اور بارہ وسق کھجوریں بچ گئیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس واقعہ کی خبر دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جابر رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر اطلاع دی کہ انہوں نے اس (یہودی) کو پوری ادائیگی کر دی ہے اور جو مقدار بچ گئی تھی وہ بھی بتائی' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عمر بن خطاب کو بھی یہ بات بتاؤ۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انہیں یہ بات بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (باغ) میں چل رہے تھے تو مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس پھل میں ضرور برکت عطا فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد پر اور بھی بہت سے لوگوں کا قرض تھا۔ ان کے بارے میں دوسری احادیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ یہودی ان قرض خواہوں میں سے ایک تھا۔

اس یہودی کے سوا دوسرے قرض خواہوں کو ادائیگی کرتے وقت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماپ کر ہر ایک کو اس کا قرض ادا کیا تھا۔

کھانے پینے کی چیزوں میں یہ برکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو متعدد مواقع پر ظاہر ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا زیادہ تھا کہ انہیں معجزہ ظاہر ہونے سے پہلے ہی یقین ہو گیا کہ یہ واقعہ یوں پیش آئے گا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت اور شان کا اظہار ہوتا ہے۔ "وسق" ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے جس کی کل مقدار ہمارے یہاں کے اعتبار سے تقریباً چار من بنتی ہے۔

http://www.paktunplace.com

نالے کو رسا باندھنے والے

انشاجی

بے شک ہم نے پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ وزیر خزانہ عقیلی صاحب نے عظیم تر کراچی کو پانی کی بہم رسانی کے منصوبے کے لیے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ اس منصوبے پر اتنی جلدی عمل ہو گا اور ہماری انقرہ سے واپسی کا انتظار بھی نہ کیا جائے گا۔ عقیلی صاحب کا بیان پڑھنے کے بعد ہم کئی دن کپڑے اتارے ٹونٹی کھولے نل کے نیچے بیٹھے رہے۔ آخر مایوس ہو کر چل دیے کہ اچھا بحیرہ روم میں نہالیں گے۔ آبنائے باسفورس میں ڈبکی لگا لیں گے۔ ہمارے جانے کی دیر تھی کہ پانی کھل گیا اور ایسا آسمان کا چھپر پھاڑ کر کھلا کہ لوگوں کے گھروں میں ایک غسل خانے تو ضرور سوکھے رہے۔ باقی ہر جگہ جل تھل ہو گیا۔ ہم یہ خبر پاتے ہی بھاگے بھاگے کراچی واپس آئے اور جلدی سے نل کھول بالٹی آگے کی۔ اس میں سے ایک سرد آہ نکلی ہم ایک مصرع ٹپکا۔

جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

☼ ☼ ☼

اصل میں قصور ہمارا ہے۔ ہم پانی کے لیے کالم پر کالم تو لکھتے رہے لیکن یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ہم پانی نلکوں کے راستے چاہتے ہیں۔ براہ راست نہیں کیونکہ ہم کوئی گوالے تھوڑا ہی ہیں۔ نہ پانی کے جانور ہیں۔ ہمارا خیال تھا' کے ڈی اے والوں نے عظیم تر کراچی کے لیے پانی کی بہم رسانی کا منصوبہ عقیلی صاحب کو پیش کرتے ہوئے یہ بات صاف کر دی ہو گی کیونکہ عقیلی صاحب کراچی میں نہیں رہتے وہ ان رموز کو کیا جانیں کہ ہمیں پانی کی کتنی ضرورت ہے اور کس طور ضرورت ہے۔ خیر بندہ بشر ہے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال آئندہ کے لیے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ ہمیں پانی فقط اتنا چاہیے کہ خود پی سکیں۔ اتنا نہیں کہ ہمیں پی جائے۔

☼ ☼ ☼

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ غلط فہمی خود ہمیں ہوئی ہے۔ پانی کی اس ریل پیل سے جو ہمارے بعد کراچی میں ہوئی۔ عقیلی صاحب کا کچھ تعلق نہیں۔ عظیم تر کراچی کے لیے پانی کا عظیم تر منصوبہ تو ابھی تک ان کی ٹرے میں سوکھا پڑا ہے۔ یہ کارگزاری کہئے یا کارستانی کارکنان قضا و قدر کی ہے۔ ان بزرگوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے محکمہ موسمیات پر بات ڈالی کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں ان کی پیش گوئی سن کر کرتے ہیں۔ اس سے سر مو انحراف کی ہمیں مجال نہیں۔ کے ڈی اے والے اپنا قصور صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ ہم نے ابر کرم کا پرمٹ فقط ابن انشا کے لیے جاری کرنے کی استدعا کی تھی کیونکہ یہی بڑھ بڑھ کر کالم لکھتا تھا اور محرم کے دنوں میں بھی پانی کے لیے ہمیں تنگ کرتا تھا۔ باقی مخلوق محض اس کے ساتھ میں رہنے کی وجہ سے ماری گئی۔ یہی ہر کام کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بھینس کالونی والوں نے اقرار کیا کہ بے شک ہم چاہتے تھے دودھ کی کمی پوری ہونے کی کوئی سبیل نکلے لیکن یہ منشا ہماری بھی نہ تھی کہ اس سبیل کی ٹونٹی پوری کھول کر اس زناٹے کا تریڑا دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ہماری دعا کا پتا غلط ہو گیا اور یہ عالم بالا پر اس شاعر کو موصول ہو گئی جس نے لکھا تھا۔

روئے پہ باندھ لے جو مری چشم تر کمر

کیسی زمین فلک پہ ہو پانی کمر کمر

☼ ☼ ☼

چند ماہ ادھر کی بات ہے کہ لاہور میں مینہ برسا اور چھاجوں برسا۔ لوگوں کے سوکھے دھانوں پر پانی پڑا تو ہر کسی نے یہ جتانے کی کوشش کی کہ ویسے تو من آنم کہ من دانم۔ لیکن یہ بارش بندے نے برسوائی ہے مجھ ہی گناہ گار نے اللہ میاں کو اشارہ کیا تھا کہ ہاں اب اجازت ہے۔ ہمارے دوست میاں انتظار حسین نے طبعی انکسار کی بنا پر اپنا نام تو نہ لیا ہاں ساری داد اپنے اور ہمارے دوست ناصر کاظمی کی جھولی میں ڈال دی کہ انہوں نے ایک غزل لکھی تھی وہ ہم نے ٹیلی ویژن پر ان سے گوائی اور برسا ہو۔ بادلوں کو اڈ گھمنڈ کر آتے ہی بنی۔ اس تجربے کے پیش نظر ہم نے بخاری صاحب سے عرض کیا تھا کہ "کراچی میں ٹیلی ویژن کے خداوند آپ ہیں۔ یہاں بھی تان سینوں اور بیجو باوروں کی کمی نہیں آپ بھی کسی کو پکڑیے۔ ٹیلی ویژن کا اسٹوڈیو تو ابھی نہیں بنا۔ لیکن کھمبے تو گڑ گئے ہیں۔ ایک کھمبے پر اسے چڑھا کر حکم دیجیے کہ ملہار گا۔ مجھے معقول پیسے دیں گے۔ لیکن پہلے چھتری تان لے ورنہ بھیگ جائے گا۔

کیا عجب بخاری صاحب نے ہماری یہ فرمائش ریڈیو کے فرمائشی پروگرام کو بھیج دی ہو۔ جواب تک ان کی بات مانتے ہیں کیونکہ انقرہ میں جمعرات 27 جولائی کو ہم نے بارش کی تباہی کا سن کر فکرمندی سے ریڈیو کھولا تو یہاں گیارہ بجے دن کی خبریں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا قیامت برپا ہے۔ جونہی خبریں ختم ہوئیں۔ پہلا ریکارڈ یہی سنائی دیا۔

جھوم جھوم کر برسو بادل جھوم جھوم کر برسو۔

☼ ☼ ☼

خیر ہمیں شاعری اور نغمے کی تاثیر سے انکار نہیں اور یہ بھی تسلیم کہ ہمارے ہاں ایسے باکمال شاعر اور نغمہ سرا گزرے ہیں کہ گلیوں کوچوں میں صدا لگاتے پھرتے ہیں۔ بارش برسوا لو بارش۔ آپ کو اپنے لان میں پانی دینا ہے' تو آواز دی کہ "میاں ذرا آدھ انچ

بارش چاہیے۔ کتنے پیسے لو گے؟ معاملہ پٹا تو اس نے فوراً "برساتی" کو ڈھ کان پر ہاتھ رکھ کر ایک تان لگائی۔ آدھ انچ بارش برس چکی تو خود بخود دھوپ نکل آئی۔

پرانے زمانے میں ایک بات یہ اچھی تھی کہ بارش زیادہ ہو جائے۔ جیسی کراچی میں ہونے لگی ہے تو نالے کو رسا باندھنے والے بھی مل جاتے تھے۔ اب کسی ناصر کاظمی یا بڑے بارش علی خاں سے کہئے تو کہ میاں ذرا اور گلی نالے کو رسا باندھ اور روک۔ جھونپڑیاں بہی جا رہی ہیں۔ آج کل یہ فن شریف نا پید ہو گیا ہے۔ جس طرح آتش بازی پر پابندی لگنے کے بعد سے دیپک راگ گانے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے

☼

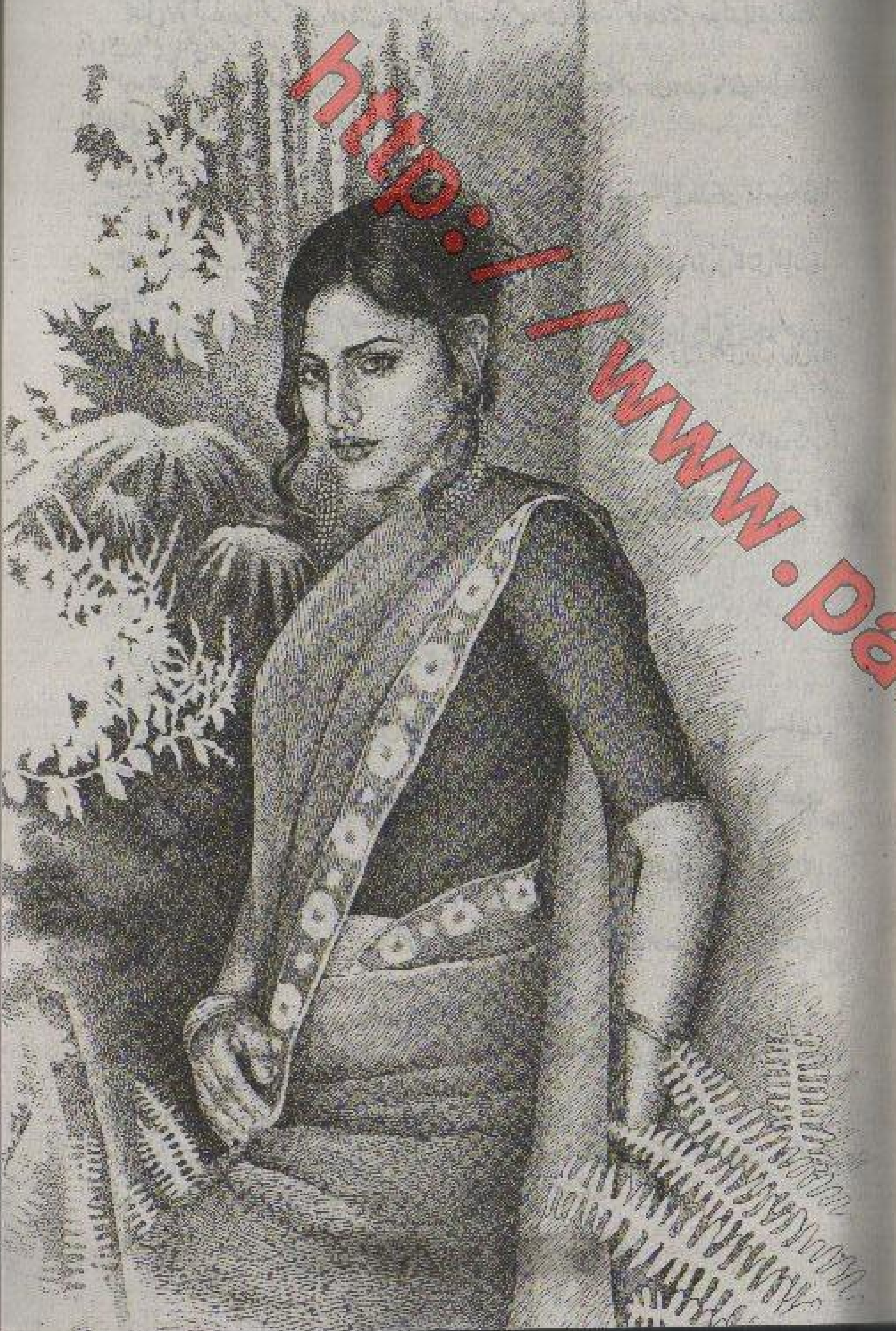

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں' سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی' خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ' جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے' جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد' اجلال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین' اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوگئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

۲
دوسری قسط

http://www.pakfunplace.com

"بھائی کو تو آنے دو یا اگر تمہیں اور بلال کو بھوک لگی ہے تو تم دونوں کھالو۔" ساجدہ بیگم نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔

"او ہو امی! میں اور بلال بھوک برداشت کر سکتے ہیں۔ میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہی ہوں' رازی بھائی کے انتظار میں مت بیٹھا کریں۔" ثنا نے کہا تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔

"کیا کروں اس کے بغیر نہیں کھایا جاتا۔"

"اتنے برسوں سے ان کے بغیر ہی کھا رہے تھے ناں ہم لوگ۔ چند دنوں میں آپ نے اپنی روٹین خراب کرلی۔" ثنا ناراضی سے بولی تھی۔

"ثناء!" ساجدہ بیگم نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا تو وہ منہ پھلا کر جانے لگی۔ تب ہی رازی کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔

"لو آگیا رازی۔ جاؤ لگاؤ کھانا۔ بلال کو بھی بلاؤ۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ بلال کو پکارتی ہوئی چلی گئی۔ چند لمحوں بعد رازی اندر آگیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بہت دیر کر دیتے ہو۔ جاؤ اب جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ۔ ثنا کھانا لگا رہی ہے۔" ساجدہ بیگم کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی آپ چلیں' میں آرہا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ساجدہ بیگم ڈائننگ روم میں آ گئیں۔ بلال سالن کی ڈش میں چمچ گھما کر ثناء سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا بنایا ہے؟"

"مغز۔" ثنا جانے کیوں تپی ہوئی تھی۔

"کس کا؟" بلال نے اس کا تپنا محسوس کر کے مزید چھیڑنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"اپنا۔" تڑاخ سے جواب آیا تھا۔

"میں بھی یہی سمجھ رہا تھا' بس تم سے تصدیق کروانا چاہ رہا تھا۔" بلال نے انتہائی معصوم شکل بنا کر کہا۔ ساجدہ بیگم قصداً" خاموش رہیں۔

"دیکھ رہی ہیں امی آپ اسے؟" ثناء نے شکایتاً کہا۔ جواب میں بلال کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رازی کے آنے پر شرارت سے مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"لو بیٹا!" ساجدہ بیگم نے سالن کی ڈش اٹھا کر رازی کے آگے رکھ دی تو اس نے پہلے ان کی پلیٹ میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ میں نکال کر ڈش ثنا کی طرف بڑھا دی۔

"بھائی! سارے خاندان والے آپ سے ناراض بیٹھے ہیں۔" ثناء نے ڈش تھامتے ہوئے کہا تو رازی حیران ہوا۔

"مجھ سے کیوں؟"

"ظاہر ہے سب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ کی باقاعدہ دعوت کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہیں کہ آتے ہی مصروف ہو گئے۔ پرسوں ممانی جان شکایت کر رہی تھیں۔ ہے ناں امی؟"

ثناء نے آخر میں ساجدہ بیگم کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"کام زیادہ ضروری ہے۔ دعوتوں میں وقت ہی ضائع ہوگا۔ باقی ملنا ملانا تو چلتا ہی رہے گا۔" وہ سہولت سے کہہ کر کھانے میں مصروف ہو گیا پھر اچانک جانے کیا خیال آیا' ثناء کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"تم کالج جا رہی ہو.....؟"

"ہوں.....!" ثنا منہ میں نوالہ ڈال چکی تھی اس لیے ہوں کی آواز نکالی۔

"سارہ سے ملاقات ہوتی ہے؟" رازی کا اگلا سوال تھا۔ ساجدہ بیگم چونک گئیں۔

"جی۔ لیکن اب وہ پہلے کی طرح نہیں ملتی۔ بہت روڈ ہو گئی ہے۔ صاف لگتا ہے جیسے بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔"

ثناء کچھ زیادہ بولنے لگی تھی کہ ساجدہ بیگم نے کہنی مار کر اسے خاموش کرا دیا پھر کن اکھیوں سے رازی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ثنا ساجدہ بیگم کی بیٹی تھی لیکن ان کی کوئی بات' کوئی خوبی اس میں نہیں آئی تھی۔ ساجدہ بیگم جتنی منکسر المزاج' متحمل اور بردبار تھیں' ثنا اسی قدر بے صبری' تنگ مزاج اور اس کے اندر جلن کا مادہ بھی تھا۔ یہ تو ساجدہ بیگم کا رعب تھا جو اسے بے لگام ہونے سے روکے رہتا تھا۔ ورنہ اس کے اندر بڑی بغاوت تھی۔ بہرحال جب سے اریبہ منگنی کی انگوٹھی واپس کر گئی تھی' تب سے وہ صرف اس سے ہی نہیں اس کے پورے گھر سے خار کھانے لگی تھی اور اس نے چاہا تو یہ تھا کہ اس بات کو باقاعدہ سارے میں نشر کر دیا جائے۔ لیکن یہاں ساجدہ بیگم نے بہت سختی برتی تھی اور یہ کہا تھا کہ رازی کے آنے کے بعد حالات دیکھتے ہوئے کوئی فیصلہ ہوگا۔ یعنی اگر رازی نے بھی اس رشتے سے انکار کر دیا تب کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور اب تو مسئلہ ہی مسئلہ تھا۔

رازی اریبہ کی اس حرکت سے ناراض ضرور تھا لیکن اس سے ناتا توڑ لینے کے حق میں نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ساجدہ بیگم کو توصیف احمد سے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ پھر جس طرح وہ بزنس میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس سے ثنا تلملائی ہوئی تھی۔ وہ یہ سوچتی کہ اریبہ کی وجہ سے بھائی اس سے بلکہ پورے خاندان سے دور ہو گیا ہے۔ گو کہ یہ سوچنے میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خود غرض بھی ہو گئی تھی۔ یعنی اسے یہ احساس نہیں تھا کہ رازی کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ بس یہ چاہتی تھی کہ رازی فوراً" اریبہ کی محبت دل سے نکال پھینکے۔

"اریبہ کوئی ایسی حور پری نہیں ہے جس کے لیے جوگ لیا جائے۔ میں رازی بھائی کے لیے اس سے اچھی لڑکی لاؤں گی۔" اس وقت وہ اپنی ماموں زاد سنبل کے سامنے اچانک پھٹ پڑی تھی۔

"ارے کیا تمہاری لڑائی ہو گئی ہے اریبہ سے؟" سنبل اس کے مزاج سے واقف تھی جب ہی بولی تھی۔

"جی نہیں۔ میں کیوں لڑوں گی اس سے۔ ایسے لوگوں کو تو میں منہ ہی نہیں لگاتی۔"

"بری بات۔ وہ تمہاری بھابھی بننے والی ہے اور وہ بھی بڑی۔" سنبل نے ٹوک کر کہا تو اب وہ کچھ رازداری سے بولی تھی۔

"نہیں سنبل آپی! وہ بات ختم ہو گئی۔ میرا مطلب ہے منگنی ٹوٹ گئی۔"

"کیا! کب؟" سنبل شاکڈ نہیں ہوئی تھی بلکہ شاید اس کی دلی مراد بر آئی تھی۔ البتہ حیران ضرور ہوئی۔

"بہت دن ہوئے۔" ثنا لاپروائی سے بولی۔ "اچھا ہوا سنبل آپی! مجھے اریبہ شروع ہی سے پسند نہیں تھی۔"

"لیکن وہ دونوں تو ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔" سنبل کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

"کرتے تھے۔ اب تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ خیر چھوڑیں' یہ بتائیں' آپ ہمارے گھر کب آ رہی ہیں؟" ثنا نے سر جھٹک کر سنبل کا ہاتھ تھام لیا اور لگاوٹ کا مظاہرہ کرنے لگی۔

http://www.pakfunplace.com

"تم کہہ رہی ہو منگنی ٹوٹے بہت دن ہو گئے لیکن میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی۔" سنبل کا ذہن اسی بات میں الجھا تھا۔

"کیسے سنتیں۔ امی نے کسی کو بتایا ہی نہیں اور ہمیں بھی بتانے سے منع کیا ہے۔ یہاں تک کہ توصیف چچا کو بھی پتا نہیں ہے۔" ثنا سوچے سمجھے بغیر معلومات فراہم کر رہی تھی۔

"مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہیں ثنا یعنی اتنی بڑی بات ہو گئی اور کسی کو پتا ہی نہیں۔ توصیف انکل بھی بے خبر ہیں اور خالدہ آنٹی؟" سنبل نے الجھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"خالدہ آنٹی کو آپ بتا دیں ناں تاکہ توصیف چچا تک بات پہنچ جائے۔ امی پتا نہیں کیوں چھپائے بیٹھی ہیں۔ آپ بتائیں چھپانے کا کوئی فائدہ ہے کیا۔ کم از کم توصیف چچا کو تو ضرور خبر ہونی چاہیے۔ آخر وہ اریبہ کے باپ ہیں۔" ثنا نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا۔

"ہوں......!" سنبل نے یونہی سر ہلا دیا تھا۔

"پتا ہے سنبل آپی! میں تو آپ کو اپنی بھابھی بنانا چاہتی ہوں۔" ثنا اپنے مطلب پر آ گئی۔ سنبل چونک کر اسے دیکھنے لگی تو جلدی سے بولی۔

"مجھے لگتا ہے امی بھی یہی چاہتی ہیں۔ بس انتظار کر رہی ہیں کہ رازی بھائی سیٹ ہو جائیں اور جو اپنی اجڑی محبت کا ماتم کر رہے ہیں۔ اس سے بھی نکل آئیں پھر وہ آپ کے لیے بات کریں گی۔"

سنبل کا دل گو کہ ہلکورے لینے لگا تھا۔ لیکن بظاہر سنجیدگی سے ثنا کو دیکھنے لگی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں سنبل آپی! میں امی کا ارادہ بھانپ کر ہی آپ کے پاس آئی ہوں اور ساری بات آپ کو بتا دی ہے۔ صرف اس لیے کہ آپ رازی بھائی کو سنبھال سکتی ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" سنبل چونکی تھی۔

"میرا مطلب ہے وہ بے چارے بہت ڈسٹرب ہیں۔ منگنی ٹوٹنے سے ان کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ اگر آپ ٹوٹے دل کو جوڑ سکیں تو یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہو گا۔ میں رازی بھائی کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز سنبل آپی!" ثنا آزردہ لہجے میں بولتے ہوئے روہانسی بھی ہو گئی تھی۔

"اوہو...... رو تو مت۔" سنبل اسے پچکار کر بولی۔ "میں کوشش کروں گی۔"

"سچ سچ سنبل آپی!" ثناء خوش ہو گئی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سنبل اپنے کسی خیال پر مسکرانے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کی تازہ ہوا میں خوشگوار سی ٹھنڈک تھی۔ جب ہی وہ اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن مرغے کی چنگھاڑتی ہوئی آواز کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔ اس نے بہت جتن کیے 'کبھی کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں۔ کبھی تکیہ سر پہ رکھا لیکن بے سود۔ آخر جھنجلا کر آنکھیں کھولیں تو دور تک پھیلا شفاف آسمان کو دیکھتے ہی اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑے دنوں بلکہ مہینوں بعد وہ آسمان کو اس کے اصل رنگ میں دیکھ رہا تھا۔ ورنہ شہر میں تو باقی ہر شے کی طرح آسمان بھی اپنا اصل رنگ کھو چکا تھا۔ اس کی نظریں ایک جگہ ٹھہری نہیں رہی تھیں۔ حالانکہ دور تک کہیں کسی دوسرے رنگ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جانے اس کے اندر کیسی سرشاری تھی کہ نظر ٹھہر رہی تھی نہ دل۔ گو کہ اس کے لیے یہ سادہ مگر دل فریب منظر نیا نہیں تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا یہیں پلا بڑھا تھا۔ زندگی کے ابتدائی پندرہ سال اس نے اسی گاؤں میں گزارے تھے۔ اس کے بعد بھی اس کا آنا جانا تو رہتا ہی تھا۔ چھٹیوں میں '

امتحانوں کے بعد لیکن تب شاید اسے اتنا شعور نہیں تھا یا شاید حالات کو اپنے تابع کرنے کی جستجو اور انتھک محنت نے اسے زندگی کی بہت سی رنگینیوں سے دور کر دیا تھا بجز تاباں...... ابھی بھی وہ ابا کی آواز پہ چونکا تھا۔

"ابا! اتنا دن چڑھ آیا۔ اب اٹھ بھی جا۔" تاباں اپنے ابا سے کہہ رہی تھی لیکن وہ سمجھ گیا 'درحقیقت اسے مخاطب کر رہی ہے۔ اس کا سارا دھیان دیوار کے اس طرف منتقل ہو گیا تھا۔

"پراٹھا بنا دیا ہے ابا! اور تو کھیر شوق سے کھاتا ہے ناں' میں نے تیرے لیے کھیر بھی بنا دی ہے۔"

"ہیں کملی! پھر کھیر۔ کتنی بار کہا ہے سوجی کا حلوہ بنا دیا کر۔" تاباں کا ابا کھیر کا سن کر بدمزہ ہوا تھا جبکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"تو اب میں کھیر کا کیا کروں۔ چل پڑوس میں دے آؤں گی اور ہاں ابا جلدی آیا کر ناں۔ اتنی دیر کر دیتا ہے' میری آنکھیں تھک جاتی ہیں تیری راہ تکتے تکتے۔"

وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

"آئندہ اگر اتنی دیر کی تو میں سچ مچ ناراض ہو جاؤں گی' تجھے پتا ہے ناں میرا غصہ بڑا خراب ہے۔"

تاباں کا ابا بیٹی سے زیادہ حقے میں مصروف تھا جب ہی ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ اس کا دل چاہا دیوار سے جھانک کر دیکھے' وہ کہاں بیٹھی ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں اس کا ابا نہ دیکھ لے' وہ تکیہ اٹھا کر سیڑھیاں اتر آیا۔ اس کے ابا صحن میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

"السلام علیکم ابا......!" وہ ان کے سامنے بچھی چارپائی پہ تکیہ پھینک کر پھر وہیں لیٹ گیا۔

"جیوندا رہ۔ رات ٹھیک سویا؟" ابا نے دعا کے ساتھ پوچھا۔

"جی ابا! مزے کی نیند آئی اور یہ آپ کیا خالی پیٹ حقہ گڑگڑانے بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے کچھ کھا پی لیا کریں۔" اس نے جواب کے ساتھ ٹوک بھی دیا لیکن ابا پہ کچھ اثر نہیں ہوا۔ اپنا شغل جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"اس بار تو پورے چار مہینے بعد آیا ہے اور چار دن میں اکتا بھی جائے گا 'کیوں تیرا دل نہیں لگتا یہاں؟"

"نہیں......!" وہ بے ساختہ کہہ کر پھر فوراً وضاحت کرنے لگا تھا۔ "یہاں میرے لیے کچھ نہیں ہے ابا! میں جو پڑھ رہا ہوں' اس کے بعد یہاں آپ کے ساتھ کھیتی باڑی تو نہیں کر سکتا۔"

"کیوں کھیتی باڑی کرنے سے تیری شان گھٹ جائے گی۔" ابا نے برا مان کر ٹوکا تو وہ محض تکرار سے بچنے کی خاطر بہن کو پکارنے لگا۔

"تاجور...... تاجور!"

"جی بھائی۔" تاجور بھاگی آئی تھی۔

"چائے......" وہ چائے کہتے کہتے رہ گیا اور بے اختیار تاجور کی کلائی پکڑ کر پوچھنے لگا۔

"تم اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہو۔ کھاتی پیتی نہیں ہو کیا؟"

"کھاتی ہوں۔" تاجور کی آواز دھیمی تھی۔

"کیا کھاتی ہو......؟"

"وہی جو تو وہاں سے بھیجتا ہے۔" ابا پہلے بول پڑے۔ "گھی شکر 'دودھ ملائیاں' وہ سارا یہی تو کھاتی ہے۔"

"ابا! کیا ہو گیا ہے؟" وہ بری طرح جھنجلایا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے۔ چار دن کے لیے آتا ہے 'دماغ خراب کر جاتا ہے اس کا۔ میری ایک صرف یہ اولاد نہیں ہے۔ اور بھی ہیں۔ میں جتنا کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔" ابا کو غصہ جانے کس بات کا تھا جو منہ میں آیا بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اس نے سر جھٹک کر تاجور کو دیکھا۔ وہ نو عمر معصوم لڑکی خائف کھڑی تھی۔ تب وہ زبردستی مسکرایا اور تاجور

http://www.pakfunplace.com

کو پاس بٹھا کر پوچھنے لگا۔
"تم اچھی تو ہو ناں۔۔۔؟" تاجور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"خالہ ڈانٹتی مارتی تو نہیں ہے۔" وہ اور تاجور بھی سوتیلی ماں کو خالہ کہتی تھی۔
"نہیں۔" تاجور کا ایک "نہیں" بے انتہا مجبوری لیے ہوئے تھا۔ وہ خاموش ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ کندنی رنگت سنولا گئی تھی۔ آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ تب ہی بیرونی دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا اور تاباں وہیں سے پکارتی ہوئی چلی آئی۔
"چاچی۔۔۔ چاچی!" اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں غالباً "کھیر کا پیالہ لیے ہوئی تھی۔ یکدم انجان بن گئی۔
"ہیں ابو کب آیا؟"
"ابھی۔۔۔!" اس نے بے نیازی سے جھوٹ بولا تو تاباں اچھل پڑی۔
"جھوٹا کہیں کا رات میں نے خود تجھے تانگے سے اترتے دیکھا تھا۔"
"اچھا!" وہ قصداً "ہنسا تو تاباں نے سٹپٹا کر کھیر کا پیالہ آگے بڑھا دیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"کھیر" ابا کے لیے بنائی تھی پر اس نے کھائی نہیں۔ سوچا تو کھالے گا اس لیے لے آئی۔" تاباں نے جلدی جلدی بتاتے ہوئے پیالہ اسے تھمانا چاہا لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔
"بڑی مہربانی۔ میں بھی کھیر نہیں کھاتا۔"
"توبہ توبہ۔ شہر میں رہ کر تو تو پکا جھوٹا ہو گیا ہے۔ کھیر نہیں کھاتا۔ پچھلی بار جب آیا تھا تو فرمائشیں کر کر کے پکوائی تھی۔ لے تاج! تو رکھ لے اور خبردار جو اسے ذرا سی بھی چکھائی تو۔" تاباں نے پیالہ تاجور کے ہاتھوں میں تھمایا اور جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے واپس پلٹی تھی۔
"ارے سنو تو۔" وہ اس کی ناراضی سوچ کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اریبہ اپنا جیولری بکس کھولے بیٹھی تھی۔ جس میں ایک لاکٹ، ٹاپس، دو تین انگوٹھیاں اور دو چوڑیاں تھیں اور وہ ان کی مالیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ سارہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا تو پوچھ لیا۔
"کسی شادی میں جا رہی ہو کیا؟"
"نہیں۔" اریبہ نے اپنے حساب کتاب کے درمیان جواب دیا تھا۔
"پھر یہ جیولری۔۔۔؟" سارہ اب براہ راست اسے دیکھنے لگی تھی۔
"دیکھ رہی ہوں، کتنے میں بکے گی۔" وہ لاکٹ ہتھیلی پر اچھالتے ہوئے بولی۔
"کیا۔۔۔!" سارہ اچھلی تھی۔ "یہ نوبت آ گئی ہے کیا؟ میرا مطلب ہے ایسے تو حالات نہیں۔ کیوں بیچنا چاہتی ہو؟"
"مجھے بائیک خریدنی ہے۔" وہ اطمینان سے بولی تھی۔ سارہ بری طرح سلگ گئی۔
"بائیک، بائیک تم کوئی چھوٹی بچی تو نہیں ہو جو ایسی ضدیں کرتی ہو۔"
"یہی تو میں بھی بتانا چاہتی ہوں کہ میں بڑی ہو گئی ہوں۔" وہ ہنوز اطمینان سے تھی۔

"تو اس کا ثبوت تم بائیک چلا کر دینا چاہتی ہو۔ کیا بات ہے تمہاری۔ اس کا مطلب ہے مجھے بھی خود کو بڑا ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" سارہ مذاق اڑانے لگی۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ٹشو پیپر کھینچ کر جیولری اس میں رکھنے لگی۔
"کیا واقعی تم۔۔۔؟" سارہ پریشان ہو گئی تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائی پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔
"سارہ بی بی! دل باغی ہو جائے ناں پھر کسی کی نہیں سنتا۔ بس جلاتا اور اکساتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ تم خواہ مخواہ اپنا دل مت جلایا کرو۔ ریلیکس یار ریلیکس۔" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔
اپنے اس اقدام پر وہ مطمئن تھی۔ ایک پل کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ نہ توصیف احمد کی ناراضی کو سوچا جبکہ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ اور وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ توصیف احمد دوسری شادی کر کے اس پر حق کھو چکے ہیں۔ اب وہ اپنے ہر عمل میں آزاد ہے اور اسی آزادی کے نشے میں سرشار وہ گاڑی بھگا رہی تھی کہ اچانک سگنل آف ہونے پر اس نے بڑی عجلت میں بریک پر پاؤں رکھا تھا۔ اسی پل اس کے قریب دوسری گاڑی کے ٹائر چرچرائے تو اس نے بلا ارادہ گردن موڑی اور رازی کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح چپکے چپکے اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا گویا بے اختیاری کا پل تھا۔ لیکن اگلا پل اس کا اپنا تھا۔ فوراً گردن سیدھی کر کے یوں بن گئی جیسے دیکھا ہی نہیں۔ پھر سگنل کھلنے پر اسی اسپیڈ سے گاڑی بھگا دی اور جب مطلوبہ جگہ پارکنگ میں گاڑی لاک کر کے شاپنگ مال کی طرف بڑھ رہی تھی تب رازی ایک دم سامنے آ گیا۔
"کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟"
"کہیں بھی جاؤں، تمہیں کیا؟ تم پوچھنے والے کون ہو۔۔۔؟" وہ غرائی تھی۔ ایک پل کو رازی کی پیشانی شکن آلود ہوئی لیکن پھر دھیرج سے بولا تھا۔
"مگر تم مانو گی نہیں لیکن چچا زاد ہونے کو جھٹلا نہیں سکتیں۔"
"چچا زاد ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرا پیچھا کرو۔ میری انکوائری کرو کہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں۔" اس نے مزید غصہ ظاہر کیا۔ رازی نے ایک نظر اطراف کا جائزہ لیا پھر ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔
"میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر خفگی سے بولی۔
"میں تو ہٹ جاؤں لیکن کیا تم پھر ان راستوں پر چل سکو گی۔" رازی کا لہجہ مغلوب کر دینے والا تھا۔ وہ فوراً سنبھل نہیں سکی تو اس کی سائیڈ سے نکل کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ رازی کے ہاتھ میں اس کی ڈور آ گئی تھی۔ جسے مضبوطی سے تھام کر اس کے پیچھے جیولری کی دکان تک آ گیا تھا۔
اریبہ ٹشو پیپر میں رکھی جیولری شوکیس پر رکھ کر دکان دار سے بات کرنے لگی۔ وہ جیولری بیچنے کی بات کر رہی تھی۔ رازی کو حیرت ہوئی لیکن بولا کچھ نہیں۔ تمام کارروائی خاموشی سے دیکھتا رہا اور جب وہ اچھی خاصی رقم لے کر دکان سے نکل گئی تب اس نے جلدی جلدی دکان دار سے کچھ کہا پھر تیزی سے نکل کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"تم نے ایسا کیوں کیا۔ آئی مین کوئی ضرورت تھی تو توصیف چچا سے کہتیں۔ کیا وہ منع کر دیتے؟"
"وہ منع کر چکے ہیں۔" وہ سلگتے لہجے میں کہہ کر تقریباً "بھاگنے لگی تھی۔
"مانتا ہوں کہ اس وقت تمہارے پاس موٹی رقم ہے لیکن میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں پھر کیوں بھاگ رہی ہو۔ میں تمہیں غنڈوں سے بچا سکتا ہوں۔" رازی نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق جواب آیا۔

http://www.pakfunplace.com

"میں غنڈوں سے نہیں تم سے بھاگ رہی ہوں۔"

"یہ فضول کوشش کیوں کر رہی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ نہ میں تم سے بھاگ سکتا ہوں اور نہ تم مجھ سے۔" وہ مسلسل مصالحانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

"ہونہہ! پتا نہیں کیسی کیسی خوش فہمیاں پال لیتے ہیں لوگ۔" وہ نخوت سے سر جھٹک کر اپنے آپ بولتی ہوئی گاڑی کا لاک کھول کر بیٹھ گئی اور فورا" دروازہ بند کر لیا تھا۔

"او کے۔ سی یو۔" رازی نے انگلی سے شیشہ بجا کر کہا اور مسکرایا بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت تپی ہوئی گھر میں آئی تھی۔ سیدھے اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی لیکن لاؤنج میں سارہ اور یاسمین کو بیٹھے دیکھ کر رک گئی۔ ٹیبل پر چائے کی ٹرے کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی رکھے تھے۔ جو کسی مہمان کی آمد ظاہر کر رہے تھے۔ اسے اچھنبا ہوا کیونکہ جب سے یاسمین نے ساجدہ بیگم اور امینہ پھوپھو سے بگاڑ پیدا کی تھی تب سے کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

"کون آیا تھا مما؟" وہ وہیں آکر بیٹھ گئی۔

"اخلاق چچا اور ان کی بیگم آئی تھیں۔" سارہ نے فورا" بتایا۔

"خیریت! کیوں آئے تھے؟" اس نے نمکو کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ان کی بیٹی عفت کی شادی ہے۔ یہ شادی کارڈ دینے آئے تھے۔" یاسمین نے کارڈ ہاتھ میں لے کر اسے دکھایا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ آرام سے نمکو کھانے لگی۔

"مما! چلیں گے ناں؟" سارہ نے شوق سے یاسمین سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! ضرور چلیں گے۔" یاسمین کے جواب پر وہ اچھل پڑی۔

"کیا کہہ رہی ہیں مما! اخلاق چچا کوئی ہمارے سگے چچا تھوڑی ہیں۔ ڈیڈی کے تایا زاد بھائی۔ دور کی رشتہ داریاں دور ہی رکھیں۔"

"دور کی رشتہ داریاں ہی تو اچھی ہوتی ہیں۔ دشمنی تو قریب والے کرتے ہیں جانے کن جنموں کا بدلہ لیتے ہیں۔" یاسمین کی اپنی منطق تھی۔

توصیف احمد کے چچیرے، ممیرے بہن بھائیوں سے وہ ابھی بھی بہت اچھے طریقے سے ملتی تھی۔ کیونکہ اسے یہ سننا بہت اچھا لگتا تھا کہ کیا ہو گیا تھا توصیف کو۔ آپ جیسی خوب صورت، اسمارٹ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لی۔ ان لوگوں کے سامنے وہ مظلوم بن جاتی اور سب کی ہمدردیاں سمیٹتی۔ خاص طور سے شادی بیاہ کی تقریبات میں تو ضرور جاتی۔ جہاں وہ سب کی توجہ کا مرکز بنتی اور اپنے مقابلے میں توصیف احمد کو زیر ہوتے دیکھ کر اسے عجیب خوشی ملتی تھی۔

"بہر حال میں تو نہیں جاؤں گی۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو سارہ یک دم خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

"ہاں اریبہ! کیا ہوا۔ وہ تمہاری جیولری.....!"

"بک گئی۔ اب تم پوچھو گی کتنے پیسے ملے۔ پیسے نہیں نوٹ اور وہ بھی ہزاروں میں، سونا مہنگا ہو گیا ہے ناں اور بائیک سستی۔" وہ سارہ کو چڑانے والے انداز میں بولے جا رہی تھی۔ یاسمین اس کی طرف متوجہ تو ہو گئی تھی لیکن کچھ سمجھ نہیں پائی تو پوچھنے لگی۔

"کیسا سونا... کیسی بائیک؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"مما! اس نے بائیک خریدنے کے لیے اپنی جیولری بیچ دی۔" سارہ کو یقین تھا کہ یاسمین ضرور ناراض ہوگی۔ لیکن ناراض تو کیا حیران بھی نہیں ہوئی اور جل کر بولی تھی۔

"ظاہر ہے جب باپ خیال نہیں کرے گا تو یہ یہی کرے گی۔"

"ڈیڈی خیال کیوں نہیں کرتے۔ ہر بات کا خیال کرتے ہیں ہر ضرورت پوری کرتے ہیں ہماری۔ اب اگر میں کہوں کہ مجھے جہاز دلا دیں تو یہ تو نہیں کر سکتے ناں ڈیڈی۔" سارہ کو یاسمین کی بے حسی پر افسوس ہوا تھا۔

"میں نے جہاز نہیں، بائیک مانگی تھی جو لاکھوں میں نہیں، ہزاروں میں آجاتی ہے۔"

"بات لاکھوں ہزاروں کی نہیں ہے اریبہ! تمہاری بائیک کی ضد غلط ہے۔ مما! آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔" سارہ نے زچ ہو کر یاسمین کو دیکھا تھا۔

"بیٹا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" یاسمین نے بجائے سارہ کو سپورٹ کرنے کے اسے وہاں سے اٹھا دیا پھر اریبہ سے کہنے لگی۔

"اس کے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ ابھی بچی ہے۔"

"بچی نہیں ڈیڈی کی چمچی ہے۔ ہر وقت مجھے سمجھانے کی بات کرتی ہے اپنے آپ کو نہیں دیکھتی۔" وہ غصے سے بولی تھی۔ پھر ایک دم سر جھٹک کر یاسمین کے پاس آبیٹھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر لجاجت سے پوچھنے لگی۔

"مما! میں بائیک لے لوں ناں۔"

"بیٹا! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ ظاہر ہے تمہاری ضرورت ہے۔ لیکن تمہارے ڈیڈی۔" یاسمین نے قصدا" بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ڈیڈی کی باتیں آپ سن لیجیے گا ناں۔"

"ہمیشہ سے سنتی آرہی ہوں۔" یاسمین فورا" مظلوم بن گئی۔ لمبی آہ کھینچی پھر اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ "میں نے تم لوگوں کی خاطر سب برداشت کیا اور تمہارے لیے تو میں توصیف سے لڑ بھی سکتی ہوں۔ کیونکہ ایک تم ہی میری ڈھال ہو۔ اگر تم میرا دفاع نہ کرو تو توصیف احمد کبھی مجھے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ نکال باہر کریں گے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا مما۔" وہ تڑپ کر یاسمین کے گلے لگ گئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے یاسمین کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔ پھر اسے خود سے الگ کر کے پوچھنے لگی۔

"کب لے رہی ہو بائیک.....؟"

"بس ایک دو دن میں۔ پھر تو میرے امتحان شروع ہو جائیں گے۔ دعا کریں مما! یہ وقت جلدی گزر جائے۔ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی تو پھر ہمیں اپنی ضرورتوں کے لیے ڈیڈی کے پاس نہیں بھاگنا پڑے گا۔" وہ مکمل طور پر یاسمین کے زیر اثر تھی۔

"ہاں بیٹا! میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں۔" یاسمین کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔

"چلیں اب آپ آرام کریں۔ میں ذرا سارہ کی خبر لے لوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں بیٹا! اسے کچھ مت کہو۔ ابھی ناسمجھ ہے۔" یاسمین نے چونک کر اسے ٹوکا تو وہ ہنس پڑی۔

"مجھے پتا ہے مما اور میں تو یونہی اسے چھیڑتی ہوں۔ ورنہ سچ بتاؤں میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں۔ روٹھ جاتی ہے تو مجھے نیند نہیں آتی۔ لیکن میں اس پر ظاہر نہیں کرتی۔"

"اچھا جاؤ، دیکھو وہ کیا کر رہی ہے۔" یاسمین کو اس کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی شاید اس کے اندر محبت

http://www.paktfunplace.com

کا خوف تھا۔ سو جاتے جاتے پھر رک گئی۔

"ہاں مما! آپ کو پیسے چاہئیں۔"

"نہیں۔ پہلے تم اپنی ضرورت پوری کرو۔" یاسمین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلیں، جو باقی بچیں گے۔ وہ آپ کو دے دوں گی۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سارہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اس نے فوراً "اسے نہیں چھیڑا۔ پہلے اپنا پرس الماری میں رکھا پھر بیڈ پر بیٹھ کر سینڈل اتارتے ہوئے کہنے لگی۔

"پتا ہے کیا ہوا سارہ! جب میں جیولر کی دکان پر گئی تو وہاں رازی بھی آگیا۔"

"پھر؟" رازی کا سن کر سارہ فوراً" اس کی طرف گھومی تھی۔

"پھر کیا بس وہ آگیا۔" اسے جیسے بس یہی اطلاع دینی تھی۔ سینڈل بیڈ کے نیچے دھکیل کر آرام سے لیٹ گئی۔ جبکہ سارہ کے اندر بے چینی پھیل گئی تھی۔

"تو تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی ان سے؟"

"مجھے تو خیر اس سے کوئی بات کرنی ہی نہیں تھی البتہ وہ زبردستی مسلط ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں نے لفٹ ہی نہیں دی۔ اپنا کام کیا اور چلی آئی۔" وہ خود کو حد درجہ بے نیاز ثابت کر رہی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے رازی بھائی کے سامنے جیولری۔" سارہ صدمے میں گھر گئی تھی۔

"کیوں رازی کے سامنے جیولری بیچنا منع ہے کیا۔ جب خریدی جاسکتی ہے تو بیچی کیوں نہیں جاسکتی۔" وہ سارہ کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہی تھی اور اندر ہی اندر محظوظ ہو رہی تھی۔

"لیکن ارے یہ! وہ کیا سوچیں گے۔ تمہیں اگر ان کی پروا نہیں ہے تو کم از کم اپنی عزت کا خیال تو کرو۔" سارہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"اوہو! اس میں عزت، غیرت کہاں سے آگئی۔ تمہیں تو کچھ بتانا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا کیا سوچ لیتی ہو۔" وہ واقعی جھنجلا گئی تھی۔

"اور تم کچھ نہیں سوچتیں۔" سارہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر گویا اس پر تاسف کا اظہار کیا پھر موبائل اٹھا کر ایس ایم ایس چیک کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج شمشیر علی کی واپسی تھی۔ اس کے بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے تاجور کا دل بھر آیا تھا۔ لیکن وہ کمال ضبط سے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی رہی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر اس کا بھائی پریشان یہاں سے جائے اور وہاں بھی پریشان رہے۔ مزید خالہ کا خوف بھی تھا۔ اس لیے وہ خود کو کڑے پہروں میں رکھ کر شمشیر علی کا بیگ تیار کر رہی تھی۔

"تاج! میرے موزے اور رومال رکھ دیے ہیں؟" شمشیر علی نے اسے پکار کر پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بیگ کی زپ بند کرنے لگی۔

"لگتا ہے میری بہن اداس ہو رہی ہے۔" شمشیر اس کے پاس آکھڑا ہوا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "کیا کروں مجبوری ہے ورنہ میرا دل تمہیں چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا۔ دعا کرو اللہ کوئی ایسا انتظام کر دے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاسکوں۔"

"آپ کے ساتھ۔" تاجور حیران اور بے یقین تھی۔

"ہاں۔ ابھی بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔ رہائش کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن تمہیں وہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں صبح آفس جاتا ہوں۔ وہاں سے یونیورسٹی پھر گھر آتے آتے رات گیارہ بج جاتے ہیں۔ میں یونیورسٹی سے فارغ ہو جاؤں پھر ان شاء اللہ کسی عورت کا انتظام کر کے تمہیں لے جاؤں گا۔" وہ سوچتے ہوئے بول رہا تھا "آخر میں اسے دیکھا وہ اب بھی خائف کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے پریشان کیوں ہو جاتی ہو؟" وہ نرمی سے ٹوک کر کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں خالہ کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے اور میں ان کو کیا کہوں جب ابا ہی ہمارے نہیں رہے۔ سب کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ کچھ نہیں بولتے۔ خیر تم فکر مت کرو۔ اب بس تھوڑا وقت رہ گیا ہے گزر جائے گا۔"

"آپ پھر کب آؤ گے؟" اس کی باتوں سے تاجور کی ڈھارس بندھی تھی۔

"جلدی آؤں گا۔ کوشش کروں گا اب ہر مہینے چکر لگا لیا کروں۔" اس نے مزید حوصلہ دیا پھر جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کی مٹھی میں دبا کر کہنے لگا۔ "یہ تمہارے خرچے کے لیے ہیں۔ کچھ پھل فروٹ منگوا کر کھا لیا کرو۔ بہت کمزور ہو گئی ہو۔"

تاجور نے سر جھکا لیا تب ہی خالہ آکر پاٹ دار آواز میں بولی تھیں۔

"شمشیر کو تانگا لینے آیا ہے۔"

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔" اس نے تاجور کا سر اپنے سینے سے لگا کر بوسہ دیا پھر بیگ اٹھا کر خالہ کو تاجور کا خیال رکھنے کا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تاجور یہی سمجھی کہ خالہ بھی کمرے سے نکل گئی ہیں لیکن وہ انتظار میں کھڑی تھیں۔ جب یقین ہو گیا کہ شمشیر کا تانگا گلی کے نکڑ سے مڑ گیا ہو گا تب تیر کی سی تیزی سے وہ تاجور پر جھپٹی تھیں۔

"کیوں ری۔ کیا کیا لگائی ہے بھائی کو میرے خلاف۔ بڑے ظلم توڑتی ہوں میں تجھ پر۔ یہی کہا ہے ناں۔"

"نہیں خالہ!" تاجور کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔

"خالہ کی بچی! میں کیا تجھے جانتی نہیں ہوں۔ میسنی گھنی۔" خالہ نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ "چار دن کے لیے بھائی آتا ہے تو اس کے سامنے نواب زادی بن جاتی ہے۔ میں کیا تیرے باپ کی نوکر ہوں جو تجھے پکا پکا کر کھلاؤں گی۔ چل اپنی اوقات پہ۔"

"میرے بال!" تکلیف کی شدت سے اس کے آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے تھے، لیکن خالہ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ گھسیٹتے ہوئے اسے کچن میں لا پٹخا اور دو چار لاتیں بھی رسید کر دیں۔

"اماں!" وہ درد سے کراہی تھی۔

"مر گئی تیری اماں۔ تو بھی اس کے ساتھ مر جاتی بے غیرت اور یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" خالہ کو اچانک اس کی مٹھی میں لال نوٹوں کی جھلک نظر آئی تھی۔

"نامراد اب چوری بھی کرنے لگی۔ میں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ میرے پیسے کہاں گئے۔ کوئی ضرورت تھی تو مانگ لیتی چوری۔"

"چوری نہیں کی خالہ! مجھے بھائی نے دیے ہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"تیرے بھائی کے پاس کہاں سے آئے وہ تو خود بھیک منگا ہے۔ یہاں آتا کس لیے ہے؟ باپ کے پاس جو کچھ ہو، بٹور کے لے جاتا ہے۔" نوٹ گننے کے ساتھ خالہ کی زبان بھی چل رہی تھی پھر جاتے جاتے اسے لات مارنا نہیں بھولی تھیں۔

☼ ☼ ☼

http://www.paktunplace.com

اجلال رازی کا آج آفس کے کسی کام میں دل ہی نہیں لگا۔ سارا وقت ذہن پر اریبہ سوار رہی تھی۔ اس کا رویہ تو تھا ہی تکلیف دہ' مزید کل اس کے جیولری بیچنے سے وہ الجھ گیا تھا کہ ایسی کون سی ضرورت ہے اس کی جو توصیف احمد پوری کرنے سے قاصر ہیں' کتنی بار اس نے سوچا کہ وہ فون کرکے سارہ سے معلوم کرے۔ لیکن پھر ثنا کی بات یاد آجاتی جو اس نے کہا تھا کہ سارہ بہت روڈ ہوگئی ہے۔ اگر ایسا تھا تو پھر ظاہر ہے وہ اس سے بھی کچھ معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ اسی الجھن میں وقت سے پہلے ہی وہ آفس سے نکل آیا پھر راستے میں اچانک کچھ سوچ کر اس نے گاڑی موڑ دی اور توصیف احمد کے بنگلے پر آگیا' اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ وہ جانتا تھا توصیف احمد ابھی آفس سے نہیں آئے ہوں گے اور اگر خالدہ سے صرف چچی والا رشتہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت آنے سے کتراتا لیکن خالدہ اس کی خالہ بھی تھیں' اس لیے وہ آرام سے آگیا تھا۔ خالدہ نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا پھر شکوہ بھی کرنے لگیں۔

"کتنا انتظار تھا تمہارا اور تم آتے ہی آفس کے جھمیلوں میں الجھ گئے گویا تمہارے نزدیک عزیز رشتہ داروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔"

"ایسا نہیں ہے خالدہ آنٹی! بس میں نے سوچا' آپ سب سے ملنا ملانا تو رہے گا ہی۔ ساتھ ساتھ کام بھی شروع ہوجائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اب دیکھیے میں آگیا ہوں نا آپ کے پاس۔" اس نے اپنائیت سے خالدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگایا پھر پوچھنے لگا۔

"ہما اور فہد کہاں ہیں؟"

"وہ سنبل آئی ہوئی ہے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ تم بیٹھو میں بلاتی ہوں انہیں۔ اور ہاں کیا پیو گے؟" خالدہ نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"چائے اور ساتھ کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو بھی مل جائے تو۔" وہ بلاتکلف بولا۔

"ہلکا پھلکا کیوں' بھوک لگی ہے تو میں کھانا گرم کردیتی ہوں۔"

"نہیں خالدہ آنٹی! زیادہ بھوک نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی نہ کریں۔ میرے پاس بیٹھ جائیں۔ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے خالدہ کی محبت کا جواب محبت سے دیا تھا۔

"اچھا۔ میں سنبل سے کہتی ہوں' وہ چائے بنادے گی۔" خالدہ کہہ کر چلی گئیں اور کچھ دیر بعد واپس آئیں تو ہما اور فہد بھی ان کے ساتھ تھے۔

"بیٹا! یہ تمہارے رازی بھائی ہیں' سلام کرو۔" دونوں بچوں سے کہتے ہوئے خالدہ کو ایک دم اریبہ کی بات یاد آئی تو انہیں ہنسی بھی آگئی۔

"السلام علیکم رازی بھائی!" ہما اور فہد نے ایک ساتھ اسے سلام کیا لیکن اس کا دھیان خالدہ کے ہنسنے پر تھا۔ چونک کر سلام کا جواب دیا پھر پوچھنے لگا۔

"خالدہ آنٹی آپ ہنسیں کیوں؟"

"ایک بات یاد آگئی تھی۔" خالدہ کے ہونٹوں پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی۔

"بتانے والی ہو تو بتایئے تاکہ میں بھی آپ کے ساتھ مسکرا سکوں۔"

"وہ ایک دن اریبہ آئی تھی۔ ہما اور فہد سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں کسی نے سلام کرنا نہیں سکھایا کیا' درحقیقت مجھے سنا رہی تھی۔" خالدہ نے محظوظ انداز میں بتایا تھا اور اسے موقع مل گیا فوراً پوچھنے لگا۔

"اریبہ آئی ہے؟"

"ہاں کبھی آجاتی ہے پریشان کرنے' میرا مطلب ہے جب بھی آتی ہے کوئی ایسی بات کرجاتی ہے جس سے

توصیف پریشان ہوجاتے ہیں' تم برا مت ماننا میں اس کی برائیاں نہیں کررہی' بس اس کی حرکتیں کچھ عجیب سی ہوگئی ہیں۔" خالدہ نے بات کرتے ہوئے احتیاط کا دامن تھاما' یہ ان کی مجبوری تھی۔

"نہیں خالدہ آنٹی! میں برا نہیں مانوں گا' آپ بتایئے کیا کہتی ہے وہ۔" وہ اندر ہی اندر جزبز ضرور ہوا تھا لیکن خالدہ پر اعتماد ظاہر کیا۔

"مجھ سے تو کچھ نہیں کہتی۔ توصیف کو تنگ کرتی ہے۔ ایک دن بائیک چلاتی ہوئی آگئی تھی اور اب ضد کررہی ہے کہ اسے بائیک دلائی جائے۔" خالدہ نے بتایا تو وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہ گیا۔ پتا نہیں حیران تھا یا پریشان۔ وہ اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"تم اسے سمجھاؤ ناں' شاید تمہاری بات مان جائے۔" خالدہ شاید اب اس سے اگلوانا چاہتی تھیں۔ صبح سے سنبل ان کے پاس آئی ہوئی تھی اور اس نے منگنی ٹوٹنے کا بتایا تھا' یہی بات وہ رازی کے منہ سے سننا چاہ رہی تھیں۔

"تو یہ ضرورت ہے اریبہ کی۔" وہ اپنی سوچ میں تھا۔ خالدہ کی بات سنی ہی نہیں تو جواب کیا دیتا' جبکہ خالدہ کھوجتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ تب ہی سنبل چائے لے کر آگئی۔

"السلام علیکم!" سنبل نے سلام کیا تب رازی نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

"تم کب سے یہاں ہو؟"

"آج ہی آئی ہوں اور ابھی چلی جاؤں گی۔" سنبل نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے بتایا۔

"ماموں جان اور ممانی جان ٹھیک ہیں؟" وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا' اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ کوئی بے تکی بات کر گیا ہے۔

"جی' آپ تو آئے ہی نہیں۔" سنبل نے شکوہ کر ڈالا۔

"آؤں گا۔ دیکھو' آج خالدہ آنٹی کے پاس آیا ہوں تو کسی دن تمہاری طرف بھی آجاؤں گا۔" وہ کہہ کر چائے پینے لگا۔

"یہ کباب لیجیے۔" سنبل نے خالدہ کے اشارے پر کباب کی پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کردی۔

"تھینک یو۔ اس نے ایک کباب اٹھالیا۔ پھر سامنے والے کلاک پر نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔" توصیف چچا کب آتے ہیں؟"

"آتے ہی ہوں گے' تم آرام سے بیٹھو' ان سے مل کر جانا' بلکہ رات کا کھانا کھا کر' بتاؤ کیا کھاؤ گے میں وہی بنا دیتی ہوں۔" خالدہ کی محبت گو کہ فطری تھی لیکن اس وقت شاید اسے گھیرنا چاہتی تھیں۔

"ارے نہیں خالدہ آنٹی! ابھی تو میں بہت جلدی میں ہوں۔ پھر کسی دن فرصت سے آؤں گا۔" وہ دو گھونٹ میں چائے ختم کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ چلو کھانے تک مت رکو' لیکن اپنے چچا جان سے تو مل لو' وہ بس آنے والے ہیں۔" خالدہ نے تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا گو کہ بات معقول تھی لیکن پھر توصیف احمد کے ساتھ اسے کچھ دیر تو بیٹھنا ہی پڑتا اس لیے معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"سوری آنٹی! اصل میں مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ویسے چچا جان سے میری تقریباً" روز ہی فون پر بات ہوتی ہے۔" اس نے حد درجہ عجلت ظاہر کرکے خالدہ کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور پھر جلدی آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

خالدہ سنبل کو دیکھنے لگیں جس کی نظریں گلاس وال سے رازی کا تعاقب کررہی تھیں۔ جب وہ گیٹ سے باہر

http://www.pakfunplace.com

نکل گیا تب کہنے لگی۔
"میں نے سوچا تھا' رازی کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ مجھے گھر ڈراپ کر دیتے' لیکن وہ تو اتنی جلدی میں چلے گئے۔"
"ہاں اس کا یوں آنا اور چلے جانا میری سمجھ میں نہیں آرہا' خاص طور سے مجھ سے ملنے تو آیا نہیں ہوگا۔" خالدہ سوچتے ہوئے بولی تھیں۔
"میرا خیال ہے خالدہ آنٹی وہ یہ دیکھنے بلکہ جاننے آئے ہوں گے کہ منگنی ٹوٹنے کی خبر کہاں کہاں پہنچی۔ آپ نے کچھ ظاہر تو نہیں کیا؟" سنبل نے رازداری کا انداز اختیار کیا۔ خالدہ نے نفی میں سر ہلا کر پھر اس کی تائید کی تھی۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' وہ اسی مقصد سے آیا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

جس روز سے اریبہ نے سمیر کو ٹوکا تھا' اس دن کے بعد سے وہ ادھر آیا ہی نہیں تھا' سارہ جانتی تھی کہ وہ غصے میں اور ناراض ہو کر گیا تھا۔ کوئی اور بات ہوتی تو وہ فوراً" اسے فون کرتی یا اس کے گھر پہنچ جاتی۔ لیکن اریبہ نے بات ہی ایسی کی تھی جسے سوچ کر وہ خود شرم سے زمین میں گڑنے لگتی۔ جب ہی اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی سمیر کو فون کرنے کی۔ جبکہ اس کی ناراضی سے وہ پریشان بھی بہت تھی کیونکہ ایک وہی تو تھا جس سے باتیں کر کے اس کے دل کا بوجھ سرک جاتا تھا۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ اسی انتظار میں تھی کہ کسی دن وہ خود ہی آجائے گا اور ہمیشہ کی طرح کہے گا کہ میں کسی بات کا برا نہیں مانتا' لیکن اب یقیناً" وہ برا مان گیا تھا جب ہی اتنے دنوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ آخر اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے خود ہی اسے فون کر ڈالا۔
"ہیلو۔!" سمیر کا انداز ظاہر کر رہا تھا جیسے اس نے جاتے جاتے پلٹ کر فون اٹھایا تھا۔
"ناراض ہو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔
"کون سارہ' کیسی ہو۔" سمیر کے لہجے میں ہمیشہ والی شگفتگی سمٹ آئی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو۔ آئے کیوں نہیں اتنے دنوں سے؟" اس نے چور سے انداز میں شکوہ کیا تھا۔
"نا بابا! میں اب تمہارے ہاں نہیں آؤں گا۔ تمہاری بہن کی سوچ بہت گھٹیا ہو گئی ہے اور میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن گھٹیا الزام برداشت نہیں کر سکتا۔" سمیر نے بغیر گھمائے پھرائے واضح طور پر اپنے نہ آنے کی وجہ بھی بتا دی تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔
"ہیلو! قدرے رک کر وہ پوچھنے لگا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں' چپ کیوں ہو گئیں؟"
"تو اور کیا کروں۔" اس کا لہجہ روٹھا ہوا تھا۔
"کچھ بولو۔"
"نہیں بول سکتی۔" اس کا دل بھرا رہا تھا۔
"کیوں؟"
"مجھے رونا آرہا ہے اور میں رو رہی ہوں۔" وہ واقعی رونے لگی تھی۔
"ارے رے' پاگل ہو گئی ہو کیا' رونا ہے تو کمرے میں بند ہو کر روؤ' مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ چلو فون بند کرو۔ میں کہہ رہا ہوں' فون بند کرو۔" وہ اس کے رونے سے پریشان ہو گیا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ڈانٹنے لگا" وہ اور شدت سے رونے لگی۔
"جتنا مرضی روؤ' میں چپ کرانے نہیں آؤں گا۔" سمیر نے فون پٹخ دیا تھا اس کے باوجود وہ ریسیور تھامے کھڑی

نِکھرا حسین چہرا - پھُولوں جیسی تازگی
فیس فریش ©™
بیوٹی سوپ
اس میں موجود ملٹی وٹامنز جلد کو دلکش حسین اور خوبصورت بنائیں اور ماسچرائزر جلد کو نرم و ملائم اور تروتازہ رکھیں۔
فیس فریش بیوٹی سوپ جھریوں، داغ دھبے اور چھائیوں کو ختم کر کے جلد کو گورا بناتا ہے اور بڑھاپے کے مضر اثرات کو روک رکھتا ہے۔ فیس فریش بیوٹی سوپ میں تمام خالص اجزا استعمال کیے گئے ہیں۔
فیس فریش بیوٹی سوپ سارا دن جلد پر اپنا اثر دکھاتا ہے اور سورج کی شعاعوں کے مضر اثرات سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ فیس فریش بیوٹی سوپ ہر طرح کی جلد اور مرد و خواتین کیلئے یکساں مفید ہے۔
www.facefreshproducts.com
Digital Creations

http://www.pakfunplace.com

رہی۔ آنسو ایک تواتر سے بہتے چلے آرہے تھے۔ اسی پل اجلال رازی آگیا اور اسے یوں روتے دیکھا وہ بھی فون پر تو ایک دم پریشان ہو گیا فوراً" بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا دوسری طرف مکمل خاموشی تھی پھر اس سے پوچھنے لگا۔

"کس کا فون تھا؟"

وہ نفی میں سرہلا کر ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"پھر تم رو کیوں رہی ہو؟" رازی کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

"بس دل چاہ رہا تھا اور آپ۔ آپ کیوں آگئے' جان تو گئے ہیں اریبہ کتنی بدلحاظ ہو گئی ہے پھر کچھ الٹا سیدھا بول دے گی۔" وہ بولے چلی گئی۔ "آپ پلیز جائیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ خواہ مخواہ چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہے۔"

"میں اس سے زیادہ اونچی آواز میں چلا سکتا ہوں' ہے کہاں؟" رازی نے پوچھا۔ پھر خود ہی ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

"گھر پہ نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ بس آپ جائیں۔" اس نے پھر جانے پر زور دیا۔ رازی کو غصہ آگیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ گھر آئے مہمان کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے۔ چلو منہ دھو کر آؤ۔ پھر بات کرتا ہوں اور خبردار اب روتے ہوئے مت آنا۔" رازی نے باقاعدہ اسے ڈانٹ دیا تو وہ خائف سی ہو کر بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو بوا رازی سے چائے وغیرہ کا پوچھ رہی تھیں۔

"بس بوا! صرف چائے۔" وہ بوا سے کہہ کر اسے دیکھنے لگا۔ رونے کے باعث اس کی آنکھیں اور ناک بھی سرخ ہو رہی تھی۔ رازی کو افسوس ہونے لگا کہ خواہ مخواہ اسے ڈانٹ دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر کرسی پر بٹھا کر نرمی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں اب بتاؤ۔ کیا بات ہے' کیوں رو رہی تھیں؟"

"بس یونہی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔

"اس کا مطلب ہے بتانا نہیں چاہتیں۔ لیکن پلیز یہ تو بتا دو' اریبہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہے۔ اصل میں اس کے امتحان ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ ہی تیاری کرتی ہے۔" وہ رک رک کر بولی تھی۔

"ہوں!" رازی نے چند لمحے توقف کیا پھر پوچھنے لگا۔ "اور یہ بائیک کا کیا معاملہ ہے؟"

"آپ کو کس نے بتایا؟" وہ خائف ہو کر دیکھنے لگی۔

"کسی نے بھی بتایا ہو' اریبہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ اس سے کہنا اگر میں نے اسے سڑکوں پہ بائیک چلاتے ہوئے دیکھ لیا تو وہیں شوٹ کر دوں گا اسے۔" رازی کا ڈپریشن یکدم ظاہر ہو گیا تھا۔

"یہ بات آپ خود اس سے کہہ دیجئے گا۔" وہ منمنائی تھی۔

"اسی سے کہنے آیا تھا' کب تک آجائے گی وہ؟"

"پتا نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چائے لاتی ہوں۔"

"رہنے دو۔ میں جا رہا ہوں' اریبہ کے امتحان ہو جائیں میں پھر آؤں گا۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا پھر جانے کیا خیال آیا تھا' جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔

"سنو' تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں؟" وہ بالکل نہیں سمجھی تھی۔

"وہ جو اریبہ میرے اور اپنے تعلق کو ختم کرنے پر بضد ہے تو تمہارا کیا خیال ہے واقعی ختم ہو جانا

چاہیے۔" رازی نے وضاحت کی تو وہ فوراً" بولی تھی۔

"نہیں رازی بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں بھی ایسا نہیں چاہتا بلکہ ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں دل سے چاہتا ہوں اسے اگر میں خاموش ہوں تو صرف اس لیے کہ وہ اپنا میڈیکل کمپلیٹ کرے۔ اس کے بعد میں ایک دن نہیں رکوں گا' یہ بات تم اسے اچھی طرح سمجھا دینا' اوکے۔"

رازی مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے اس کی حیران آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ سارہ کو ایک بڑے ٹینشن سے نجات مل گئی تھی۔ یوں لگا جیسے طوفان آتے آتے تھم گیا ہو۔ وہ اپنا رونا بھول گئی۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سمیر نے سارہ کو ڈانٹ تو دیا تھا پھر اس کے بعد وہ خود بھی چین سے نہیں تھا' رات کتنی دیر تک وہ خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ اسے سارہ سے صرف ہمدردی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا' جہاں وہ یہ سوچتا کہ روتی ہے تو روئے مجھے کیا' وہیں دل احتجاج کرنے لگتا' آخر وہ ہار گیا تھا' جب ہی اگلے روز کالج ٹائم پر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سارہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اتنی سی بات یہاں کھڑے ہو کر نہیں کر سکتا' میرے ساتھ چلو۔" اس کا انداز ہمیشہ سے مختلف تھا۔ سارہ نے ٹھٹک کر اپنی وین کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کالج وین سے جاتی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے اور میں نے وین والے سے کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں لینے آیا ہوں' چلو۔" وہ کہہ کر اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا' سارہ اس خیال سے کہ کہیں سب لڑکیاں متوجہ نہ ہو جائیں فوراً" اس کے پیچھے چلی آئی اور جیسے ہی بائیک پر بیٹھی اس کی نظر ثنا پر پڑی تھی۔ وہ بہت مشکوک نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ سارہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ سمیر کے کندھے میں ناخن چبھو کر بولی۔

"ثنا دیکھ رہی ہے؟"

"تو پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا ہم دونوں کو۔" سمیر پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ الٹا مذاق اڑا کر بائیک بھگا دی۔ وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ مضبوطی سے اس کا کندھا تھام کر پوچھنے لگی۔

"تمہارا مقصد کیا ہے اور یہ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں تمہیں اغوا کر کے ایسی جگہ لے جا رہا ہوں' جہاں تم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔" سمیر نے ترنگ میں اس کی دونوں باتوں کا جواب دیا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"تم بھی فضول سوال مت کرو۔" وہ سکون سے بولا تھا۔ سارہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ جان گئی تھی کہ اس کے رحم و کرم پر ہے اور وہ اس کی ایک نہیں سنے گا۔ جانے کن کن راستوں پر بائیک بھگاتا ہوا ایک جگہ وہ رک گیا تو وہ فوراً" چھلانگ مار کر اتر گئی اور کچھ غصے سے اسے دیکھنے لگی۔

"بیکار ہے' میں تمہارے گھورنے سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں۔" وہ جانے کیوں ہنس رہا تھا۔ بائیک بند کر کے اسے لیے ہوئے پیزا ہٹ کی سیڑھیاں چڑھ آیا اور اسے سامنے بٹھا کر بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گیا۔

http://www.pakfunplace.com

"میں اب تک یہ سمجھتا رہا ہوں کہ تم میری کزن اور بس دوست ہو' تھوڑی ڈرپوک اور بہت زیادہ حساس' ذرا ذرا سی بات کو محسوس کرکے رنجیدہ ہو جاتی ہو اور تمہیں تسلی دے کر میں سمجھتا تھا کہ میں نے اپنا کام کرلیا۔ یعنی دوستی کا حق ادا کردیا۔ کل فون پر جب تم روئیں تو میں اس وقت تسلی دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے تمہیں ڈانٹ دیا۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ اس کے بعد مجھے احساس ہوا بلکہ مجھ پر ادراک ہوا کہ تم سے میرا تعلق صرف تسلی دینے والا نہیں ہے اس سے کچھ زیادہ' کچھ نہیں' بہت زیادہ' سمجھ رہی ہو نا۔"

وہ بہت خاموشی سے سن رہی تھی' ہونٹ ذرا سے بھنچے ہوئے تھے۔

"دیکھو۔ مجھے گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتی۔ اس لیے صاف لفظوں میں کہہ رہا ہوں کہ تم میرے دل میں سما گئی ہو۔ اچھی تو خیر تم مجھے شروع سے لگتی تھیں' لیکن یہ مجھے کل رات پتا چلا کہ میں تمہیں رونے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر کبھی انجانے میں بھی ایسا ہوا تو میں خود کو معاف نہیں کروں گا۔ تم میری اولین محبت ہو' اب تو سمجھ گئی ہو نا۔" سمیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ وہ چونکی' گھبرائی' پھر ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"مجھے جو کہنا تھا' کہہ دیا' اب تم کچھ کہو۔" وہ خاصا مشتاق ہو گیا تھا۔ جیسے اس کی طرح وہ بھی اتنے آرام سے حال دل بیان کردے گی۔

"میں کیا کہوں؟" سارہ نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔

"جو تمہارے دل میں ہے۔ یعنی میرے بارے میں تمہارے احساسات کیا ہیں۔ مجھے کس انداز سے سوچتی ہو۔" سمیر کا انداز اکسانے والا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"میں نہیں بتا سکتی' میرا مطلب ہے' مجھے نہیں پتا۔"

"اس کا مطلب ہے' ابھی تم پر ادراک نہیں ہوا۔ خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی دن اچانک ہی تمہیں خود پتا چل جائے گا۔ لیکن دیکھو' پھر مجھ سے چھپانا مت' فوراً' بتا دینا۔" وہ بہت اطمینان سے اور بہت پریقین تھا۔ سارہ کو حیرت ہوئی' سمجھ کر بھی پوچھنے لگی۔

"کیا۔ کیا فوراً' بتا دوں؟"

"یہی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے' جو کہ یقیناً' ہے' کیونکہ جب میں ناراض ہوتا ہوں تو تم رونے لگتی ہو' کل نہیں آتا تو پریشان ہو جاتی ہو اور ہاں' جب میں تمہارے پاس آتا ہوں تو تم خوش ہو جاتی ہو۔" وہ محبت کی علامات بتا رہا تھا۔ سارہ نے بمشکل ہنسی روکی' پھر بظاہر سادگی سے کہنے لگی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن یہ سب تو اوروں کے لیے بھی ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ اچھلا تھا۔

"میرا مطلب ہے' اریبہ' حماد' ڈیڈی اور رازی بھائی بھی اگر ناراض ہوں تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔" وہ بہت کوشش سے معصوم بن رہی تھی۔ ورنہ ہنسی پھوٹ پڑنے کو بے تاب تھی۔

"چلو۔ چلو اٹھو۔" وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

"اور وہ پزا۔" وہ حیران ہوئی۔

"پیک کروا دوں گا' گھر جا کر کھا لینا۔" وہ غصے سے کہتا آگے بڑھ گیا۔ سارہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ روم میں آئی تو فوری طور پر اس نے دھیان نہیں دیا کہ سارہ موجود نہیں۔ خاصی عجلت میں چیئر کھینچ کر بیٹھی تو عادت کے مطابق پہلے یاسمین کی پلیٹ میں سالن نکالا' پھر حماد' اس کے بعد سارہ کی پلیٹ میں ڈالنے لگی تھی کہ اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ فوراً" یاسمین کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"سارہ کیا اتنی دیر سے آتی ہے؟"

"نہیں۔ روزانہ تو اتنی دیر نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار وین خراب ہو جاتی ہے تو۔" یاسمین نے ہاٹ پاٹ میں سے روٹی نکالتے ہوئے سرسری انداز میں جواب دیا تھا۔

"اپنا سیل تو گھر چھوڑ جاتی ہے' عجیب پاگل لڑکی ہے۔ اب کیسے معلوم کیا جائے کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" وہ جھنجلا کر بولی تھی۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ کہا نا' وین خراب ہو جاتی ہے۔ تم کھانا کھاؤ۔" یاسمین کے نزدیک شاید کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی' اور وہ سمجھتی تھی ماں اسے ٹینشن سے بچانا چاہتی ہے اس لیے اس کے سامنے پریشانی کا اظہار نہیں کرتی۔

"آپی! آپ کے امتحان ختم ہو گئے؟" حماد نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی پرچے باقی ہیں' کیوں پوچھ رہے ہو۔" وہ نوالہ منہ میں ڈال کر سوالیہ نظروں سے حماد کو دیکھنے لگی۔

"بیٹا! اگر اس نے پوچھ لیا تو کیا ہو گیا۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔" یاسمین نے دھیرج سے اسے ٹوکا۔

"مما! آپ کو نہیں پتا' یہ کوئی بات یوں ہی نہیں کرتا۔" وہ یاسمین کے ٹوکنے سے جھلا گئی' پھر حماد سے کہنے لگی۔

"سنو۔ یہ مت سمجھنا کہ میں امتحانوں کی وجہ سے تم سے غافل ہو جاؤں گی۔ تمہاری ساری سرگرمیوں کی خبر رکھتی ہوں۔ اگر کسی دن میں نے تمہیں غلط قسم کے لڑکوں کے ساتھ دیکھ لیا تو تم سوچ نہیں سکتے میں تمہارا کیا حشر کروں گی۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
شائع ہو گئے ہیں
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 250 روپے
☆ امر بیل، عمیرہ احمد قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

http://www.pakfunplace.com

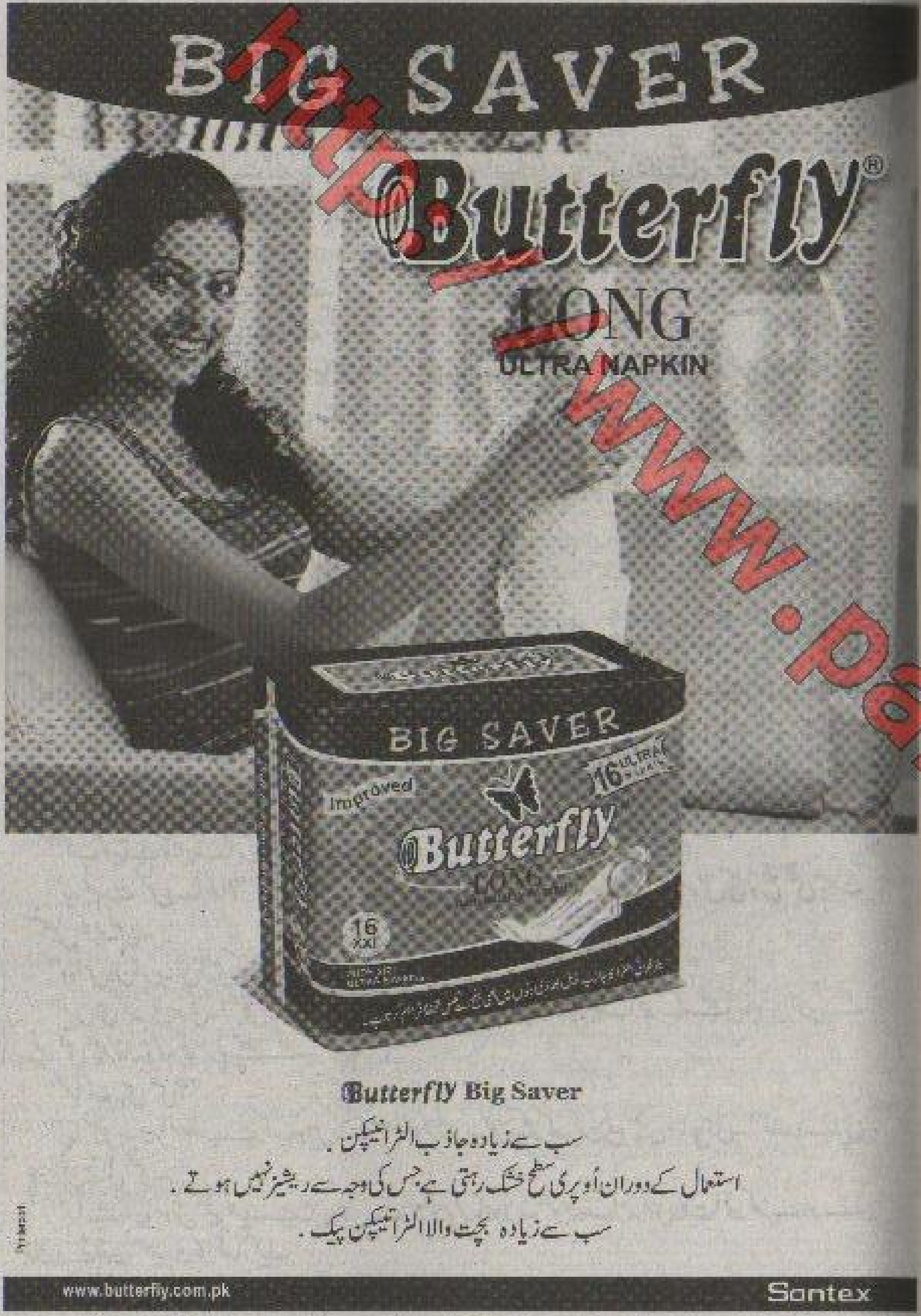

"مجھے پتا ہے۔" حماد منہ پھلا کر بولا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر جلدی جلدی کھانا ختم کیا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی سکون سے سونا چاہتی تھی۔ اس لیے دبیز پردے گرا کر اس نے کمرے میں مکمل اندھیرا کر دیا اور جیسے ہی آ کر لیٹی اسی وقت سارہ آ گئی۔ باہر سے آ رہی تھی اور ایسے میں یوں بھی صاف نظر نہیں آتا۔ یہاں تو مکمل اندھیرا تھا۔

"یا اللہ' یہ دن میں رات کا سماں۔" سارہ نے کہتے ہوئے لائٹ آن کی تو اریبہ کی پیشانی سکڑ گئی اور کہنا چاہتی تھی کہ فوراً "لائٹ آف کرو" لیکن اس کے ہاتھوں میں بیوٹاہٹ کا شاپر دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"یہ تم کالج کے بہانے کہاں کہاں جاتی ہو؟"

"میں نے تو کبھی تم سے نہیں پوچھا۔" سارہ اس کی بات پر سلگ کر بولی۔

"دیکھو سارہ! اس طرح بات مت کرو' میں تم سے بڑی ہوں اور پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔" وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور تنبیہی لہجے میں ٹوک کر کہا۔

"میں مانتی ہوں' لیکن اگر تم ٹیڑھے طریقے سے پوچھو گی تو میں بھی سیدھا جواب نہیں دوں گی۔" سارہ خفگی سے کہتے ہوئے الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"چلو تو سیدھے طریقے سے پوچھ لیتی ہوں' کہاں گئی تھیں؟" اس نے سارہ کی بات تسلیم کر لی' پھر بھی انداز نہیں بدلا تھا۔

"کالج۔ پھر واپسی میں سمیر مل گیا تو اس کے ساتھ بیوٹاہٹ چلی گئی تھی۔" سارہ نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر جواب دیا تھا۔

"کیوں۔ میرا مطلب ہے یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ اب پلیز یہ مت کہہ دینا کہ تم بھی تو جانے کیا کچھ کرتی پھرتی ہو۔" اسے فوراً" ہی معاملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے دوستانہ انداز میں بولی تھی۔ سارہ نے الماری بند کی پھر اس کی طرف پلٹ کر کہنے لگی۔

"یہ واقعی اچھی بات نہیں ہے۔ پھر بتاؤ میں کیا کروں' سمیر کو یہاں آنے سے بھی تو تم نے روکا ہے۔"

"میں نے۔ میں نے کب روکا ہے۔" اسے پتا نہیں اپنی بات یاد نہیں تھی' یا اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

"کیوں۔ اس روز تم نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں اور وہ کیوں بیٹھ گیا ہے۔" سارہ نے تپ کر یاد دلایا تھا۔

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں نے اسے آنے سے ہی منع کر دیا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو' یہ بتاؤ باہر ملنے کا مطلب جانتی ہو۔" وہ بہت ٹھنڈے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"جانتی ہوں' لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" سارہ الجھ گئی تھی۔

"ہونا بھی نہیں چاہیے' کیونکہ یہ سب لوگ ہمارے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی یہاں آتا ہے تو صرف یہ جاننے کی غرض سے کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ میں کیا کر رہی ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو' اور عما ابھی تک سوکن کا ماتم کر رہی ہیں یا انہوں نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ یہ سب لوگ صرف تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔" وہ بالکل اسی طرح سارہ کو بدظن کرنے کی کوشش کر رہی تھی' جس طرح یاسمین نے اسے کیا تھا۔ سارہ مصلحتاً" خاموش رہی' پھر چینج کرنے کا کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی' اور وہ جو سکون سے سونا چاہتی تھی' اس کی نیند تو اڑی ہی' ساتھ فکر مند بھی ہو گئی تھی' اس کے نزدیک سارہ ابھی ناسمجھ تھی اور وہ اسے نرمی سے ہی ہینڈل کرنے

http://www.pakfunplace.com

کا سوچنے لگی تھی۔

"پزا کھاؤ گی؟" سارہ نے واش روم سے نکلتے ہی اس سے پوچھا۔ وہ بے دھیانی میں اسے دیکھے گئی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔" سارہ پزا کا شاپر اٹھا کر اس کے پاس آبیٹھی اور پیک کھولتے ہی خوش ہو گئی۔ "واؤ زبردست! لو کھاؤ۔"

"میں نے ابھی کھانا کھایا ہے' اور یہ تم یہاں کہاں بیٹھ گئی۔ اپنے بیڈ پر جاؤ' میں لیٹوں گی۔" وہ کہہ کر لیٹ بھی گئی۔ سارہ اٹھ کر اپنے بیڈ پر جا بیٹھی اور شوق سے پزا کھانے میں لگ گئی' پھر اچانک یاد آنے پر اسے مخاطب کر کے بولی تھی۔

"ہاں اریبہ! کل رازی بھائی آئے تھے۔"

"پھر۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"انہیں کس نے بتایا کہ تم بائیک لینا چاہتی ہو؟" سارہ نے قصداً" اپنی توجہ کھانے پر مرکوز رکھ کر پوچھا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے کسی خیال سے پوچھا تھا۔

"ناراض ہو رہے تھے۔" سارہ نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ ترخ کر بولی تھی۔

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھ لیا۔ گویا اب کوئی بات نہیں کرے گی۔

☼ ☼ ☼

جس دن سے سنبل' خالدہ کو اریبہ کی منگنی ٹوٹنے کا بتا کر گئی تھی ان کے اندر کھد بد مچی ہوئی تھی' لیکن وہ خاصی سمجھ دار خاتون تھیں۔ فوراً" توصیف احمد تک اس بات کو نہیں پہنچایا تھا کہ کہیں ان کے میکے والوں پر بات نہ آجائے کہ انہوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہو گا۔ اس لیے کافی دن صبر سے رہیں اور یہ انتظار بھی کیا کہ شاید کہیں اور سے بات نکل کر توصیف احمد تک پہنچ جائے' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا' تب انہوں نے خود ہی سوچ کر طریقے سے بات شروع کی تھی۔

"آپ کو پتا ہے توصیف! اریبہ اپنی منگنی ختم کرنا چاہ رہی ہے۔"

"تم سے کس نے کہا؟" توصیف احمد یک دم ٹینشن میں آگئے تھے۔ خالدہ کو اسی سوال کی توقع تھی' بہت سنبھل کر بولیں۔

"وہ اس دن اریبہ ہی ایسی کوئی بات کر رہی تھی۔"

"یوں ہی کہہ گئی ہو گی۔ اصل میں اسے بائیک نہ دلانے کا غصہ ہے۔" توصیف احمد کے لہجے کی مایوسی اریبہ کے لیے تھی' پھر خالدہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"پتا نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ وہیں سے معلوم کر لیں۔ میں کچھ کہہ کر بری نہیں بننا چاہتی۔" خالدہ نے اپنی پوزیشن جتائی تھی۔

"برا بننے کا کیا سوال' خیر ٹھیک ہے میں وہیں سے معلوم کرتا ہوں۔" توصیف احمد اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ خالدہ نے قصداً" حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ ابھی جا رہے ہیں کیا؟"

"ہاں۔۔۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اریبہ کو سمجھانا پڑے گا۔ ورنہ اگر بھابھی بیگم تک بات پہنچ گئی تو۔" وہ اب عجلت میں باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خالدہ کہنا چاہتی تھیں کہ ان کو بات نہیں آنا چاہیے' لیکن اس کے لیے انہیں توصیف احمد کے پیچھے لپکنا پڑتا اور یہ بات انہیں پسند نہیں تھی کہ جب وہ باہر جا رہے ہوں تو پیچھے سے انہیں پکارا جائے یا روکا جائے' جب ہی وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

توصیف احمد بالکل انجان تھے اس لیے انہیں یہ پریشانی لاحق تھی کہ کہیں بات ساجدہ بیگم تک نہ پہنچ جائے۔ وہ ساجدہ بیگم کا ماں کی طرح احترام کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ اس لیے فوراً" اریبہ کو سمجھانے آگئے تھے کہ کہیں انہیں ساجدہ بیگم کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑے۔ ہمیشہ کی طرح سارہ انہیں دیکھ کر بھاگی آئی تھی۔

"السلام علیکم ڈیڈی!"

"وعلیکم السلام' کیسی ہو بیٹا؟" انہوں نے سارہ کو اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"میں ٹھیک ہوں اور ابھی میں آپ کو یاد کر رہی تھی' بلکہ فون بھی کرنے والی تھی۔"

"اچھا۔ باقی سب کہاں ہیں؟" وہ لاؤنج میں آکر رک گئے تھے۔

"مما اپنے کمرے میں ہیں۔ اور اریبہ عماد کے ساتھ مارکیٹ گئی ہے۔ وہ عماد کا رزلٹ آگیا ہے نا ڈیڈی! اس نے میٹرک کر لیا ہے۔ اسی خوشی میں اریبہ اسے شاپنگ کرانے لے گئی ہے۔" سارہ نے خوشی سے بتایا۔

"کب آیا اس کا رزلٹ؟" انہوں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی' میں یہی بتانے کے لیے آپ کو فون کرنے والی تھی۔ مما کو بلاؤں۔" سارہ نے بیٹھتے بیٹھتے رک کر پوچھا اور وہ "ہاں" کہتے کہتے رہ گئے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔

"آپ بیٹھو بیٹا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"جی ڈیڈی!" وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"دیکھو بیٹا! جو میں پوچھوں' سچ سچ بتانا۔ کیا اریبہ نے ایسی کوئی بات کی ہے کہ وہ رازی سے شادی نہیں کرے گی؟" توصیف احمد نے بہت نرمی سے پوچھا' جبکہ نظریں اس کے چہرے پر جمی رہنے دیں' جب ہی اس کی پریشانی چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

"ڈیڈی وہ۔" فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"بیٹا! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے بتاؤ' جب تک میرے علم میں بات نہیں ہو گی میں کیسے اس معاملے کو ہینڈل کر سکوں گا۔" توصیف احمد نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

"میں کیا بتاؤں ڈیڈی' بس اریبہ نے اپنے آپ ہی۔" سارہ خود کو بہت مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔

"کیا اپنے آپ۔" توصیف احمد کو الجھن ہونے لگی' لیکن وہ کھٹکے بھی تھے۔

"میرا مطلب ہے' اس نے خود ہی جا کر تائی امی کو انگوٹھی واپس کر دی۔" سارہ نے اٹکتے ہوئے بتایا تھا۔

توصیف احمد یک دم سناٹے میں آگئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

http://www.pakfunplace.com

ام ثمامہ

ساس آس اور خراش

"اف خدایا کس قدر گرمی ہے۔ اللہ جانے لوگ اتنی گرمی میں شادیاں رکھ کر رشتے داروں سے کس بات کا بدلہ لیتے ہیں۔" مدیحہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پنکھے کا بٹن دبایا مگر جناب ان تلوں میں تیل کہاں۔ واپڈا کی بے وفائی کے سبب وہ بچارا چلنے سے قاصر تھا۔ اماں نے ہت فین ہاتھ میں لیا اور زور زور سے جھلنے لگیں۔ صبا بھی کپڑے بدلنے دوسرے کمرے میں چل دی اور رئیس میاں بچارے بے دم سے ہو کر قالین پر ہی لیٹ گئے۔

"اللہ جانے لوگ کارڈ پر شادی کا ٹائم دن کا کیوں لکھواتے ہیں جب ہمیشہ شام ہو جاتی ہوتی ہے تو کارڈ پر بھی شام کا وقت لکھ دیا کریں تاکہ لوگ چھ چھ گھنٹے پہلے تیار ہو کر روغنی نانوں کی طرح سوکھتے نہ رہیں۔"

صبا جب چائے لے کر واپس آئی تو اماں ہمیشہ کی طرح شادی خانہ آبادی پر سیر حاصل تبصرہ کر رہی تھیں اور ابا ہمیشہ کی طرح سر تسلیم خم کر کے سن رہے تھے۔

"ہائے صبا! تم نے دیکھا لڑکیوں نے کس طرح کا فیشن کر رکھا تھا۔ لے موا وہ بوتل سا پاجامہ اور دس دس گز کی فراکیں۔"

"اماں! اسے چوڑی دار کہتے ہیں۔" صبا نے تصحیح کی۔

"اے چوڑی دار ہو کہ ناہنجار میری بلا سے ہمرو تو پچیس کلو سے لے کر اسی کلو تک کی ساری لڑکیاں اور عورتیں خود کو "مس فراک" سمجھ کر کس قدر خوش تھیں۔"

"ویسے فیشن اچھا ہے کم از کم سب کچھ ڈھک تو گیا اماں!" صبا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"صبا کے ابا سو گئے کیا؟" بچارے ابا میاں ابھی ٹھیک طرح سے پلک بھی نہ جھپک پائے تھے کہ ایک دم بیدار ہو گئے۔

"نہیں بیگم! میں تو فیشن پر آپ کا جامع تبصرہ سن رہا تھا۔ شادی میں دیکھا تھا۔ دلہن کی تو ساس ہی نہیں تھی یعنی کہ جان ہی چھوٹی۔ بس اب اپنی صبا کے لیے بھی کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے تو ہم اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" ابا نے چائے کا خالی کپ صبا کو تھماتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"صبا کے ابا! میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں اپنی صبا کی شادی اس گھر میں کروں گی جہاں صرف ایک ہی ساس ہو گی۔" مدیحہ بیگم نے شادی سے [illegible] رئیس صاحب کو اپنا فیصلہ سنایا۔

"ارے مدیحہ بیگم! تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے [illegible] بھی تم نے خوب کہی ہر شریف آدمی کی ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔" ابا کے لہجے میں [illegible] حسرت تھی۔

"تمہارے ابا میاں [illegible] جنت نصیب کرے، نہایت شریف آدمی [illegible] ہماری درجن بھر ساسیں تھیں۔ بھولے [illegible] کے وہ دن جب مجھے ساس فوبیا ہو گیا [illegible] دونوں کو ساس ساس چلا کر اٹھ جایا کرتی۔"

"اماں! جب ہمارے دادا مرحوم کی ایک ہی بیوی تھیں تو پھر آپ کی درجن بھر ساسیں کیسے تھیں؟" صبا نے حیران ہو کر اماں سے پوچھا جواب اپنے پرس سے کارمینا کی گولیاں نکال کر کھا رہی تھیں۔

شادیوں سے اگر اکثر انہیں بدہضمی ہو جاتی تھی۔

"مت پوچھ بیٹی! بڑی دردناک کہانی ہے لیکن تمہیں ضرور سناؤں گی تاکہ تمہیں پتا چلے کہ میری شرط اتنی بے جا اور انوکھی نہیں ہے۔"

ابا موقع غنیمت جان کر قالین پر ہی سو گئے اور مدیحہ بیگم نے ماضی کی حسین اور سنگین یادوں کا پٹارا کھول لیا۔

"ہمارے لیے جب تمہارے ابا کا رشتہ آیا تو ہر طرح سے چھان پھٹک کی گئی۔ یوں تو رشتہ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھا۔ ابا اور بھیا نے تشویش کی صورت میں [illegible] تک بجا بھی لیا تھا۔ رئیس پڑھے لکھے ہوئے انسان تھے اور اپنے ابا کے ساتھ [illegible] کی دکان چلاتے تھے۔ ایک ہی بڑی بہن تھی جو بیاہ کر [illegible] جا چکی تھی سو نند کے جھگڑوں کا بھی دور دور تک امکان نہیں تھا۔ اماں ابا حیات تھے۔ یوں تو سب ٹھیک ٹھاک تھا مگر مجھ کو دو باتوں پر سخت اعتراض تھا کہ

http://www.pakfunplace.com

تمہارے ابا کی دادی اور نانی دونوں ہی حیات تھیں یعنی کہ ایک اپنی ساس پھر ساس کی ساس اور پھر سسر کی ساس بھی یعنی یک نہ شد تین تین شد......

اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اماں مرحومہ کو انہوں نے بڑے پیار سے سمجھایا کہ بیٹی رئیس میاں کی اماں تمہاری ساس تو ہے ہی اور دادی ساس کا یہ فائدہ ہو گا کہ تمہاری ساس پر بھی ایک ساس ہو گی اور تمہیں گاہے بگاہے یہ احساس سکون دیتا رہے گا کہ ساس صاحبہ بھی کسی سے ڈرتی ہیں' دبتی ہیں۔ تمہاری ساس ان کی بہو ہے سو ان کی ساری طرف داری تمہاری طرف ہو گی کیونکہ سورج تو مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے مگر ایک ساس کی ہمدردی اپنی بہو کی طرف نہیں ہو سکتی اور رہی نانی ساس! ایک تو وہ تمہارے گھر نہیں رہتیں دوسرا تمہارے سسر اپنی بیگم کے ڈر سے ان کی جتنی خدمت اور خاطر کریں گے میرے لیے بھی رستہ کھلا رہے گا تم سینہ تان کر رئیس میاں سے کہہ سکو گی کہ جتنی تمہارے ابا اپنی ساس کی عزت اور خدمت کرتے ہیں اتنا ہی تم بھی میری ماں کی کرو۔

اماں کی بات دماغ میں اتری تو بمشکل دل کو تمہارے ابا کے لیے رضامند کیا۔

بارات کافی لمبی چوڑی تھی۔ عورتوں کا اک ہجوم تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کون کس کا کیا ہے بس نوراں کشتی کا منظر تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سسر صاحب وقت کے بے حد پابند تھے' سو دوپہر دو بجے ہی رخصتی عمل میں آ گئی۔ پہلے وقتوں میں رات کی شادیوں کا رواج کہاں تھا۔ آج کل تو دلہنیں ٹھنڈے ٹھنڈے سسرال پہنچ جاتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو پہلے دن ہی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ بتا دیتی تھی کہ اماں باوا کے گھر کی ٹھنڈی چھاؤں اب خواب و خیال ہوئی۔

ہمارے گھر سے سسرال کی مسافت ایک گھنٹے کی تھی۔ ٹھیک تین بجے ہم نے پیا کے دیس میں [illegible] رکھا۔ ساس صاحبہ نے تیل چوکھٹ میں [illegible] ساتھ ساتھ تھوڑا سا پیچ میں بھی [illegible] جیسے ہی قدم رکھا' ہماری جہیل والی سرخ اور سنہری جوتی نے ساس صاحبہ کی سازش کا ساتھ دیتے ہوئے ہمیں گرانے کی کوششیں کیں مگر تمہارے ابا نے ہمیں تھام لیا اور اللہ بھلا کرے آج تک تھامے ہوئے ہیں۔"

تب ہی پڑوسن خالہ کی آمد سے یہ قصہ ادھورا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"مدیحہ بیگم! ایک گلاس ٹھنڈی ٹھار لسی تو پلاؤ۔" ابا ابھی ابھی دوکان سے واپس آئے تھے اور اماں ماہانہ سودے کی صفائی اور چنوائی کروا رہی تھیں۔

"صبا کے ابا! تمہیں کتنی دفعہ کہا کہ مونگ کی دال چھوٹے دانوں والی لایا کرو جلدی گلتی ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ اور برتن دھونے کے لیے تم پھر صابن اٹھا لائے؟ اب کے بار لیکوئیڈ لانا وہ کم گھلتا ہے اور زیادہ چلتا ہے۔" مدیحہ بیگم نان اسٹاپ شروع ہو گئیں۔

"ارے بیگم! لسی پلانے کو کہا تھا لسی بنانے کو نہیں۔ صبا بیٹا! ایک گلاس سادہ پانی ہی پلا دو۔"

صبا فریج کی طرف جانے لگی تو اماں نے آواز دی۔

"رک جاؤ تم سرسوں کے سارے تیل میں [illegible] ایک جویا ڈال کر پکا کر رکھ لو' خراب بھی نہیں ہو گا اور بے وقت ضرورت ٹائم کی بچت بھی ہو گی اور [illegible] کیری کا شربت بنا کر رکھا ہے [illegible] لاتی ہوں گرمیوں میں لو [illegible] کے لیے اس سے اچھی کوئی اور چیز [illegible]

دوپہر کا کھانا کھا کے [illegible] ابا کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے [illegible] صبا بھی سودے کی چنوائی اور صفائی [illegible] فارغ ہو چکی تھی۔ اماں صبا کے جہیز میں رکھنے کے لیے [illegible] بنائی ہوئی بیڈ شیٹ کے چاروں طرف کروشیا کرنے لگیں۔ انہوں نے صبا کے چودہ کے سن لگتے ہی چھوٹی بڑی چیز اور سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا اور اب جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھی تو تقریباً تمام سامان اکٹھا تھا۔

"اماں! آپ اس دن اپنی شادی اور ساس فوبیا والا جو قصہ سنا رہی تھیں وہ پڑوسن خالہ کی آمد کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ آگے بتائیے ناں کیا ہوا' آپ کا سسرال میں کیسا استقبال ہوا؟" صبا نے تخت پر بیٹھی کروشیا بنتی اماں کو یاد دلایا۔

"میں صدقے جاؤں' میری بچی کو کتنا میرا خیال ہے۔ جب اماں مرحومہ زندہ تھیں تو اپنے دکھڑے انہیں سنایا کرتی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد تو بس چپ کی چادر اوڑھ لی۔"

اماں بیتے وقتوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہو گئیں اب کہاں کی چادر اور کہاں کا [illegible]

"گرمی' رش' عورتوں اور بچوں کا شور بھاری کپڑے اور زیور [illegible] نے مل کر ہماری مت مار رکھی تھی [illegible] — تمہارے ابا کے ساتھ تخت پر بٹھایا گیا تاکہ رسموں کی ادائیگی ہو سکے۔

"ارے رئیس! تھوڑا قریب ہو کر بیٹھ بھابھی ماریں گی [illegible]" جانے کس کم بخت مارے نے مشورہ دیا تھا اور اتنی گرمی میں تمہارے ابا نے جو سانس لینے جتنا فاصلہ چھوڑا تھا' وہ بھی ختم کر ڈالا۔

کھیر کھلائی کی رسم کا شور مچا تو دل کو تھوڑی خوشی ہوئی۔ ایک تو مجھے کھیر پسند بہت تھی اور دوسرا رخصتی کے ساتھ جڑے دکھ اور وسوسوں کی وجہ سے کچھ کھایا نہیں تھا سو اب بھوک بھی لگی تھی۔

تمہارے ابا کے ہاتھوں محبت سے کھلائے جانے والے پہلے کھیر کے چمچے کے بارے میں ابھی خیالوں میں کھونے بھی نہیں پائی تھی کہ منہ میں برائے نام دودھ' چاول اور چینی کی لئی سی ڈال دی گئی۔ عام حالات ہوتے تو میں فوراً "لئی" جسے ہمارے سسرالی بڑے شوق سے کھیر کہہ رہے تھے' اگل دیتی مگر مجبوری کی مجبوری تھی۔ دلہناپے کا روپ' سسرال کا پہلا دن اور میاں جی کے ہاتھ کا کھلایا ہوا پہلا نوالہ...... دوسرے چمچے پر منہ نے کھلنے سے انکار کر دیا۔

ہجوم میں سے آواز آئی۔ "دلہن کھیر سات بار کھانی ہے' شگن ہوتا ہے۔" دل ہی دل میں رسم کو سات کے ہندسے سے مشروط کرنے والے کو گالیوں سے نوازا اور ساری کی ساری کھیر اپنے اندر اتار لی۔

ہمارے سسرال کی رسم کے مطابق پہلے دن بھابھی کی گود میں چھوٹا دیور چند لمحوں کے لیے بیٹھتا ہے اور نیگ وصول کرتا ہے۔ ہمارا اپنا تو کوئی دیور تھا نہیں سو خاندان بھر کی ماؤں میں جنگ چھڑ گئی' بڑی مشکل سے قرعہ فال پھپھو کے بیٹے کے نام نکلا۔

"مدیحہ دلہن! میرا حسن رئیس میاں سے پورے پانچ سال سات مہینے پندرہ دن چھوٹا ہے اور عمر کے اس حساب سے میرا بیٹا ہی اس رسم کے لیے موزوں ترین ہے۔"

ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی تو گھونگھٹ کی آڑ سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے پنجابی فلموں کے ہیرو جیسا چھ فٹ کا لمبا چوڑا دیور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ دیور جی خود ہی شرمیلی طبیعت کے نکلے ورنہ ہماری گود بھرائی کی جگہ گود تڑوائی ہو جاتی۔

اللہ اللہ کرکے رسمیں ختم ہوئیں اور ہمیں ہمارے کمرے میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ کمرے میں پہنچ کر ابھی کمر سیدھی بھی نہ کر پائے تھے کہ نند صاحبہ تشریف لے آئیں۔ بھابھی! ذرا صحیح ہو کر بیٹھ جائیں سب سلامی دینے کے لیے آ رہے ہیں۔ اس رسم کے ذکر سے گرمی میں تھوڑی ٹھنڈک کا احساس ہوا کہ چلو سسرال والوں سے کچھ تو وصول ہو گا۔

اماں سے سنا تھا کہ بھرا پرا خاندان ہے اس لیے پرس کا منہ پورے کا پورا کھول کر چوکس ہو کر بیٹھ گئی۔

سب سے پہلے دادی ساس آئیں۔ ادب سے سلام کیا' آخر کو ساس کی ساس تھیں' سلامی کے طور پر اپنے پوپلے منہ سے جس میں سے پان کے چھینٹے ہمارے حسین چہرے پر نقش و نگار بنا رہے تھے' دعائیں دے کر چلتی بنیں۔

پھر نانی ساس کی باری آئی' وہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ حسن سلوک سے نصیحت ہاتھ میں تھمائیں اور جاتے

جاتے ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر ہمارا جوڑا بھی خراب کر گئیں پھر آنے والا نمبر ہماری ساس صاحبہ کا تھا۔ اب تو قوی امید تھی کہ تگڑی سلامی ہاتھ لگے گی' آخر کو ان کی اکلوتی بہو تھی۔

"میں نے تو اپنا بیٹا اور پورا گھر تمہیں سونپ دیا' اب چیزوں اور پیسوں کی کیا حیثیت ہے۔ سدا سہاگن رہو۔"

ساس صاحبہ کی رنجیدہ سی آواز کانوں میں پڑی۔ پہلی ہی بار میں ساس صاحبہ کی چالاکی کا اندازہ ہو گیا صرف بیٹے کو لمبی عمر کی دعا دے کر چلتی بنیں۔ دعا میں سے بھی بہو کا حصہ گول کر گئیں۔

ہم نے دل میں شکر ادا کیا کہ اب ساسوں کا سلسلہ ختم ہوا مگر...

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

اور پھر نند صاحبہ "فردا" فردا" تعارف کرواتی گئیں اور ہم لو اور ہائی ہوتے بلڈ پریشر کے ساتھ سنتے رہے۔

سب سے پہلے پھوپھو ساس آئیں۔

"بہو! ہمارا رتبہ تمہاری ساس کے بعد سب سے بڑا ہے۔ آخر کو تمہارے شوہر کے باپ کی بڑی بہن ہیں۔" سلامی میں اپنی اہمیت جتا دی بس۔

پھر تائی ساس کی باری آئی۔

"بہو بیگم! ہم اس خاندان کی سب سے سلیقہ مند اور سینئر بہو ہیں' ہمارے نقش قدم پر چلو گی تو کامیاب رہو گی۔"

سلامی کے نام پر ایک گر تھما دیا گیا۔

پھر چاچی ساس تشریف لائیں۔

"ماشاء اللہ دلہن تو بہت پیاری ہے۔" تعریف کی سلامی پر ابھی خوش بھی نہ ہونے پائی تھی کہ آگے فرمایا گیا "بھائی صاحب کی پسند ہو گی ورنہ میں کہوں بھابھی بیگم تو کبھی اچھی چیز کو پہچان ہی نہیں پاتیں۔"

بہو کی تعریف اور جٹھانی کی برائی ایک تیر میں دو شکار والی سلامی پرس کے کھلے منہ نے خالی خولی لفظوں بھری سلامیوں سے اکتا کر میری طرف دیکھا۔

"بھابھی! یہ آپ کی خالہ ساس ہیں۔" کسی نے تعارف کروایا اور ہم چوکنے ہو گئے کیونکہ سن رکھا تھا کہ رئیس کی خالہ دبئی سے آئی ہیں۔ ہمیں اپنا خالی پرس درہموں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔

"دلہن تو پیاری ہے مگر میری ناز جیسی حسین اور سلیقہ شعار نہیں لگتی۔ خیر' جو نصیب۔" خالہ شاید اپنی کسی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں مگر بات نہیں بنی' سو وہ اپنا جلاپا اور حسرت سلامی میں پیش کر گئیں۔

"مدیحہ! ہم رئیس کے اکلوتے ماموں کی اکلوتی بیگم ہیں۔ آپا ہمارا بے حد خیال رکھتی ہیں اور تم سے بھی ہم اسی رویے کی امید رکھتے ہیں۔ عمر میں ہم تم سے بس چند سال ہی بڑے ہوں گے اس لیے ممانی کی جگہ آپا ہی کہہ لینا تو بہتر ہو گا۔"

یہ تھیں آخری ساس یعنی کم عمر اور نازک اندام لاڈلی ممانی ساس۔

خدا خدا کر کے سلامی کی رسم اختتام کو پہنچی۔

اماں نے اپنے قصہ کا اختتام کرتے ہوئے کہا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"مدیحہ بیگم! آپ خوامخواہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔ پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں۔ جاذب میاں بہت اچھے انسان ہیں اور پھر سب سے بڑی بات کہ وہ اتنے عرصے بعد خود اتنی چاہ سے رشتہ مانگنے آئے ہیں۔ میں تو یہ وعدہ بھول بھال بھی گیا تھا۔" ابا میاں جز بز سے ہو کر مدیحہ بیگم کو قائل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

"ارے [illegible] ساس تو مٹی کی بھی بری ہوتی ہے اور [illegible] سہا وہ میں اپنی پھول سی بچی کو سہنے نہیں دوں گی میں نے کہہ دیا بس! تم انہیں طریقے سے انکار کر دو۔" مدیحہ بیگم نے حتمی انداز میں فیصلہ سنا کر بات ختم کر دی۔

☼ ☼ ☼

آج کل گھر میں اماں ابا کے بیچ سرد جنگ چل رہی

تھی اور صبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جنگ کب ختم ہو گی اور فتح کس کی ہو گی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کے لیے ابا کے ایک دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا اس کے بچپن میں۔ ابا کے وہ دوست ابا کے پڑوسی بھی تھے۔ بڑی گہری دوستی تھی پھر وہ لوگ پنجاب شفٹ ہو گئے اور وقت کی گرد میں دوستیاں بس دلوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔ بچپن میں ابا اور بیگ انکل نے وعدہ کیا تھا کہ جب ان کے بچے بڑے ہو جائیں گے تو وہ اس دوستی کو رشتے داری میں بدل لیں گے اور اب اتنے سالوں بعد جب ان کا بیٹا ایک قابل ڈاکٹر بن گیا تھا اور آج کل جدہ میں نوکری کر رہا تھا تو وہ ابا کو ان کا وعدہ یاد دلانے آ گئے تھے۔ سب کچھ اچھا تھا مگر مسئلہ وہی تھا کہ جاذب کا ننھیال اور ددھیال ——— کافی بڑا تھا اور خود اس کی دو بہنیں اور دو بڑے بھائی بھی تھے سو اماں کسی طور راضی نہیں ہو رہی تھیں۔

"مدیحہ بیگم! ہماری عزت کا سوال ہے۔ خدارا مان جاؤ اور پھر صبا کو بھری پری سسرال میں نہیں رہنا پڑے گا۔ جاذب شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اسے جدہ لے جائے گا اور پھر ہماری صبا اتنی اچھی ہے کہ سب کا دل موہ لے گی۔ وقت کے ساتھ سوچیں بدل گئی ہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ بیگ اپنی زبان کے پاس کے لیے اتنے عرصے بعد اتنی دور سے آیا ہے تو کیا میں اسے خالی ہاتھ لوٹا دوں؟" ابا سچ میں کافی پریشان تھے۔

"اچھا! بات اگر تمہاری عزت کی ہے تو ٹھیک ہے لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں صبا کو اپنے اوپر سسرال میں بیتی ساری کہانی سناؤں گی کہ بھری پری سسرال اور اتنی ساری ساسوں' نندوں' دیوروں کے کیا نقصانات ہوتے ہیں پھر فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہو گا اور پھر آپ کو اس کا فیصلہ منظور کرنا پڑے گا۔" مدیحہ بیگم نے جوش و خروش سے اپنا فیصلہ سنایا۔

☼ ☼ ☼

"ساس صاحبہ نے چوتھی والے دن ہی ہمارا ہاتھ کھیر میں ڈلوا دیا تاکہ ایک کھیر میں سب کا حصہ نبٹ جائے اور بہو بیگم کل سے کام پر بھی لگ جائیں۔ چوتھی کی رسم میں ہمارے گھر ساسوں کا مینا بازار لگا ہوا تھا۔ ہر اسٹائل اور ہر سائز کی ساس موجود تھی اور اتنی ساری ساسوں کی ڈھیروں ڈھیر اولاد۔ اللہ جانے اس وقت بہبود آبادی کا محکمہ قائم ہوا تھا کہ نہیں۔ بے شمار پانچ سے پچاس سال تک کے جیٹھ' دیور اور نندیں' جب سب بھابھی بولتے تو مجھے لگتا میں پوری قوم کی بھابھی ہوں۔ کھیر کی دیگ میں ہاتھ چلاتے چلاتے ہاتھ ٹوٹنے لگا۔

چوتھی کی رسم میں اماں نے تھوک کے حساب سے ساسوں کو دیکھ کر دل پکڑ لیا اور بعد میں یہی دکھ کولیسٹرول کی صورت ان کی شریانوں میں جم کر دس سال بعد ہارٹ اٹیک کا سبب بنا۔ سب رسموں سے فارغ ہو کر گھر کی بھاگ دوڑ سنبھالی۔ چند دن گزرنے کے بعد ہی ہمیں بخوبی علم ہو گیا کہ دادی ساس اور نانی ساس والا اماں کا بنایا ہوا فارمولا بری طرح فلاپ ہو گیا ہے۔ دادی ساس اور میری ساس آپس میں لڑ لڑ کر اس قدر بور ہو چکی تھیں کہ دونوں نے مل کر نئے ہدف کے خلاف محاذ کھول لیا اور رہی نانی ساس تو ان کا نخرہ اتنا تھا کہ وہ داماد سے عزت کرواتا تو دور ان کے گھر آنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

تمام عمر دادی' نانی' تائی' چاچی' خالہ' ممانی اور اپنی ساس کی ہدایتیں سنتے' خدمتیں کرتے گزار دی مگر کچھ حاصل وصول نہ ہوا اور پھر جس دن تم پیدا ہوئیں میں نے سوچ لیا تھا کہ تمہارا رشتہ ایسے گھر میں کروں گی جہاں ساس نہ ہو اور اگر ہو بھی تو ایک اکلوتی کیونکہ ایک ساس بھی سو پر بھاری ہوتی ہے۔"

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر گیا تھا اب تو اماں کی ساری ساسیں مرحومین کا درجہ پا چکی تھیں اماں بھی اب ان کی مغفرت کی دعا کرتی تھیں مگر ان کے رویے' ان کی طرف سے ملے ہوئے دکھ یاد کر کے اب بھی آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔

اماں نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے اور اب دونوں کی نظریں صبا کی طرف تھیں۔

☼ ☼ ☼

http://www.pakfunplace.com

"بیٹا! تم حرا کے ساتھ جا کر اپنے کمرے میں ریسٹ کرو۔ ذرا فریش ہو جاؤ تو میں جاذب کو بھیجتی ہوں۔ رسمیں کل کرلیں گے اس لیے میں نے ولیمہ میں گیپ بھی رکھوایا ہے۔ آج تو سارا دن گزر گیا ہے اور پھر سب سے زیادہ ٹینشن اور الجھن دلہن کو ہی ہوتی ہے۔ اتنے بھاری کپڑے، زیور، فوٹو شوٹ، ماں باپ سے بچھڑنے کا دکھ اور پھر آدھی آدھی رات تک بچی کو جگا کر رسموں کی ادائیگی کرتے رہو، کہاں کا انصاف ہے یہ خالہ!"

صبا نے اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ذرا سا نظر اٹھا کر ایک شفیق اور پیاری سی عورت کو دیکھا جو اپنی خالہ سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ اس کی ساس تھیں یعنی جاذب کی امی۔۔۔

"آؤ آؤ بیٹی! صبح بخیر، اپنے گھر کا پہلا دن کیسا گزرا؟" اس کی ساس نے اس کے لاؤنج میں آتے ہی نظر اتاری۔ دونوں نندیں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ دونوں جیٹھانیاں بھی بہت خلوص اور محبت سے پیش آرہی تھیں۔

اماں کی بتائی ہوئی باتوں کے زیر اثر وہ اب بھی سہمی سہمی سی تھی حالانکہ یہاں کچھ بھی سسرال اور سسرالیوں والا نظر نہیں آرہا تھا۔

سب رسمیں ہوئیں رات کو ولیمہ کی تقریب تھی سو وہ شام کو تیار ہونے پارلر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس کی ساس نے اس کا صدقہ دیا۔ بقول ان کے تین دن سے ہماری بیٹی اتنی پیاری لگ رہی ہے کہ نظر ہی نہ لگ جائے۔

صبا جاذب کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ دونوں کی چاند سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔ اماں کو آتے دیکھ جاذب نے ادب سے کھڑے ہو کر اماں کو سلام کیا اور خود اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر ماں کی طرح وہ بھی بیٹی سے اکیلے میں اس کی خوشیوں اور نئے گھر کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی ہوں گی۔

جاذب کے ہٹتے ہی اماں صبا کے ساتھ آ کر بیٹھ گئیں۔ ابا بھی سب سے مل رہے تھے۔

"دیکھا! اب پتا چلا بھرے پُرے سسرال میں رہنا کتنا مشکل ہے۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ زمانہ چاہے کوئی بھی ہو اور پھر تمہاری ساس بلکہ ساری ساسیں مجھے تو میٹھی چھریاں لگ رہی ہیں۔" اماں نے دھیرے دھیرے بولتے ہوئے اس کی طرف کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

صبا نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ باپ کی عزت کی خاطر اس نے جو اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ وہ اس میں سرخرو ہوئی تھی۔ اسے دو دن کے اندر اس گھر میں اتنی عزت اور پیار ملا تھا کہ وہ نہال ہو گئی تھی اور اب وہ جاذب سے کہنے والی تھی کہ وہ اپنی جاب کا کنٹریکٹ ختم کر کے ہمیشہ کے لیے پاکستان آجائے کیونکہ اتنا اپنا پن اور اتنا پیار چھوڑ کر وہ تو پردیس جانے والی نہ تھی۔

وہ مسکرا مسکرا کر اماں کو دو دن کی روداد سنا رہی تھی اور کانوں، ہاتھوں، گلے اور انگلیوں میں پڑے سونے کے وہ زیور بھی دکھا رہی تھی جو اس کی ساس، نانی، پھوپھی، چاچی، خالہ ساس اور نندوں نے اسے منہ دکھائی میں گفٹ کیے تھے۔

"ارے بہن! آج کیا بیٹی کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے ہی پیٹ بھر لیں گی۔ یہ لیں میں آپ کے لیے اور صبا بیٹی کے لیے کھانا لائی ہوں۔ آپ پہلے اسے کھلائیے دو دن سے ٹھیک سے کچھ کھا ہی نہیں رہی۔" جاذب کی امی کھانے کے لوازمات سے بھری ٹرے لے کر اسٹیج پر چڑھیں۔

"ارے نہیں بہن! آپ جاذب بیٹے کو اوپر بھیجیے وہ صبا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے۔ میں اس کے ابا اور آپ سب لوگوں کو ساتھ کھانا کھاؤں گی۔"

نیچے اترتے ہوئے مدیحہ بیگم کی رائے بدل چکی تھی وہ جان گئی تھیں کہ رشتے برے نہیں ہوتے، ان کو برتنے والے انسانوں کا اپنا کردار اور عمل برا ہوتا ہے ورنہ ہر دور میں صبا کی ساس جیسی ساسیں بھی ہوتی ہیں جو بہوؤں کو بیٹیاں کہتی ہی نہیں مانتی بھی ہیں۔

☆

دُرافاطمہ

نرما کو لگا یہ اس کی نظر کا دھوکا ہے۔ پلاسٹک کے پھولوں میں سجا ہوا تازہ گلاب۔ کہاں سے آیا؟ کون لایا؟ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے بھیگا ہوا چہرہ اور آنکھوں میں بے شمار حیرت لیے اس نے دیوار پر لٹکی پلاسٹک کی ٹوکری میں پلاسٹک کے مصنوعی پھولوں پر دھول جمی ہوئی تھی، رنگ اڑ چکا تھا اور ان کے درمیان کھلی کلی اور دو سر سبز پتوں سمیت بالکل تازہ ایک سرخ گلاب موجود تھا۔ اسے صبح سویرے اٹھنے کی پرانی عادت تھی۔ منہ اندھیرے فلیٹ سے اتر کر نیچے گرین بیلٹ میں نرم گھاس پر ننگے پاؤں چلتی تو

ٹھنڈک اور تازگی اس کے پیروں کے تلووں سے دل و دماغ تک جا پہنچتی۔ یہ اس کا بہت پرانا معمول تھا۔ سیر کے بعد وہ سیدھی ٹیرس پر آتی اور واش بیسن پر جھک کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے چہرہ بھگونے لگتی۔ واش بیسن سے ذرا پرے دیوار پر پلاسٹک کی وہ سجاوٹی ٹوکری تھی ٹوکری میں پلاسٹک کے مصنوعی پھول' کبھی خوش رنگ تھے' اب ان کی دلکشی ماند پڑ چکی تھی۔ اسی ماند پڑی رنگت والے پھولوں کی ٹوکری میں موجود سرخ گلاب نے اسے چونکا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نما کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ ایک قطار میں تیرہ فلیٹ تھے جن کی دیواریں مشترک تھیں۔ یہ الگ بات کہ ان کے مکینوں کے دکھ سکھ جدا تھے۔ آئے دن کرائے کے ان مکانوں کے مکین بدلتے رہتے' کوئی چہرہ زیادہ دن نظر نہیں آتا تھا سو کسی سے شناسائی ہو نہیں پاتی تھی۔ زندگی اپنے اپنے در و دیوار میں قید تھی۔ ایک مشترکہ چھوٹی سی راہداری تھی جس میں یہاں آنے جانے والوں کے قدموں کی چاپ ابھرتی رہتی اور زندگی کی روانی کا احساس دلاتی رہتی۔ اسی راہداری کو وہ سب اپنے ٹیرس کے طور پر استعمال کرتے۔ ٹیرس میں کھڑے ہو کر تیزی سے بھاگتی کاروں اور عجلت میں دھکم پیل کرتے لوگوں کو وہ کبھی کبھار دیکھتی۔ اسی ٹیرس میں سر اٹھا کر نصف شب کے وقت کبھی کبھی اس کے دل میں نیلے آسمان کو دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھتی جس پر سنا ہے کبھی روشن ستارے چمکا کرتے تھے۔ اب تو سب خواب و خیال ہو چکا تھا۔

نما نے وہ پھول ارما کے بالوں میں سجا دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ گھاس پر ننگے پاؤں چل کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے ٹیرس کی طرف آ رہی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پلاسٹک کی ٹوکری میں آج دو تازہ گلاب اس کے منتظر ہوں [illegible]

سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے میں مزہ آتا تھا' لفٹ میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ نما کو یوں لگتا جیسے وہ موت کی قیدی کی طرح کوٹھڑی میں بند کر دی گئی ہے۔ جس کی جان تختہ دار پر پہنچنے سے پہلے ہی نکل جائے گی۔ ٹیرس پر بچھی کرسی خالی تھی جس کا مطلب تھا کہ ارما اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہے۔ نما لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی واش بیسن کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے سے پہلے اس نے آئینے میں دیکھا' آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ چہرے کی پژمردگی بہت نمایاں اور بالوں سے جھانکتے چاندی کے کچھ تار دکھائی دے رہے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا' کوئی انہونی بات نہیں جو اسے چونکا دیتی۔ پلاسٹک کی ٹوکری میں موجود دو تازہ پھولوں نے البتہ اسے چونکا کر رکھ دیا۔

یہ پھول کون رکھ گیا؟ راہداری میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اپنے علاوہ کسی ٹیرس پر اسے کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا۔ پھول رکھنے والا جانتا تھا کہ وہ اس وقت سیر سے لوٹتی ہے اور ٹیرس میں واش بیسن پر منہ دھو کر فلیٹ میں جاتی ہے؟ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے نما کو الجھا دیا تھا۔

”تمہارے لیے گرین بیلٹ سے توڑ کر لائی ہوں۔“ دو پھول اس نے ارما کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا سا چونکی مگر خاموش رہی۔ نما جانتی تھی' اس نے سوچا ہوگا پھولوں کو شاخوں سے جدا کرنے کو سخت ناپسند کرنے والی خود [illegible] ہے۔

☼

تیسری صبح گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے نجانے کیوں نما کا دھیان ٹیرس کی دیوار پر لگی ٹوکری کی طرف [illegible] معمول سے پہلے سیر ختم کر کے سیڑھیاں چڑھتے تھک گئی تو زندگی میں پہلی بار جی چاہا کہ لفٹ میں داخل ہو کر چوتھی منزل کا بٹن دبا دے اور پلک جھپکتے میں ٹیرس پر پہنچ جائے۔ عجلت میں سیڑھیاں چڑھ کر وہ ٹیرس پر پہنچی تو اس کی نظروں نے وہیں سے تین شوخ

گلابوں کو دیکھ لیا۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکا' یوں شاید کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پھولوں کو ٹوکری سے نکال لیا۔ شکر ہے اس وقت ارما ٹیرس پر موجود نہیں تھی۔ اس نے دور تک نظر دوڑائی سب دروازے بند تھے۔ چالیس نمبر فلیٹ والی غصیلی عورت راہداری میں گیلا تولیہ نچوڑ رہی تھی۔ بیالیس نمبر فلیٹ کی کھڑکی سے جھانکتا ہوا ایک چہرہ نما نے دیکھا۔ اسے نہیں معلوم وہ نما کو ہی دیکھ رہا تھا یا غیر ارادی طور پر دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ [illegible] چوری چوری چپکے چپکے پھول رکھ جانے والا [illegible] تھا؟

نما نے نظریں ہٹا لیں [illegible] وجود پسینے میں ڈوب گیا۔ وہ ایک [illegible] لڑکی تھی۔ آفس میں مردوں کے ساتھ [illegible] کرنے والی مگر کبھی اسے ایسی گھبراہٹ [illegible] جیسی اس وقت ہوئی۔ ڈھلتی عمر اور چاندی [illegible] جھلملاتے تاروں کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ دنیا نے اس سے آنکھیں چرا لی ہیں' وہ [illegible] کئی نظروں کو اپنے چہرے کا طواف کرتے دیکھتی۔ ان نظروں میں چھپا ہوا پسندیدگی کا پیغام بھی اس تک پہنچ جاتا مگر اس بات کا یہ جواز بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ راہ چلتے ہر کسی سے پھول پکڑ لے۔ ہر کسی سے مراد ہر اجنبی شخص یا وہ تھا جسے وہ جانتی تک نہیں۔ اگر وہ جانتی بھی ہو تو کسی کو کیا حق پہنچتا ہے یوں آتے جاتے بے شمار لوگوں کے سامنے یا ان سے چھپا کے گلاب کا ایک پھول اس کی مٹھی میں پکڑا دیا جائے۔ وہ کیوں پکڑے گی؟ پھول ٹوکری میں ملے تھے مگر اسے یونہی محسوس ہو رہا تھا کسی نے بے شمار لوگوں کے سامنے اس کی مٹھی میں پکڑا دیے ہیں۔

تین گلابوں کی خوشبو نے ارما کے سانسوں کو معطر کر دیا۔ نما نے اسے سچ نہیں بتایا کہ یہ پھول کہاں سے آئے۔ ارما یہی سمجھی کہ اس نے اپنی برسوں پرانی عادت بدل ڈالی ہے اور پھولوں کو شاخوں سے جدا کرنے والوں میں شامل ہو گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

چوتھی صبح۔ چار گلاب نما کے منتظر تھے۔

پھول ٹوکری سے نکالتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ [illegible] نمبر فلیٹ والوں کی بچی گلی کے بچوں کے ساتھ راہداری میں بھاگ رہی تھی۔ بیالیس نمبر فلیٹ والا اپنے دروازے کے سامنے ٹیرس میں سیدھا کھڑا دونوں بازو پھیلائے ایکسرسائز میں مصروف تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے اور رنگت صاف تھی۔ اس کی عمر چالیس سال ہو گی مگر وہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس نے رک کر اچانک دیکھا۔ نما اس وقت اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں نما پر جم گئیں۔ شکر ہے اسی وقت لفٹ کے دروازے سے نکل کر آنے والا عرفان گلا کھنکار کر گھنگریالے بالوں والے سے مخاطب ہوا۔ وہ دونوں بجلی کے میٹر کی غلط ریڈنگ کے بارے میں بات کرنے لگے۔ نما اسی اثنا میں پھول لیے اپنے فلیٹ میں آ گئی۔

ارما اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ شاور لے رہی تھی۔ نما نے پھول اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیے اور باتھ روم کے دروازے پر انگلی سے دستک دیتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ”تمہارے لیے پھول لائی ہوں۔“ اسے نہیں معلوم ارما نے اس کی آواز سنی یا نہیں مگر اسے یقین تھا اس کی آواز میں آج ایسی چہک برسوں بعد اسے سنائی دی تھی جو اس کی ماں کو نہال کر دیتی تھی۔ ماں کے ساتھ ہی نما کی زندگی کی رونق اور آواز کی کھنک منوں مٹی میں دفن ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

پانچویں صبح۔

معمول سے بہت پہلے وہ جاگ گئی۔ ارما سو رہی تھی وہ دبے پاؤں نکلی۔ نجانے کیوں وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارما جاگے اور ٹیرس پر بچھی کرسی پر بیٹھ جائے۔ سیڑھیاں اترنے کے بجائے اس نے واش بیسن کے پاس دیوار پر ٹنگی ٹوکری کو دیکھا' مصنوعی پھول ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

http://www.pakfunplace.com

"میری عدم موجودگی میں وہ پھول رکھ دے گا۔"
اس نے سوچا اور سیڑھیاں اتر گئی۔

گرین بیلٹ میں دو لڑکیاں بینچ پر بیٹھی تھیں۔ چند بچے ایکسر سائز کر رہے تھے۔ بوڑھا مالی ہاتھ میں قینچی پکڑے عرفان کے پاس کھڑا تھا۔ عرفان اسے پودوں کی فالتو شاخوں کو کاٹنے کی بابت سمجھا رہا تھا۔ معصوم صورت بھرے ہوئے بدن والے عرفان نے اسے دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ زما نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا۔ چار بوڑھوں کی خوش گپیاں کرتی ٹولی آگے آگے چل رہی تھی۔ انہیں وہ روزانہ یہاں دیکھتی تھی۔ اور گلاب کے پودوں کے پاس کھڑا۔ گھنگریالے بالوں والا، گلاب توڑ رہا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ پھول دینے والا دیر سے منتظر ہے۔ وہ اس کا انتظار کرتا رہا ہے۔

اسے لگا آج وہ اس کے پاس آ کر سب کے سامنے پھول پکڑا دے گا، زما نے یوں کبھی سوچا نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ نروس ہو گئی تھی۔ یہ انتہائی فضول حرکت ہوتی۔

سیر کے لیے آئے ہوئے لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے مگر یوں صبح سویرے وہ کسی گھٹیا رومانوی فلم کے کسی منظر کا کردار نبھانے کی خواہش بھی نہیں رکھتی تھی۔

زما اسے متوجہ کیے بغیر اس کے پاس سے گزری اور گرین بیلٹ کے آخری پلاٹ میں نرم نرم گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ ایک انجانے خوف نے اسے دیر تک واپس جانے نہیں دیا۔ وہ اس وقت تک گھاس پر ننگے پاؤں چلتی رہی جب تک بوڑھوں کی ٹولی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ بینچ پر بیٹھی لڑکیاں اپنے گھروں کو واپس نہیں چلی گئیں۔ ایکسر سائز کرتے بچے تھک کر ڈولتے قدموں سے لوٹ نہیں گئے، عرفان بلڈنگ آفس میں پہنچ نہیں گیا اور۔۔۔ گھنگریالے بالوں والا پلاسٹک کی ٹوکری میں پانچ گلاب رکھ کر اپنے کمرے میں گم نہیں ہو گیا۔

پانچ پھولوں کا گجرا بنا کر اس نے ارما کی کلائی میں پہنا دیا۔ ارما کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ پھول کہاں سے آئے ہیں۔

☼ ☼ ☼

چھٹی صبح۔ چھ گلاب ٹوکری میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

نجانے کس خیال نے اس روز زما کو مدت بعد گلابی سوٹ پہننے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن بھی بھول چکی تھی۔ کبھی بننے سنورنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ برسوں بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ بالوں کو سلیقے سے سنوارا، گلابی لپ اسٹک سے ہونٹوں کو سجایا۔ سیڑھیاں اترنے کے بجائے وہ پہلی بار لفٹ میں داخل ہوئی۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے یکدم عجلت میں گھنگریالے بالوں والا لفٹ میں داخل ہو گیا۔ زما دھک سے رہ گئی۔ روزانہ اسے پھولوں کا تحفہ دینے اور اس کے من میں خوشبو جگانے والا آج اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اتنا پاس کہ وہ اس کے گلابی آنچل کو اپنی انگلیوں میں لپیٹ لیتا۔ یہ عجیب قربت تھی جس نے زما کے بدن پر کپکپی طاری کر دی۔ وہ بے حد نروس تھی۔

چند پل کا یہ ساتھ، اسے لگا وہ صدیوں سے ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ گھنگریالے بالوں والے نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے گلابی سراپے سے نظریں چرا رہا۔ زما کو اس کی یہ ادا اچھی لگی۔

☼ ☼ ☼

ساتویں صبح۔ سات گلاب زما کی ساری تھکن سمیٹنے کو بے تاب تھے۔

زما سیر کے بعد فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھی تو ٹیرس میں کرسی پر بیٹھی ارما کو دیکھ کر ایک بار اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ارما وہاں روزانہ بیٹھتی تھی مگر زما کے لوٹنے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں جا چکی ہوتی۔ زما دبے پاؤں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے پاس سے گزری، ارما آنکھیں موندے نجانے کن خیالوں میں گم تھی۔ ٹوکری سے سات گلاب نکال کر زما نے گود میں رکھ دیے۔

"ایک خوش شکل لڑکا ہے جو روزانہ مجھے سیر کے دوران ملتا ہے اور پھول پکڑا دیتا ہے۔" شوخی بھرے لہجے میں اس نے ارما سے کہا۔

"سچ؟" ارما کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔

"بالکل سچ!" اس نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ یہ شوخی نجانے کہاں سے اس کے لہجے میں آ گئی تھی۔ وہ تو مدت سے زبان پر چپ کا تالا لگا کر سو رہی تھی۔

وقت نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا، ذمہ داریوں نے اسے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں دی تھی۔ اس نے ارما کو والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی مگر اس مشقت میں وہ بھول گئی تھی کہ اس کی اپنی بھی کوئی زندگی ہے، اپنے بھی کچھ خواب ہیں۔ وہ روزی کمانے کے چکر میں سب کچھ بھلا بیٹھی تھی۔ ایک اجنبی شخص جسے وہ جانتی نہیں تھی اس کی زندگی میں آ گیا تھا اور زما کو یوں لگا تھا اس کے ارد گرد بے شمار گلاب اگ آئے ہیں اور ان گلابوں کی خوشبوؤں کے حصار میں اس کا وجود مہک رہا ہے۔ اس اجنبی سے زما کی کبھی بات نہیں ہوئی تھی مگر ایک کردار اس نے خود سے تراش لیا تھا۔

نجانے یہ جھوٹ اس نے کیسے تراش لیا اور اتنے اعتماد سے کیسے بول دیا؟ پھول بھیجنے والا چالیس سال سے کم نہیں تھا۔ زما سے تین چار سال بڑا۔

☼ ☼ ☼

آٹھویں صبح۔ آٹھ گلاب، زما کی مٹھی میں گلدستہ بن گئے۔

"جاب کرتا ہے، ماں باپ نہیں ہیں۔ کم تنخواہ میں اچھے دن گزار رہا ہے۔" اس نے ارما کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"آپی! تمہیں پسند ہے؟" وہ زما سے لپٹ گئی۔

"ہاں، بہت پسند۔" زما نے ارما کی پیشانی چومتے ہوئے یوں کہا جیسے سچ مچ پھولوں کا تحفہ دینے والا شہزادہ بگھی میں بیٹھ کر اس کے دروازے پر آ گیا ہو اور وہ عروسی جوڑا پہن کر اس کے ساتھ بگھی میں سوار ہونے والی ہو۔

گھنگریالے بالوں والے کو اس روز زما نے ملٹی نیشنل کمپنی کی اسٹاف وین میں جاتے دیکھا تھا۔ کالے سوٹ میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی زما کو بس اسٹاپ پر کھڑے دیکھ لیا تھا۔ دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی تھی اور زما کے لبوں پر بھی مسکان آ گئی تھی۔ شکر ہے، زما کے لبوں کی مسکان کو عرفان نے نہیں دیکھا جو ذرا پرے کھڑا ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھے ہوئے لائن مین کو خراب تار کے بارے میں بتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نویں صبح۔ نو گلاب زما کی روح تک سرشار کر گئے۔

زما نے ارما کے کمرے کو گلاب کی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔

"اظفر نام ہے اس کا۔" زما نے ارما کی کھلی ہتھیلی پر اپنی انگلی سے اظفر لکھ دیا تھا۔

"اظفر۔ نام تو بہت پیارا ہے۔" ارما نے نام دہرایا تھا۔

زما نے ایک اور جھوٹ گھڑ لیا تھا۔ اس نے شرجیل کے بجائے اظفر کا نام لیا تھا۔

گزشتہ شام اچانک ہی زما کا سامنا گھنگریالے بالوں والے سے ہو گیا تھا۔ دونوں راہداری میں سامنے آ گئے تھے۔ زما نے اس کے سینے پر موجود نیم ٹیگ پر شرجیل اظفر نام کے ہجے پڑھ لیے تھے۔ وہ تنگ راہداری میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ زما کو لگا بوکھلاہٹ میں وہ شرجیل کے کندھے سے ٹکرا جائے گی اور یہ منظر کسی اور آنکھ کے لیے شاید خوشگوار نہیں ہو گا۔ وہ دیوار کے ساتھ سانس روک کے کھڑی ہو گئی۔

http://www.pakfunplace.com

شرجیل اس کے پاس سے گزرا' خوشبو کا ایک جھونکا بھی اس کے ساتھ چلا۔ شرجیل نے رک کر پیچھے دیوار سے لگی زما کو دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے اس کے لب حرکت میں آنے سے پہلے ساکت ہو گئے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ زما کا سانس رک رک چلا۔ دل میں اس خواہش کے باوجود کہ وہ لب کوئی من کو چھو جانے والی بات کہہ دیں' زما کی پیشانی پسینے میں تر ہو گئی۔ شرجیل بھی دل کی بات ہونٹوں میں دبا کر چپ چاپ مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

دسویں صبح۔ دس گلاب۔ زما گلابی نیند سو رہی تھی۔

زما کی اس صبح آنکھ نہیں کھلی۔ وہ جاگی تو کھڑکی سے سورج کی کرنیں اس کے کمرے میں ڈیرہ جمائے بیٹھی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں ننگے سر دروازے سے نکل کر ٹیرس میں آئی تو سامنے کرسی پر ارما بیٹھی تھی اس کی پشت واش بیسن کی طرف تھی اور وہ پلاسٹک کی ٹوکری میں موجود دس گلابوں سے بے خبر تھی۔ زما نے سامنے راہداری میں اپنے ٹیرس پر شرجیل کو بے مقصد چہل قدمی کرتے دیکھا۔ شاید وہ زما کو دیکھنے کے بہانے دیر سے ٹہل رہا تھا۔ زما تب سوئی پڑی تھی اور ٹیرس پر ارما کو دیکھ کر یقیناً" شرجیل کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ زما کو دیکھ کر اس طرف اٹھی ہوئی شرجیل کی نظریں جھک گئیں۔ شاید وہ زما کو بغیر دوپٹے کے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"آج میں اس کے ساتھ کافی پینے جاؤں؟" زما نے دس گلاب اپنی دونوں ہتھیلیوں کے کٹورے میں رکھ کر ارما سے پوچھا۔

"کافی پینے؟" ارما چونکی۔

"ہاں! وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔" زما نے اپنی بنی ہوئی کہانی کے ایک کردار کو اپنی زبان دے دی۔

"میں بتاؤں' وہ کیا کہے گا؟" ارما مدت بعد شوخ ہوئی تھی۔

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" زما نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

اس شام واقعی گرین بیلٹ میں شرجیل نے زما کا رستہ روک لیا۔ وہ معمول سے ہٹ کر آج شام کے وقت سیر کرنے نکلی تھی' اسے خبر نہیں تھی کہ شرجیل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ کئی بے مقصد چکر کاٹنے کے بعد یکدم اس نے زما کو مخاطب کر لیا۔

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" وہ کنفیوز سا تھا۔

زما کو اس لمحے کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ اس کے قدم رک گئے اور دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔

"جی۔" بمشکل اس نے کہا۔

"میں۔" پیشانی مسلتے ہوئے وہ پھر چپ رہ گیا۔ وہ کمسن بچہ یا کالج کا لڑکا نہیں تھا۔ چالیس سالہ مرد تھا جس نے زمانے کی اونچ نیچ دیکھ رکھی تھی مگر نجانے کیوں وہ اپنی بات کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دیر تک وہ چپ کھڑا رہا۔

"میں جاؤں؟" زما نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھی اس کی قربت میں پگھلتی جا رہی تھی۔

شرجیل نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ زما نے جواب لینا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ دونوں اپنے اپنے قدموں اپنے اپنے رستے پر چلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

گیارہویں صبح۔ گیارہ گلاب۔ ایک کتاب۔

گیارہ گلابوں کے ساتھ شاعری کی ایک کتاب بھی پلاسٹک کی ٹوکری میں موجود تھی۔ شرجیل کی بھیجی ہوئی شاعری کی اس کتاب کو زما نے ارما کو بتائے بغیر اپنے کپڑوں کی الماری میں رکھ دیا۔ اسے کسی زمانے میں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ شاعری سے شغف تھا۔ اچھے اچھے اشعار پڑھنا اور انہیں اپنی ڈائری میں محفوظ کر لینے کا جنون تھا مگر کئی برس ہوئے اس کا کتاب سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ مطالعہ کا وقت نہیں ملتا تھا۔ مل بھی جاتا تو دن بھر کی دفتری تھکاوٹ اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ وہ کتاب کے اوراق پر لکھے حروف سے آشنائی

کرتی۔ گیارہ پھولوں کے ساتھ سنہری کاغذ میں لپٹی ہوئی کتاب نے زما کو مسرور کر دیا۔ شب کے دوسرے پہر اس نے سنہری کاغذ میں لپٹی کتاب کو الماری سے نکالا۔ اس کا خیال تھا پہلے صفحے پر اس کے لیے کوئی خوبصورت جملہ ہوگا یا کتاب کے درمیانی صفحوں میں تتلی کے پر ملیں گے یا پھول کی پتیاں۔ کتاب بھیجنے والے نے بڑی محبت سے چھپا کر کے بھیجی ہوں گی۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ رات کے آخری پہر تک زما اس کتاب کی ورق گردانی میں مشغول رہی' اس کی آنکھ لگی تو ادھ کھلے صفحوں والی وہ کتاب اس کے سینے پر سو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بارہویں صبح' بارہ گلاب۔ پتی پتی محبت کے پیامبر۔ زما نے بارہ گلاب ارما کی گود میں رکھ دیے۔ زما کی طرح اسے ان پھولوں کا انتظار نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس کی باتوں میں پھولوں کی آمد پر انتہا خوشی کا احساس ہوتا۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی کہ اس کی آپی کی زندگی میں کوئی ایسا آگیا ہے جس نے اسے پھولوں اور خوشبو سے دوبارہ روشناس کرا دیا ہے۔ زما نے بھی اسے اصل بات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ کسی روز یکدم اسے شرجیل کے بارے میں بتا کر شاد کر دینا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا جلد ہی شرجیل کسی روز زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ لیے اس کے دروازے پر کھڑا ہوگا۔

زما کا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔ اسی شام سفید سوٹ میں ملبوس شرجیل رنگ برنگے پھول لیے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

"میں نے گنے نہیں گلدستے میں آج کتنے پھول ہیں' میرا خیال ہے تیرہ ہوں گے۔" زما نے ارما کے ہاتھوں میں گلدستہ پکڑاتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"آپی! آج وہ جو کہے مان لینا۔" ارما نے اتنی دھیمی آواز میں کہا جسے زما نے بھی بمشکل سنا۔

زما' ارما کی بات کو پلو سے باندھ کر ڈرائنگ روم میں شرجیل کے سامنے بیٹھ گئی۔

"مجھے پہلی نظر میں وہ پسند آگئی تھی۔" شرجیل نے بہت دیر چپ رہنے کے بعد سناٹے کا سینہ چیرا۔ زما اس بات پر چونک گئی۔

"عمر کے فرق کا مجھے احساس ہے مگر میں اسے خوش رکھوں گا۔" شرجیل نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

"اسے؟" زما کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بند کر لیا۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ٹیرس میں بیٹھنے والی لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں۔" شرجیل نے اعتراف کیا۔

زما کو لگا اس کی سماعت اسے دھوکا دے رہی ہے۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں مگر اسے وہ سب سننا تھا جو شرجیل آج بول رہا تھا۔ شرجیل نے دور سے ارما کو دیکھا تھا اور وہ لڑکی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ ارما کو پا لینے کی خواہش کئی روز اپنے دل میں رکھنے کے بعد آج وہ اظہار کے لیے آگیا تھا۔

ڈوبتی نبض اور ڈولتے قدموں کے ساتھ جا کر زما اپنے کپڑوں کی الماری میں رکھی ہوئی کتاب نکال لائی۔ گیارہ پھولوں کے ساتھ ملنے والی کتاب اس نے شرجیل کو تھما دی۔

"ارما کتابیں نہیں پڑھتی۔" زما کے کھوکھلے لہجے' ٹوٹے لفظوں کو شرجیل نے حیرانی سے سنا۔

"یہ کتاب؟"

"میں نے کہا ناں اندھی لڑکی کتابیں نہیں پڑھتی۔" زما نے رندھے ہوئے لہجے میں شرجیل کو بتایا۔ شرجیل بھی ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ روزانہ ٹیرس میں کرسی پر بیٹھنے والی لڑکی بینائی سے محروم ہے۔ اسی محرومی نے اسے دنیا کی نظروں میں بے وقعت کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی' اکتائی اکتائی رہتی ہے۔ زندگی میں اس کے لیے کوئی رونق کوئی رنگ نہیں ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں۔

"ارما کو سرخ اور زرد رنگ کے پھولوں میں فرق

http://www.pakfunplace.com

معلوم نہیں، اپنی کتاب واپس لے جائیں۔" بھیگی آنکھوں والی نے شرجیل کو بتایا۔

شرجیل رکا نہیں چلا گیا مگر جاتے جاتے زما کو بھول بھلیوں میں چھوڑ گیا۔

"مجھے ہر صورت میں ارما پسند اور قبول ہے۔ ٹوکری میں پھول میں نے کبھی نہیں رکھے نہ یہ کتاب میری ہے۔" اس نے جاتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ زما سے اٹھا نہیں گیا۔ وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی اپنی سنائی ہوئی کہانی ایک عجیب موڑ پر آ گئی تھی۔ وہ ارما کو کیا بتائے گی؟ ٹوکری میں پھول رکھنے والا شرجیل نہیں تھا تو پھر کون ہے؟ کیا شرجیل اس سے جھوٹ بول رہا تھا؟ وہ ارما کے لیے پھول چھوڑ جاتا تھا؟ کسی سوال کا جواب زما کے پاس نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

چودہویں صبح۔ چودہ گلاب۔ ٹوکری میں نہیں تھے۔ زما اس دن دیر سے جاگی وہ سیر کے لیے نہیں گئی۔ پلاسٹک کی ٹوکری میں پژمردہ مصنوعی پھولوں کو اس نے مردہ دلی سے دیکھا۔ شاید پھول بھی اس کی طرح افسردہ تھے۔

شرجیل کے کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ وہ ٹیرس پر بھی دکھائی نہیں دیا۔ زما تھکا ماندہ وجود لیے ٹیرس میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ بہت دیر بعد ارما کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔

"آج پھول نہیں آئے آپی؟" ارما کے لہجے میں ایسی آس تھی جس نے زما کو کاٹ کے رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا ارما کو پھولوں اور پھول بھیجنے والے سے کوئی دلچسپی نہیں مگر اس کے لہجے کی آس۔

زما کی چپ ہی ارما کے سوال کا جواب تھی۔ وہ بھی چپ ہو گئی۔ زما کو لگا ارما کی بینائی کے ساتھ زما کی آنکھوں کا نور بھی ختم ہو گیا ہے۔

"آج وہ جو کہے مان لینا آپی!" گزشتہ روز کی سرگوشی زما کے کانوں میں گونجی اور زما جیسے طویل خواب سے جاگ اٹھی۔

"میں نے تو زندگی کے کچھ رنگ دیکھ لیے ہیں، ارما کو کس بات کی سزا دے رہی ہوں؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک سوچ نے ایک پل میں اسے ایک بڑے فیصلے کا حوصلہ دے دیا۔ ارما کی زندگی میں بہار آنے والی تھی۔ اور وہ اس کا راستہ نہ روکنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ شرجیل، ارما سے تقریباً "بیس سال بڑا تھا۔ وہ ارما سے محبت کرتا تھا اور یہ جواز کافی تھا۔ زما نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شرجیل کی خواہش رد نہیں کرے گی اور ارما کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے گی۔

"کاش! تم دیکھ سکتی۔ اس کی آنکھوں میں تمہارا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔" زما نے ارما کی پیشانی چومتے ہوئے محبت سے کہا۔ ارما کو حیران چھوڑ کر وہ مطمئن دل کے ساتھ آفس جانے کے لیے بس اسٹاپ پر آئی تو شرجیل بھی آفس وین کے انتظار میں وہاں کھڑا تھا۔ زما کو ایک نظر دیکھ کر وہ کلائی پر موجود گھڑی کی سوئیاں دیکھنے لگا جیسے زما کا سامنا کرنے سے گریزاں ہو۔ بااعتماد قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی زما اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"میں ارما کو بتا دوں کہ آج شام ہم اس کی ... کھانا اکٹھے کھائیں گے؟" اس نے انتہائی خوشگوار لہجے میں سرگوشی کی۔ شرجیل نے چونک کر ... دیکھا پھر اس کے چہرے پر خوشی کے وہ سارے رنگ پھیلتے چلے گئے جو زما اپنی بہن کے چہرے پر دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ ۔۔۔ شرجیل ... کی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں ... اور اپنی آفس وین کی طرف قدم بڑھا ... جوان کے سامنے آ رکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں۔" چند ہی لمحے بعد ایک بائیک زما کے سامنے رکی۔ زما نے حیرت سے عرفان کو دیکھا جو اسے بائیک پر بیٹھنے کا کہہ رہا تھا۔

"میں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی! آپ ...!" عرفان نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ زما کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی اسے بائیک پر بیٹھنے پر مجبور کر دیتا۔ زما پچھلی سیٹ پر سٹ کر بیٹھ گئی یہ سوچے بغیر کہ عرفان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور بس اسٹاپ پر موجود بہت سی نظریں انہیں معنی خیز انداز میں دیکھ رہی ہیں اور یہ سمجھے بغیر کہ بیس پچیس سال کے اس لڑکے کے پیچھے بائیک پر بیٹھ جانے کا مطلب کیا ہے جو محض اس سے کرایہ وصول کرنے ہر مہینے اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور جس کی ذمہ داری بلڈنگ کی دیکھ بھال اور مکینوں سے حساب کتاب کی ہے۔ وہ ایک اچھا سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ کم گو۔

"میں یوں ... کے ساتھ بائیک پر نہیں بیٹھی۔" اس ... بائیک چلانے والے سے کہا۔

"میں ... یوں بھی کسی کو بائیک پر نہیں بٹھاتا۔" بائیک چلانے والے نے اسی کے انداز میں جواب دیا اور سوال کرنے والی سے منزل کا پتہ پوچھے بغیر اپنی مرضی سے ایک راستہ منتخب کر لیا۔

"آج میں ایک کپ کافی آپ کے ساتھ پینا چاہتا ہوں۔" ریستوران کی پارکنگ میں بائیک روکتے ہوئے عرفان نے کہا۔ زما پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عمر میں اس سے کم از کم دس سال چھوٹا لڑکا اسے بائیک پر بٹھا کر ریستوران میں کافی پلانے لایا تھا۔

"آئیں۔" اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اس کے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں۔ بااعتماد مردوں کی طرح وہ سینہ تانے ریستوران کے دروازے سے داخل ہو گیا۔ الجھی کھڑی زما وہیں سے اس کی پشت پر نظریں جمائیں رہی اور پھر نجانے کس جذبے نے اس کے قدموں کو روانی دے دی۔

"گلاب کے وہ پھول روزانہ میں رکھ جاتا ہوں۔" زما کے سامنے بیٹھے کافی کے کپ پر انگلی پھیرتے ہوئے عرفان نے اعتراف کیا۔ ایسا اعتراف جس نے زما کو نڈھال کیا یا نہال۔ وہ جان نہیں پائی۔

"تم؟" وہ ششدر تھی۔

"ہاں! میں! وہ کتاب بھی۔" کم عمر لڑکا اسے حیران کیے جا رہا تھا۔

"... لیے؟" تھکتے ہوئے لفظوں میں زما نے پوچھا۔ عرفان کے ... نے اسے بے حد الجھا دیا تھا۔ وہ ارما کا ہم عمر ... اور ... زما کو گمان گزرا وہ ارما کی محبت میں مبتلا تھا۔ اگر یوں تھا تو یہ بہت بڑا شاک تھا۔ شرجیل بھی ارما کو پسند کرتا تھا اور عمر کے تفاوت کے باوجود زما اسے ارما کے لیے قبول کر چکی تھی۔

"نہیں۔ زما کے لیے!" عرفان نے پوری سچائی سے زما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

کافی کا کپ زما کے ہاتھوں میں لرزا اور اس کا اپنا سارا وجود بھی لرز گیا۔ کہانی کس موڑ پر آ گئی تھی۔ اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ عرفان اس سے عمر میں کئی سال چھوٹا تھا۔ زما نے کبھی اس نظر سے اسے دیکھا نہ اس کے بارے میں کبھی ایسا خیال اس کے دل کو چھو کر گزرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرا خیال ہے محبت اندھی ہوتی ہے، عمر کا فرق دیکھ نہیں سکتی۔" پچیس سالہ لڑکے نے پینتیس سالہ لڑکی کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا اور گجرے بیچنے والے کی شرارتی نظروں کی پروا کیے بغیر لڑکی کی دونوں کلائیوں میں گجرے پہنا دیے۔ اسے مزید ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زما کے دل نے گواہی دے دی تھی کہ وہ سچا ہے اور اس کی محبت میں وہ سچائی ہے جو لفظوں کی محتاج نہیں۔ اور عرفان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ دونوں کلائیوں سے لپٹے ہوئے پھول پورے چودہ تھے۔

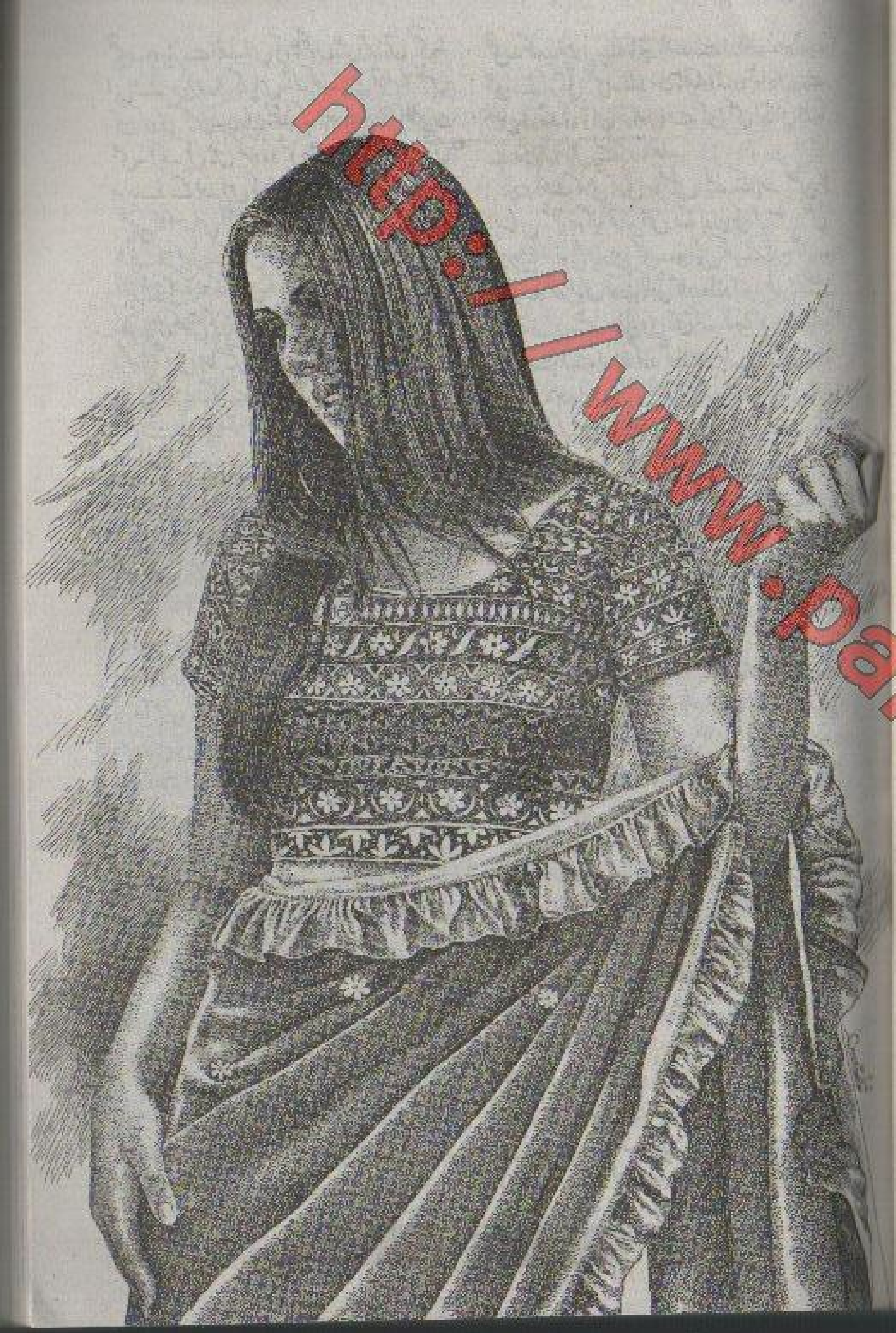

http://www.pakfunplace.com

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

وہاں اندھیرا بہت تھا۔ ہیبت ناک سناٹا تھا۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ بھاگنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ہاتھ پاؤں ہلا نہیں رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ کوئی تو آجائے اس کی مدد کے لیے۔ کوئی تو۔ کوئی تو آکر اسے اس اندھیرے سے نکال دے۔ وہ رو پڑا۔ وہ زارو قطار رو رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا مگر اس ہیبت ناک سناٹے میں اس کی آواز سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔

اسے اندھیرے سے روشنی میں لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے رونے کی آواز میں کسی کے قہقہے کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

یہ کون تھا؟ کون اس کی بے بسی پر ہنس رہا تھا؟

بے چینی سے کروٹ بدلتے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم پہ ایک لرزش سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔ اسے اندھیرا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کیا۔ لیمپ روشن کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ لیمپ نے کمرے میں پھیلے اندھیرے کو کم کر دیا تھا مگر اسے یہ روشنی ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اس اندھیرے، اس سناٹے اور اس خاموشی سے وحشت ہو رہی

مکمل ناول

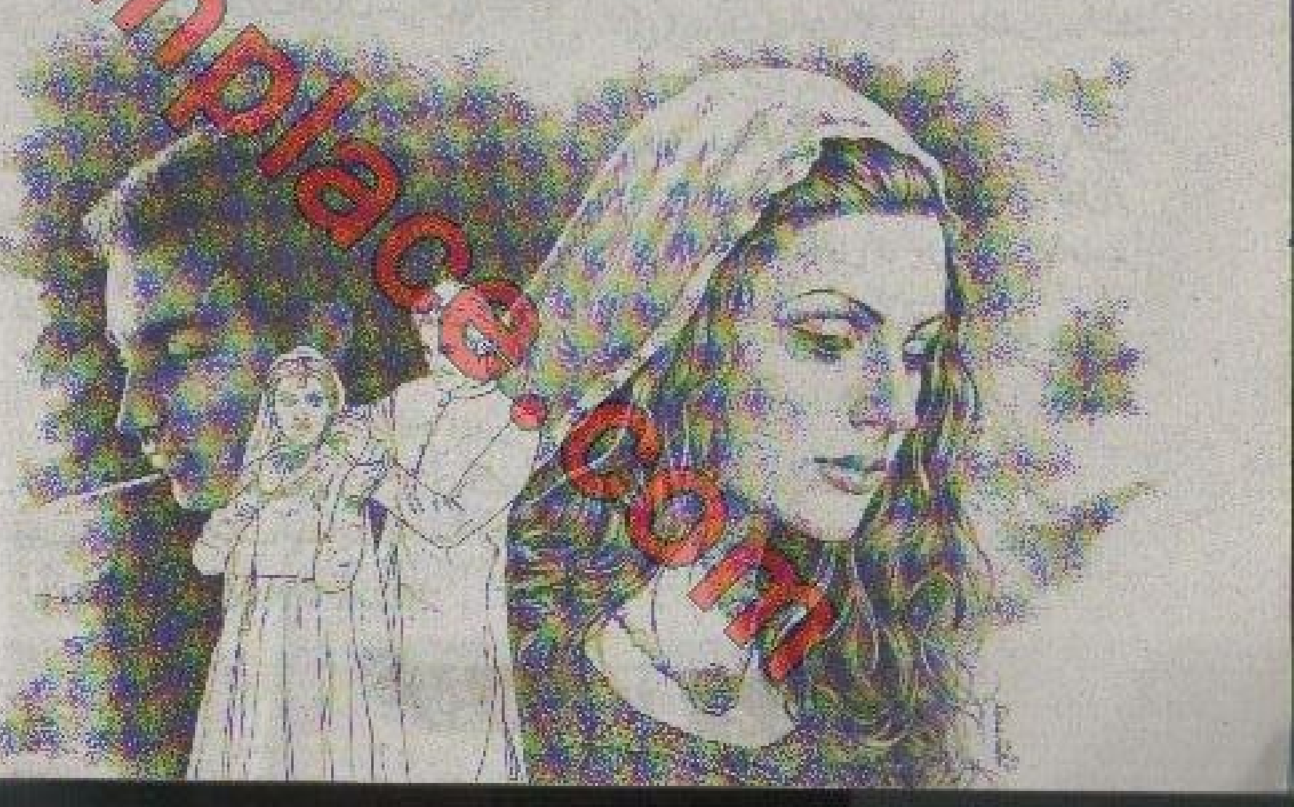

تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ اس نے سوئچ بورڈ کے پاس آکر کمرے کی تمام لائٹس آن کردی تھیں۔ یہاں تک کہ چھت پر لٹکتا فانوس بھی۔ ایک پل میں کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ روشنی ہوجانے کے بعد اس کی وحشت تو ختم ہوگئی تھی مگر گھٹن کا احساس ابھی بھی تھا۔ وہ کمرے کے دوسری طرف کھڑکیوں کے پاس آیا۔ اس نے ایک ایک کرکے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ پھر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے روم کی بالکونی میں آگیا۔ وہ بہت گہری گہری سانسیں لے رہا تھا‘ خود کو پرسکون اور نارمل کرنے کے لیے۔

اسے یاد آچکا تھا کہ وہ کسی اندھیری اور ہیبت ناک جگہ نہیں بلکہ یورپ کے ایک خوب صورت ملک میں ہے۔ وہ اٹلی میں ہے۔ وہ اس وقت روم کے ایک خوب صورت اور شان دار ہوٹل کے پرآسائش کمرے میں ہے۔ وہ ریلنگ پر بازو جما کر کھڑا ہوگیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا‘ اس لیے سامنے نظر آتی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزرتی نظر آرہی تھیں۔ اس کا دل ابھی تک گھبرا رہا تھا۔

آخر یہ خواب اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟؟

برس ہا برس ہوئے اس نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ اسے سونے سے خوف آیا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا ادھر وہ سوئے گا‘ ادھر کچھ نہ کچھ برا ہوجائے گا۔ نیند سے فرار کی یہ کوششیں اتنی کامیاب ثابت ہوئی تھیں کہ اب جب وہ خود کو ایک مضبوط اور توانا مرد سمجھتا تھا‘ یہ سمجھتا تھا کہ اسے کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگتا‘ وہ رات کو پرسکون نیند سونا چاہتا تھا‘ تب اسے نیند لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہیں آتی تھی۔ وہ insomnia (بے خوابی) کا مریض ہوگیا تھا۔ وہ پوری پوری رات نیند کے آجانے کی کوششیں کرتے گزار دیا کرتا تھا۔ جب اس کیفیت کو بہت راتیں گزر جاتیں نیند نہ ہونے کی وجہ سے دن کے اوقات میں معمولات زندگی متاثر ہونے لگتے تو وہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ گولیاں لے لیا کرتا تھا۔ ان گولیوں کے ساتھ نیند آجاتی تھی۔ مگر یہ نیند اپنے ساتھ بہت سے ڈراؤنے خواب بھی لے کر آتی تھی۔ غلط سوچتا تھا وہ کہ وہ خوابوں سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو ان خوابوں سے آج بھی اتنا ہی ڈرتا ہے جتنا بارہ سال پہلے ڈرتا تھا۔

چند منٹ گہری گہری سانسیں لینے کے بعد گھٹن کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بدن کی لرزش بھی بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔ وہ واپس کمرے میں آگیا۔ اس نے کھڑکیاں اور بالکونی کا دروازہ اسی طرح کھلے رہنے دیے تھے۔ وہ ٹی وی آن کرکے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے اپنے گرد آوازیں چاہیے تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک چینل تبدیل کررہا تھا۔ اٹالین میں آتے یہ پروگرام اسے قطعاً ”سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر وہ پھر بھی انہیں سننا چاہتا تھا۔ اب اپنے اندر کی وحشت اور سناٹا مٹانے کو باقی رات اس نے یہی کام کرنا تھا۔ زندگی کی بے شمار راتوں کی طرح یہ رات بھی جاگ کر صبح کا انتظار کرتے ہوئے گزارنی تھی۔

✡ ✡ ✡

صبح وہ ایک نارمل انسان کی طرح آفس روانگی کے لیے تیار تھا۔ یوں جیسے رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بہترین تراش خراش والے سوٹ میں ملبوس ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک تمسخرانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اس کی یہ تیاری دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خود سے اور ساری دنیا سے نفرت میں مبتلا ایک انسان ہے۔ وہ اندر سے کھوکھلا ہوچکا ہے۔ یہ سوٹ‘ یہ ٹائی‘ یہ سلیقے سے بنے بال‘ یہ ٹائی پن‘ یہ کف لنکس اور یہ بہترین جوتے دیکھ کر کون سوچے گا کہ وہ سکندر حیدر self destructive (خود تخریبی) اور suicidal temperament (خود کشی کا رجحان) رکھتا ہے۔ خود پر سے نفرت اور حقارت کی نگاہیں ہٹاتا وہ شیشے کے سامنے سے ہٹا۔ اس نے اپنا بلیک لیدر بریف کیس لیا‘ لیپ ٹاپ بیگ میں لیپ ٹاپ رکھا۔ وہ اپنے ہوٹل روم سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا ہوٹل via vittorio veneto

سے کچھ ہی فاصلے پر تھا جبکہ اس کا آفس barberini via پر تھا۔ گویا آفس اور اس کے ہوٹل کے بیچ میٹرو کے بس ایک ہی اسٹاپ کا فاصلہ تھا۔ مگر کل جب وہ ہوٹل سے آفس پہلے دن گیا اور آفس کی گاڑی نے اسے پک کیا تب محض ایک اسٹاپ کا یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے سوا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں کی طرح ٹریفک جام روم کا بھی مسئلہ تھا۔ تب کل ہی اس نے یہ طے کرلیا تھا کہ آئندہ وہ آفس میٹرو میں جایا آیا کرے گا۔ اس کے لیے یہ کوئی ناک کا مسئلہ نہیں تھا۔ روم کا انڈر گراؤنڈ سسٹم لندن اور پیرس جتنا مربوط تو نہ تھا مگر پھر بھی ٹریفک جام میں پھنسنے سے بدرجہا بہتر تھا۔ یوں اس نے آنے جانے کے لیے ملی گاڑی اور ڈرائیور والی سہولت کو اس نے پہلے دن ہی خیرباد کہہ دیا تھا۔

میٹرو اسٹیشن پر رش کا حصہ بنا وہ بھی ٹرین میں سوار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے اردگرد کھڑے اور بیٹھے ہوئے رومن مردوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر کو اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ مگر اس جلدی اور بھاگ دوڑ والے انداز کے باوجود بھی ان میں سے کوئی ایک بھی اسے ایسا نظر نہیں آرہا تھا جو خوش لباس نہ ہوتا۔ فیشن اور اسٹائل رومنوں کے لیے ایک بہت سنجیدہ بات ہے۔ عورتوں کے لباس‘ ان کا میک اپ‘ ہینڈ بیگز‘ سینڈلز‘ مردوں کے سوٹس‘ ٹائیاں‘ جوتے‘ بریف کیس ہر کچھ فیشن کے عین مطابق تھا‘ بے حد اسٹائلش تھا۔ ٹھیک ہی کہا جاتا تھا کہ رومنز بڑے classy اور اسٹائلش لوگ ہوتے ہیں۔ اسے اگلے ہی اسٹیشن پر اترنا تھا۔ اور اس کا اسٹیشن فوراً ہی آگیا تھا۔ via barberini پر میٹرو اسٹیشن سے بہت نزدیک ہی اس کا آفس تھا۔

یہ اس کی دوبا میں اپنا ہیڈ آفس رکھتی ملٹی نیشنل کمپنی کا جنوبی یورپ میں واقع ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ آفس آگیا تھا۔ وہ جن کاموں کی انجام دہی کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا ان میں مصروف ہوگیا تھا۔ آفس میں جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑ رہا تھا ان سے کل اور آج رسمی ہائے ہیلو کے بعد اس کی صرف اور صرف پروفیشنل نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی۔ کام کی بات مکمل پیشہ ورانہ انداز میں۔

✡ ✡ ✡

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے یہاں سے جاکر کچھ نہیں کرنا تھا۔ اپنے ہوٹل روم میں بند ہوجانا تھا یا شاید روم کی گلیوں کوچوں میں تنہا پھرنا تھا اور اس میں سے کوئی بھی چیز اس کے لیے ایسی کشش نہ رکھتی تھی کہ وہ آفس سے جلدی اٹھنے کی خواہش رکھتا۔ مگر چونکہ آفس ٹائم ختم ہوچکا تھا۔ ایک ایک کرکے سارا آفس خالی ہو رہا تھا سو وہ بھی آفس سے نکل آیا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول
فصل غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل
قیمت 300 روپے
اے محبت تیری خاطر
نازیہ کنول نازی
قیمت 225 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

http://www.pakfunplace.com

اسے راستے کا دو دن میں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اور اس کی جیب میں روم کا بڑا جامع نقشہ بھی موجود تھا گویا راستہ بھٹکنے کا امکان نہ تھا چنانچہ بجائے میٹرو اسٹیشن کی طرف جانے کے اس نے پیدل اپنے ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا۔

یہ جون کا مہینہ تھا اور روم میں موسم خاصا خوش گوار تھا۔ سورج آج کل قریباً" پونے نو بجے غروب ہوا کرتا تھا سو ان دنوں یہاں شامیں بڑی لمبی تھیں۔ وہ via barberini سے via veneto کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے اردگرد قدیم عمارتیں تھیں نظارے تھے۔ مگر اسے روم کی ہسٹری میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ابھی بھی اس خواب کے حصار میں تھا۔ اب اگلے کئی روز اسے اس خواب کے حصار ہی میں رہنا تھا۔ اور اگلے کئی دن خوف کے سبب سونا نہیں تھا۔

اس نے آج صبح نہ تو ناشتا کیا تھا نہ ہی دوپہر میں لنچ۔ آفس میں خالی پیٹ کافی کے تین کپ ضرور پیے تھے۔ اسے سڑک کے کنارے ایک pizzeria نظر آیا تب اسے اپنے آج تمام دن کچھ بھی نہ کھانے کا احساس ہوا۔ وہ یہاں سے پزا کھاتا ہوا چلا جائے پھر ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر رات گئے تک اپنا آفس کا کام کرتا رہے گا اس نے دل ہی دل میں طے کیا۔ ابھی چونکہ ڈنر ٹائم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس چھوٹے سے پزیریا میں اسے میزوں پر دو چار لوگ ہی بیٹھے نظر آئے۔ وہ اپنا پزا آرڈر کرنے کاؤنٹر پر آگیا تھا۔ مگر اٹالین سیکھے بغیر اپنے لیے کچھ آرڈر کرنا اس قدر مشکل کام ہے اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

پزا آرڈر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو تقریباً" دس منٹ گزر گئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے درمیانی عمر کے اٹالین مرد اور عورت انگریزی سے قطعاً" ناواقف تھے۔ وہ دونوں مرد و عورت خوش اخلاقی سے مسکرا مسکرا کر اس کے انگریزی لفظوں کے جواب میں مختلف اشیا اٹھا اٹھا کر اسے دکھا رہے تھے۔

اچھا وہ اپنے پزا کی یہ topping چاہتا ہے فلاں طرح کے مشرومز کا اضافہ چاہتا ہے' pomodoro چاہتا ہے۔ نجانے وہ اسے کیا کیا اٹھا کر دکھا رہے تھے۔ ساتھ ان اشیا کے نجانے کیا کیا اٹالین نام لے رہے تھے۔ وہ دونوں تحمل سے اسے وقت دے رہے تھے۔

وہ اس بے کار کی مشقت سے بیزار ہو گیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے ہوٹل جا کر کھانا کھائے۔ جہاں انگریزی سمجھی بھی جاتی ہے اور بولی بھی جاتی ہے۔ قریب تھا کہ وہ انگریزی ہی میں ان دونوں کا شکریہ ادا کرتا وہاں سے پلٹ جاتا کہ اچانک ہی بالکل پیچھے والی میز سے اٹھ کر ایک اٹالین لڑکی اس کے پاس آئی۔

"may I help you" (میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں) وہ بڑی شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ اتنا وقت یہاں کھڑے ہو کر برباد کر چکا تھا تو اب یہاں سے کھانا کھا کر ہی جانا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

وہ ابھی اس لڑکی کو انگریزی میں یہ سمجھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ کس طرح کا پزا آرڈر کرنا چاہتا ہے کہ وہ بڑی روانی سے گٹ پٹ کرتی سامنے کھڑے مرد و خاتون سے اٹالین میں چند جملے بولی۔ جملے اگر الفاظ توڑ توڑ کر بھی بولے گئے ہوتے تب بھی اس کے سر کے اوپر ہی سے گزرنے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی عورت "si" کہتی مسکراتے ہوئے اندر کچن میں چلی گئی تھی جبکہ مرد اس اٹالین لڑکی سے اٹالین ہی میں کچھ بات کرنے لگا تھا۔ وہ ان کو باتیں کرتے۔ ان دو افراد کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ مرد کے مسکرا مسکرا کر اپنی طرف دیکھنے سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ گفتگو اسی کی بابت ہو رہی ہے۔

"یہ آپ سے معذرت کر رہے ہیں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔"

لڑکی اب اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ گویا اٹالین جملوں کا انگریزی ترجمہ و خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔

"میں نے آپ کا پزا آرڈر کر دیا ہے۔ اصل میں' میں اسی ٹیبل پر بیٹھی تھی اور آپ کی ساری بات سن رہی تھی۔"

اس نے کاؤنٹر کے قریب ترین میز کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر اس میز کی طرف دیکھا۔ وہاں اس لڑکی کا چند لقمے کھایا پزا اور کولڈ ڈرنک کا ان چھوا گلاس رکھا ہوا تھا۔

"تھینکس!" اس نے پر تکلف انداز میں سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا شکریہ ادا کیا۔

"آپ کے پزا میں کسی بھی طرح کا میٹ نہیں ہونا چاہیے میٹ اسٹاک بھی نہیں ہونا چاہیے اور وائن بھی نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو بالکل سادہ مشرومز اور سبزی والا پزا چاہیے۔" وہ مسکرا کر اس سے بولی۔

"یس آئی تھینکس اگین" اس بار اس نے یہ الفاظ سنجیدگی سے ادا کیے۔

"مائی پلیژر" وہ خوش اخلاقی سے مسکرائی۔

"آپ بل پے کر دیجیے گا پزا تیار ہو رہا ہے۔ دس سے پندرہ منٹ لگیں گے۔ تب تک آپ بیٹھ جائیں۔" وہ بل پے کرنے کے بعد اپنے لیے کوئی اور میز منتخب کر کے وہاں بیٹھنے کے ارادے سے مڑا تھا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ کاؤنٹر سے ہٹی تھی مگر جیسے ہی کاؤنٹر سے ہٹ کر وہ اس لڑکی کی میز کے قریب پہنچے وہ اس سے بولی۔

"آئیے بیٹھیے۔" اس نے بالکل ابھی ابھی اس کی مدد کی تھی۔ وہ فوراً" بد اخلاقی دکھا کر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں دل میں اسے یہ پیش کش اور بے تکلفی گراں گزری تھی۔ بہرحال وہ مجبوراً" اور مروتاً" اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا' بے حد پر تکلف انداز میں۔

"نیکسٹ ٹائم آپ کو اپنے لیے کچھ آرڈر کرنا ہو یا کہیں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے رہے ہوں اور ان کے اجزا دیکھنا چاہیں تو پورک کے لیے strutto کا لفظ یاد رکھیے اور وائن کے لیے vino کا۔ اور آپ کو یہ دونوں چیزیں اپنے کھانے میں نہیں چاہئیں۔ اس کے لیے senza کا لفظ استعمال کیجیے گا۔ یعنی آپ کہیں گے "senza strutto vino۔"

وہ مسکرا کر بتا رہی تھی۔ غالباً" اسے بلاوجہ اور بات بے بات مسکرانے کی عادت تھی۔ اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کا کسی سے بھی خوش اخلاقی دکھانے اور گفتگو کرنے کا موڈ نہ تھا مگر اس سے مدد لینے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی تھا۔ اس نے سنجیدگی سے صرف اس کی بات سنی تھی۔ جواب میں کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ مگر اس باتونی لڑکی کو اس کے کچھ بولنے یا نہ بولنے سے یقیناً" کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے مزید بتا رہی تھی۔

"اٹالین زیادہ مشکل زبان نہیں ہے۔ اٹالین کے بہت سے لفظ تو آپ یقیناً" پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ papuccino'espresso'gelato'pasta'۔" pizzacafe'solo'paparazzi

وہ اپنی آنکھوں پر لگے اسٹائلش گلاسز کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے بولی۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے بلیک کلر کی کیپری پینٹ ریڈ کلر کے اسٹائلش ٹاپ کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ اس کے سلکی بال سرخی مائل براؤن کلر کے تھے اور اس نے ان کی اونچی کر کے پونی بنا رکھی تھی۔ لبوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگی تھی۔ اس کے خوب صورتی سے تراشے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے بلیک فریم والے اسٹائلش اور فیشن کے مطابق گلاسز دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ ڈیزائنر گلاسز ہیں۔ شاید ارمانی کے یا اسی کی ٹکر کے کسی اور ڈیزائنر کے۔ دیگر تمام اٹالینز کی طرح فیشن اور اسٹائل یقیناً" اس کے لیے بھی بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے انداز شاہانہ تھے اور اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ جب وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھی اس سے گفتگو کر رہی تھی تو بغیر کسی دلچسپی کے ہی سہی پر وہ اسے دیکھ تو رہا تھا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا مرد ان کی میز پر آکر اس کا پزا سرو

کررہا تھا۔ وہ لڑکی مسکرا کر اس سے بولی تھی۔

"Grazie signore alberto"

البرٹو مسکراتا ہوا وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ "Grazie" شکریہ کو بولتے ہیں' یہ تو پتا ہوگا ناں آپ کو؟"

"جی۔" اس کے طویل جملوں کے جواب میں اس کے جملے ایک یا دو الفاظ سے زیادہ طویل نہیں تھے۔

"البرٹو اور سلویا میاں' بیوی ہیں۔ اور میں چھوٹی سی تھی ناں جب سے یہ دونوں یہ پزیریا چلا رہے ہیں۔" جن معلومات کے حصول میں اسے قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اسے وہ فراہم کررہی تھی۔

اس گلے پڑی مصیبت سے پیچھا چھڑانے کا واحد طریقہ اسے یہ سمجھ میں آیا کہ اپنا پزا کھانا شروع کردے۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اس سے معذرت کرکے یہاں سے اٹھ جائے گا۔ سکندر کو کھانا شروع کرتے دیکھ کر اس نے بھی اپنا ٹھنڈا ہوچکا پزا کھانا شروع کردیا تھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا کہ پزا کھانے پزیریا آئے ہیں۔ آپ کو صحیح معنوں میں اٹالین پزا کا جو مزا ان چھوٹے چھوٹے پزیریا میں ملے گا' وہ بڑے ہوٹلوں میں نہیں مل سکتا۔ رومن پزا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا کرسٹ (crust) بڑا پتلا ہوتا ہے۔ اور اٹالین پنیر کا جو مزا آپ کو اس میں ملے گا' وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اٹلی سے باہر دیگر بیشتر ممالک میں جو پزا لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں' وہ عموماً" پزا کا امریکن ورژن ہوتا ہے۔ ان بے چاروں نے کبھی اصلی اٹالین پزا کا مزا ہی نہیں چکھا ہوتا' اس لیے وہ اسی پر خوش ہوجاتے ہیں۔"

وہ اس طویل گفتگو میں دلچسپی رکھتا بھی ہے یا نہیں' اسے پزا کے اٹالین اور امریکن فرق معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی ہے بھی یا نہیں' اس سے بے نیاز وہ کھاتے ہوئے مسلسل بولنے میں مگن تھی۔ اس کی انگریزی بڑی رواں اور شستہ تھی۔ اس کا لہجہ برٹش تھا۔ مگر پھر بھی اس کی انگریزی میں کہیں کہیں اٹالین تلفظ کی ہلکی سی جھلک محسوس ہورہی تھی۔ وہ پزا کھاتے ہوئے کچھ سوچ کر مسکرائی تھی۔

"اتنی دیر سے آپ کے ساتھ بیٹھی ہوں اور میں نے اپنا تعارف بھی نہیں کروایا۔" وہ جواباً" خاموش رہا۔ پزا کا نوالہ لیتے ہوئے اس نے محض خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں لیزا ہوں۔" وہ اب اس کی طرف ان نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ بھی اپنا تعارف کروائے۔

"سکندر۔"

"ٹورسٹ (سیاح) ہیں؟ روم گھومنے آئے ہیں؟"

"نہیں' آفیشل کام سے۔"

اب قبل اس کے کہ اس کا مزید تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی یہ گفت و شنید جس میں اسے رتی برابر بھی دلچسپی نہ تھی' مزید ذاتیات کی طرف جاتی' وہ اپنے پزا کا آخری لقمہ کھا کر چھری اور کانٹا میز پر رکھتے ہوئے اس سے بولا۔

"آپ کا بہت شکریہ لیزا! آپ نے میری مدد کی۔ اب میں چلتا ہوں' مجھے دیر ہورہی ہے۔"

اس نے زبردستی چہرے پر مروت اور شائستگی کی مسکراہٹ سجائی ——— وہ جواباً" خوش دلی سے مسکرائی تھی۔ اس نے چھری اور کانٹا پلیٹ پر رکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا

"چاؤ (ciao) سکندر۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" سکندر نے اس کا بڑھا ہاتھ مصافحے کے لیے تھام لیا تھا۔

"چاؤ لیزا۔" اس نے بھی اٹالین انداز میں اسے خدا حافظ کہا' چہرے پر خوش اخلاقی والی ہلکی سی مسکراہٹ رکھتے۔

وہ اپنے ہوٹل کی طرف جانے والے راستے پر رواں تھا۔ وہ پتھروں سے بنی کئی سو سال قدیم اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ ارد گرد کئی کئی سو سال پرانی عمارتیں تھیں۔ اس سڑک پر بھی ایک فوارہ تھا۔ ایسا لگتا تھا روم کی ہر سڑک ہر گلی میں ایک فوارہ تھا۔ کئی جگہ یہ محض خوب صورتی کے لیے تھے اور کئی جگہ پانی پینے کے لیے۔

http://www.pakfunplace.com

سولہویں اور سترہویں صدی میں بنائے گئے یہ زیادہ تر اس زمانے میں لوگوں کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

بغیر راستہ بھٹکے وہ اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہوٹل کی بلڈنگ بھی سولہویں صدی میں کسی رومن بادشاہ کے لیے بنایا گیا ایک محل تھی جسے بعد میں نئے سرے سے تعمیر کرکے اس ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ ہوٹل میں تمام تر جدتیں اور جدید ترین سہولیات موجود تھیں مگر اس طرح کہ اس کی اصل شکل اور تاریخی حیثیت بھی برقرار رکھی گئی تھی۔

کھانا وہ کھا کر آچکا تھا۔ اب رات گئے تک اسے خود کو آفس کے کاموں میں مصروف رکھنا تھا۔ اس نے روم سروس کال کرکے اپنے لیے کافی منگوائی تھی۔ اور خود کو کاموں میں غرق کرلیا تھا۔ وہ گزری رات کے خواب کو آج کسی بھی قیمت پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دوپہر سے گھر سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ آج کل via harberini کے پاس ایک ذیلی کئی سو سال قدیم پتھروں سے بنی ایک ذیلی سڑک اور اس سڑک پر موجود سولہویں صدی میں بنائی گئی چند بلڈنگز کو پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اپنا ایزل کینوس، پینٹ اور برش لے کر دن کے ان اوقات میں وہاں لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں ہوا کرتی تھی تب وہاں آجایا کرتی تھی۔ اس نے ہر ہر زاویے سے وہاں کی کئی تصاویر کھینچ رکھی تھیں۔ وہ ان تصاویر کی مدد سے بھی اس جگہ کو پینٹ کرسکتی تھی۔ مگر ایک تو اسے کسی بھی لینڈ اسکیپ کو اس کی اصل جگہ پر موجود رہ کر پینٹ کرنے میں مزا آیا کرتا تھا اور دوسرے اسے اپنے روم کی گلیوں میں وقت گزارنا اچھا لگا کرتا تھا۔ اگلے ماہ کے آخر میں فلورنس میں اس کی پینٹنگز کا سولو شو تھا۔

اس بار اس کا موضوع رومن لینڈ اسکیپ [illegible] لینڈ اسکیپ بھی اسے پینٹ کرنے تھے [illegible] لگ کر اس کو اس پینٹنگ کے خدوخال یہاں کرواضح کرنے تھے۔ باقی پھر نوک پلک سنوارنے کا کام گھر پر اپنے اسٹوڈیو میں کرنا تھا۔ نینی نے اسے بہت تاکید کرکے بھیجا تھا کہ وہ گھر سے بغیر کھانا کھائے جارہی ہے لنچ پینٹنگ شروع کرنے سے پہلے کہیں باہر سے لنچ کرلے۔ مگر کام کی دھن میں اسے کھانے پینے کی خواہش ہوا ہی نہیں کرتی تھی۔ یہاں دوپہر میں دکانیں اور بار بند ہوجاتے تھے اور لوگوں کی آمدورفت بھی قدرے کم ہوجاتی تھی۔ سو یہ وقت اسے پینٹنگ کے لیے اچھا لگا کرتا تھا۔

پانچ بجے کے قریب جب دفاتر کی چھٹی ہونے لگی اور لوگوں کی آمدورفت شروع ہوئی تو اس نے اپنا پورٹیبل ایزل اور دیگر سامان سمیٹ کر گاڑی میں رکھا تھا۔ سال کے ان مہینوں میں جب وہ روم میں ہوتی تھی تب اسے یہاں اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنا اچھا لگا کرتا تھا۔ ان یادوں میں البرٹو اور سلویا کا پزیریا بھی شامل تھا تب ہی وہ اکثر و بیشتر یہاں پزا کھانے چلی آیا کرتی تھی۔ اپنے بچپن میں وہ یہاں کتنا آتی تھی۔ اس نے گاڑی پزیریا کے پاس لاکر روکی تھی۔ وہ اندر آگئی تھی۔

اندر آتے ہی اسے ایک میز پر وہ بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ جس سے وہ کل یہاں پر ملی تھی۔ سکندر جو شاید پاکستانی تھا یا شاید انڈین۔ خاموش خاموش سا اپنے آپ میں گم سا۔

وہ آرٹسٹ تھی اور اسے حسن متاثر کرتا تھا۔ اور وہ شخص مردانہ حسن اور وجاہت کا شاہکار تھا۔ اس کا چھ فٹ سے نکلتا قد، [illegible] چوڑا سینہ، گھنے سیاہ بال جن میں [illegible] اس کی پوری شخصیت اس کے چہرے [illegible] مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ گہری سیاہ آنکھیں [illegible] میں مقناطیسیت تھی ایک حزن تھا، اداسی تھی اور ایک اسرار تھا۔ اس کے ہونٹوں کا کٹاؤ بڑا خوب صورت تھا اس کا نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ سے زیادہ بھرا بھرا تھا اس کی پیشانی بہت چوڑی تھی۔ ناک آریائی نسل کے کسی فرد کی طرح بالکل سیدھی اور لمبی تھی۔ کل اس سے ملنے کے بعد جب اس نے اس کے بارے میں یہ سب سوچا تب خود ہی ہنس بھی پڑی تھی۔ وہ واقعی پکی آرٹسٹ تھی۔ اسے راستے میں ملتے آتے جاتے لوگوں کو بھی بغور ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت تھی۔ گھر جا کر اس کی نینی سے گپ شپ ہوئی پھر سیم کا فون آگیا اور وہ اس غیر معمولی مردانہ حسن و وقار لیے چہرے کو بھول گئی۔ مگر اس وقت اسے دیکھ کر اسے وہ چہرہ پھر سے یاد آگیا تھا۔ کیا خوب ہو اگر وہ اس چہرے کو پینٹ کرسکے۔

وہ خوش دلی سے مسکراتی اس کی میز کے نزدیک آگئی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنا پزا کھانے میں مصروف تھا۔ جلدی جلدی جیسے کھانے کو [illegible] کر رہا ہو۔ بلکہ کوئی ضرورت پوری کر رہا ہو۔ وہ اس کے پاس آگئی تھی۔

"سکندر" اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

"چاؤ (ciao)" جواباً "مسکرایا نہیں تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچانا نہ ہو۔ صرف ایک دن میں تو کوئی کسی کو نہیں بھول سکتا" وہ دل ہی دل میں حیران ہوئی۔

"کیسا اتفاق ہے۔ ہم آج پھر ایک ہی وقت پر یہاں موجود ہیں۔" وہ عادتاً "مسکرا کر بولی۔

وہ ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل سی لڑکی تھی۔

وہ جواباً "اسے خاموش اور اجنبی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

جب اس نے مروتاً" اور اخلاقاً" بھی اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت نہ دی تو کچھ ڈھیٹ بن کر اس نے خود ہی پوچھا۔ کیا واقعی وہ اسے نہیں پہچانا تھا؟ کل وہ اتنی دیر تک ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھ کر پزا کھایا تھا۔ اسے اس کا پزا آرڈر کرنے میں مدد کروانے کے لیے اس نے اپنا پزا ٹھنڈا اسٹک ہوجانے دیا تھا۔

"یہاں کئی اور میزیں خالی ہیں، آپ وہاں بیٹھ جائیں۔" وہ سنجیدگی سے اسے کھرا صاف انکار کرکے دوبارہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگا تھا۔

اس کا لہجہ یا الفاظ بدتمیزی والے نہیں تھے مگر سرد خشک اور بے لچک ضرور تھے۔ وہ اس کی وہاں موجودگی سے بے نیاز سر جھکا کر دوبارہ کھانا کھا رہا تھا۔ اپنی اس [illegible] انوکھی پر اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے [illegible] ہوتے وہ ایک دم ہی خاموشی سے اس کی میز کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ شرمندگی اور غصہ محسوس کرتی وہ کاؤنٹر پر آکر البرٹو سے بات کرنے لگی تھی۔

البرٹو کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیسا پزا چاہیے۔ وہ یہاں آکر ہمیشہ ایک ہی طرح کا پزا کھایا کرتی تھی۔ البرٹو سے ہائے ہیلو اور خیر و عافیت دریافت کرتے اس نے مڑ کر دیکھا تو جس میز پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اب خالی تھی۔ وہ اپنا کھانا ختم کرکے وہاں سے جا چکا تھا۔

وہ اس کی بداخلاقی اور بدتہذیبی پر حیران تھی۔ لگتا تو اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ پھر اس درجہ بدتہذیبی؟ وہ حیران بھی ہوئی تھی اور اس کا موڈ بھی خراب ہوا تھا۔ یہ خراب موڈ اس وقت مزید خراب ہوگیا تھا جب گھر آتے ہی اس نے وڈوریا کی کال ریسیو کی۔ اپنی ماں سے بات کرنا اس کے لیے کبھی بھی خوش گوار ثابت نہیں ہوا کرتا تھا۔ سو ایسا ہی آج بھی تھا۔ پہلے منٹ اس کی خیریت پوچھنے اور اس سے محبت کا اظہار کرنے کے بعد اگلے منٹ وہ اپنے اصل مقصد اور کام کی بات پر آگئی تھیں۔

"میں rehab centre (بحالی صحت سینٹر) سے آگئی ہوں۔ اب اپنی ساری زندگی الکحل کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ مجھے کچھ پیسے چاہئیں لیزا۔ جیسے ہی مجھے جاب ملے گی میں تمہارے پیسے واپس کردوں گی۔"

اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آئی تھی۔ محبت میں 'پیار میں' یاد آنے پر وہ کبھی بھی یاد نہیں کی جاتی تھی۔ جب پیسوں کی ضرورت پیش آتی تھی تب یاد آیا کرتی تھی۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اس کی ماں کی اپنے چوتھے شوہر سے بھی گزشتہ سال طلاق ہوچکی

http://www.pakfunplace.com

تھی۔ اور اس درجہ شراب نوشی ہی کے سبب آئے دن
ان کی ملازمت ختم ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلے پانچ سالوں
میں وہ پانچ ہی مرتبہ علاج کے لیے جاچکی تھیں۔ ہر بار
وہاں سے واپس آکر اس عہد کو دہراتی تھیں کہ اب
شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گی مگر چند ہفتے بھی نہیں
گزر پاتے تھے انہیں اپنے عہد پر قائم رہتے۔

اسے وکٹوریا سے کوئی تلخ یا کڑوی بات کرنا بے معنی
محسوس ہوا تھا۔ لڑا تو وہاں جاتا ہے جہاں کچھ امیدیں
ہوتی ہیں، محبتیں ہوتی ہیں۔ اس کا اپنی ماں سے بھی
ماں اور بیٹی والا تعلق رہا ہی نہیں تھا۔ جب اس کے پاپا
سے انہوں نے طلاق نہیں لی تھی، جب وہ سب ایک
ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ تو تب بھی کبھی اسے اپنی ماں
نہیں لگی تھیں۔

"میں پیسے بھجوادوں گی۔"

وکٹوریا میلان MILAN میں رہتی تھیں اور سال
کے جن مہینوں میں ان کے پاس نوکری نہیں ہوتی تھی
تب وہ اس سے اسی طرح فون پر رابطہ کیا کرتی تھیں۔
اسے غصہ بھی تھا، وہ دکھی بھی تھی مگر اس نے کل ہی
آن لائن اپنی ماں کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلوادیے تھے۔

"ممی! مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں کھانا نہیں
کھاؤں گی۔"

وہ کچن میں ڈنر کی تیاری کرتی ممی کو اطلاع دیتی اور
اپنے اسٹوڈیو میں آگئی تھی۔ وہ اداس تھی۔ بچپن کی
بہت سی محرومیاں تازہ ہو گئی تھیں۔ وہ بے دلی سے کینوس
پر رنگ بکھیر رہی تھی تب ہی فون کی بیل بجی تھی۔

"سیم" کال کرنے والے کا نام دیکھتے ہی اس کی
اداسی ایک لمحے میں دور ہو گئی تھی۔ اس نے لپک کر
کال ریسیو کی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے سیم! کہ اس وقت
مجھے تمہاری ضرورت ہے؟" اس کے لہجے میں بہن
کے لیے والہانہ محبت اور شدتیں تھیں۔

"میرا دل مجھے بتاتا ہے۔" وہ جواباً کھلکھلائی
تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سیم کی کھلکھلاتی زندگی
سے بھرپور آواز سن رہی تھی۔

اس سے اگر کوئی سچا پیار کرتا تھا، کسی کو اگر اس کی
پروا تھی تو وہ صرف اور صرف سیم تھی۔ کہنے کو وہ اس
سے صرف ایک سال بڑی تھی مگر اس کی یوں پروا کرتی،
یوں اس کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی
ہو۔ بچپن میں جب ان دونوں، جنہوں نے ماں اور باپ
دونوں کی جانب سے عدم توجہ کا دکھ سہا تھا، تب اس کی
پروا کرتی، اس سے بے تحاشا محبت کرتی سیم بہن اور
دوست ہونے کے ساتھ ساتھ جیسے اس کی ماں اور باپ
بھی بن گئی تھی۔ جیسے ماں باپ اپنے بچوں کی پروا کرتے
ہیں ایسے وہ اس کی پروا کیا کرتی تھی۔

"کیسی گزر رہی ہیں تمہاری چھٹیاں؟" سیم نے
اس سے پوچھا۔

"مزے میں۔ سیم تم بھی آجاؤ روما۔" دیگر تمام
اطالویوں کی طرح وہ بھی روم کو روما کہا کرتی تھی۔ اور
اپنے روما سے اسے عشق تھا۔

"ابھی تو میں آفس کے کام سے ترکی جارہی ہوں
لز۔ اگر کام جلدی ختم ہو گیا تو آجاؤں گی تمہارے
پاس۔"

سیم نے عادت کے مطابق اسے اس کے نک نیم
سے پکارا۔ یہ نک نیم اسے دیا بھی اسی نے تھا اور اس
سے پکارا بھی وہی کرتی تھی۔ اس نے سیم کو ماں کے
فون کی بابت بتایا۔ سیم اس کے مقابلے میں بہت
مضبوط اور بہادر تھی۔ وہ اب بھی بردباری اور پیار سے
سمجھا رہی تھی۔

"کیوں ممی پاپا کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا دل
دکھاتی ہو لز؟ وہ دونوں جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔
ممی کو پیسے بھجوادو اور بیٹھ کر یہ سوچنا اور دل جلانا چھوڑ دو کہ
وہ ایسی کیوں ہیں۔ تم روما اپنی چھٹیاں انجوائے کرنے
آئی ہو۔ خوب انجوائے کرو۔ اور اب مجھے یہ بتاؤ کہ
تمہاری نئی پینٹنگز مکمل ہو گئیں؟"

سیم نے اس کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے فوراً ہی
گفتگو کا موضوع اس کی سولو ایگزیبیشن کی طرف موڑ دیا
تھا۔ سیم سے اس پورے ایک گھنٹے بات ہوتی رہی
تھی۔ اور ایک گھنٹے بعد جب وہ فون بند کر رہی تھی تب

اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ گھنٹہ بھر پہلے وہ کس بات
سے اداس اور دکھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

آفس میں وہ اور روبرٹو ساتھ بیٹھے ایک کانٹریکٹ پر
نظر ثانی کر رہے تھے۔ روبرٹو بھی اسی کی طرح ان کی
کمپنی میں ایک لیگل ایڈوائزر تھا۔ جنوبی یورپ میں
ان کی کمپنی کی جو لیگل ٹیم کام کر رہی تھی وہ اس کا ایک
ذہین وکیل۔

وہ دونوں انتہائی سنجیدگی سے آفس میں پیشہ ورانہ
گفتگو کر رہے تھے جب روبرٹو کے آفس کے
دروازے پر ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ اس آفس
میں اپنے عارضی قیام کے دوران اسے ایک علیحدہ
کیبن فراہم کیا گیا تھا مگر کسی نہ کسی ڈسکشن یا میٹنگ
کے باعث اس کا زیادہ وقت روبرٹو کے آفس ہی میں
گزرتا تھا۔

اس نے اور روبرٹو دونوں نے "buon giorno"
کہتی اس خوب صورت نسوانی آواز کی طرف
نظریں گھما کر دیکھا۔ انہیں صبح اور دن کے وقت کا
اٹالین میں سلام کرتی لڑکی کوئی اور نہیں اسے پریا
میں ملی لڑکی ہی تھی۔ کیا روم اتنا چھوٹا شہر تھا جہاں یہ
لڑکی اسے بلاوجہ بار بار ٹکرا رہی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ہی چڑا۔ وہ زبردستی بے
تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھی اور یہ چیز اسے اس
لڑکی سے چڑا رہی تھی۔

"چاؤ لیزا۔" روبرٹو گرم جوشی سے مسکراتا ہوا اپنی
کرسی سے اٹھا تھا۔ وہ انتہائی پرتپاک اور دوستانہ انداز
میں اس کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

"میں اندر آجاؤں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آؤ بیٹھو۔"

سکندر نے ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد فوراً ہی
کانٹریکٹ کے صفحات اپنے سامنے کر لیے تھے۔ وہ
سنجیدگی سے ان کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔ مگر وہ محسوس
کر رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئی ہے۔

"اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کہیں تم بزی نہ
ہو۔" لیزا روبرٹو کو جواب دیتی سکندر کے برابر رکھی
کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ روبرٹو اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ
دونوں اٹالین میں بات کر رہے تھے اور اسے سلام سے
آگے ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھ میں
نہیں آیا تھا۔ ہاں یہ ضرور پتا چل رہا تھا کہ وہ دونوں
آپس میں بے تکلف ہیں۔ غالباً دوست ہیں۔

"ہائے۔" چونکہ اس بار اسے مخاطب کیا گیا تھا اس
لیے اسے کانٹریکٹ پر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا
پڑا۔

"ہائے۔" وہ جواباً سنجیدگی سے بولا۔

"آپ نے پہچانا مجھے؟" وہ اس سے انگریزی میں
مخاطب تھی۔ یہ سوال اس نے بظاہر مسکرا کر پوچھا
تھا۔ مگر وہ جانتا تھا وہ اس روز پریا میں اس کے اسے نہ
پہچاننے کا تاثر دینے کا قدرے جتانے والے انداز میں
حوالہ دے رہی تھی۔

"جی۔ آپ لیزا ہیں۔ آپ نے پریا میں مجھے پزا
آرڈر کرنے میں مدد کی تھی۔" وہ چہرے پر بغیر شرمندگی
کا کوئی تاثر لائے اسی سنجیدگی سے بولا۔

"میں آپ کو یاد ہوں؟ میں سمجھ رہی تھی شاید آپ
مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔" وہ پھر مسکرا کر در پردہ طنز
کر رہی تھی۔

روبرٹو جو ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، فوراً مسکرا
کر بولا تھا۔

"آپ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں
یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یعنی میں تعارف کروانے
والی فارمیلٹی سے بچ گیا۔"

لیزا اس کی بات پر مسکرائی۔ بلاوجہ اور بات بے
بات مسکراتے رہنے سے یہ لڑکی تھکتی نہیں تھی؟ اس
نے کوفت سے سوچا۔ روبرٹو اب اس سے مخاطب تھا۔

"اس تعارف میں بس یہ اضافہ کر لو سکندر کہ لیزا
میری بچپن کی دوست ہے۔ ویسے میں اس سے چار
سال بڑا ہوں۔ ہم اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میں
اسکول میں اس سے سینئر تھا مگر ہماری دوستی بہت

http://www.pakfunplace.com

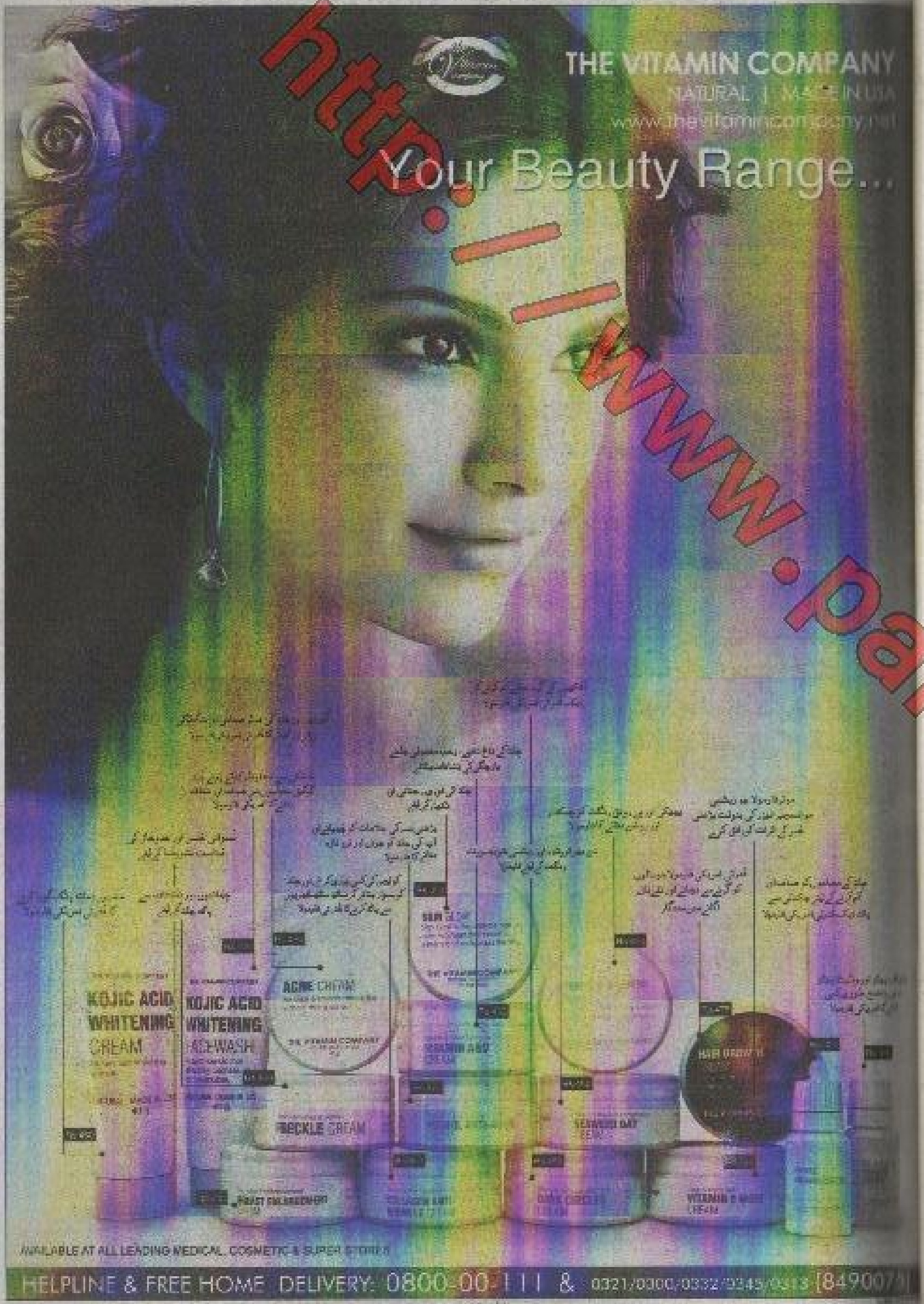

تھی۔" اب اس کی وجہ سے کمرے میں انگریزی بولی جا رہی تھی۔

"بہت سے لوگ تو اس غلط فہمی تک میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم بوائے فرینڈ گرل فرینڈ ہیں۔"

لیزا ہنس کر روبرٹو اور اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ روبرٹو اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"اور ہم دونوں لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بجائے اس پر خوب ہنسا کرتے تھے۔"

وہ سکندر کو بتا رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص پُرتکلف انداز میں بہت ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ شائستگی اور مروت کا مظاہرہ کرتا ہوا۔

"میرا تعارف تو پورا ہو گیا۔ اب تم سکندر صاحب کا بھی مکمل تعارف کروا دو۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کا نام سکندر ہے' یہ اپنے کسی آفیشل کام سے روما میں ہیں اور انہیں ویجز اور مشروم والا پیزا پسند ہے۔"

اس لڑکی کی نان سیریس باتیں اور بلاوجہ فری ہونا اسے کس قدر برا لگ رہا ہے۔ کاش روبرٹو یہاں نہ ہوتا تو وہ اسے بتاتا۔

"سکندر روما میں ہماری کمپنی کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ بہت ہی قابل اور ذہین لائر ہیں۔ آفس ہی کے کام سے وہ تین ہفتوں کے لیے روم میں ہیں۔" روبرٹو لیزا کو بتانے لگا۔ اب اس وقت کانٹریکٹ کا کچھ کام تو ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ روبرٹو سے معذرت کرکے اپنے کیبن میں چلا جائے' ان دو دوستوں کو گفتگو کرتا چھوڑ کر کہ لیزا روبرٹو سے انگریزی ہی میں بولی۔

"میٹنگ میں ابھی دیر ہے۔ میں کچھ جلدی آگئی۔ میں نے سوچا میں پہلی مرتبہ تمہارے آفس آئی ہوں۔ تم یقیناً" مجھے اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دو گے۔"

وہ مسکرا کر بے تکلفی سے بولی تھی۔ روبرٹو پھر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"سب بدل سکتے ہیں' تم نہیں بدلو گی۔" لیزا سے کہنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"لنچ ٹائم تو ہو ہی گیا ہے۔ چلو سکندر' انہیں باہر چل کر لنچ کرتے ہیں ہم تینوں۔"

روبرٹو نے اسے بھی لنچ کی دعوت دی تھی۔ اسے اپنا پروفیشنل' سنجیدہ اور لیا دیا انداز برقرار رکھنا تھا وہ انکار کرکے بچکانہ پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں یہ تاثر لیں کہ وہ لیزا کو قصداً" اگنور کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے انکار کر رہا ہے۔

"اوکے چلو۔" اس نے سنجیدگی سے چلنے کی ہامی بھری تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس سے قریب ہی ایک ریسٹورنٹ میں وہ تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ان کا لنچ سرو نہیں کیا گیا تھا۔ ویٹر نے سب سے پہلے ایک باسکٹ جس میں کئی طرح کے رولز رکھے ہوئے تھے اور ایک باؤل جس میں اولیو آئل تھا ان کی میز پر لا کر رکھا۔

وہ دو اٹالین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ اٹلی کے لوگ اپنے کھانے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔ لیزا اور روبرٹو نے اپنی اپنی پلیٹوں میں ایک ایک رول اٹھا کر رکھا تھا۔ وہ رول اپنے ہاتھوں سے توڑ توڑ کر اولیو آئل میں ڈبو رہے تھے اور اسے مزے لے کر کھا رہے تھے۔ اب جبکہ وہ آ ہی گیا تو ان کے کھانوں کے طور طریقوں کا ساتھ دینے کے لیے چند لوالے رول کے اس نے بھی اولیو آئل میں ڈبو کر کھا لیے تھے۔

اسی دوران ان کا آرڈر کردہ کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔ وہ فرائیڈ مشروم اور پاستا کھا رہا تھا۔

لیزا کے اس نان سیریس سے (attitude) پر نہ جائیے' یہ بہت سنجیدہ قسم کی آرٹسٹ ہے۔ اور خاصی مشہور بھی۔"

روبرٹو لیزا کی طرف دیکھ کر سکندر سے ہنستے ہوئے بولا۔ وہ اسے اس کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ بتا رہا تھا کہ گزشتہ دنوں ان لوگوں نے اپنے آفس کا

انٹیریر دوبارہ کروایا ہے۔ اس نئے انٹیریر میں بورڈ روم اور ریسپشن ایریا کی دیواروں پر چند پینٹنگز کا بھی اضافہ کیا جانا ہے تاکہ ایک اچھا آرٹسٹک لک بن سکے۔ اس مقصد کے لیے کسی اچھے آرٹسٹ سے ان کی کمپنی کو رابطہ کرنا تھا اور روبرٹو کے مشورے پر انہوں نے لیزا سے رابطہ کیا ہے۔ آج اسی حوالے سے لیزا کی ان کی کمپنی کے کچھ سینئر ایگزیکٹیوز کے ساتھ میٹنگ ہے' جس میں ان پینٹنگز کا موضوع اور معاوضہ طے کیا جانا تھا جو لیزا انہیں بنا کر دے گی۔

"دیکھو پتا نہیں یہ ہم سے اپنی صرف ایک پینٹنگ کے لیے کیا ڈیمانڈ کرتی ہے۔" لیزا جوابا" ہنسی تھی۔

"اب مہنگی آرٹسٹ کے نخرے تو ہوں گے نا؟" روبرٹو کو جواب دینے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"تمہیں آرٹ میں انٹرسٹ (دلچسپی) ہے؟"

اس بار اس کے لہجے اور الفاظ میں نمایاں بے تکلفی تھی۔ اس نے جیسے از خود ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ اگر وہ اس کے بچپن کے دوست کا کولیگ نکل آیا ہے تو وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر بات چیت کر سکتی ہے۔

"نہیں۔ مجھے بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔"

فورک سے پاستا کھاتے ہوئے اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا تھا' پتا نہیں کیوں۔

"تم Destiny (تقدیر) پر یقین رکھتے ہو سکندر؟"

کچھ دیر کے بعد روبرٹو سے بات کرتے کرتے لیزا نے اچانک اس سے پوچھا تھا۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اسے اس کا دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں بات کرنا گراں گزر رہا تھا۔ مگر وہ اس کا اظہار اپنے چہرے سے ہونے نہیں دے رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے پہلے پزیریا اور اب روبرٹو کا آفس' یہ تقدیر ہی ہے نا جو ہم بار بار کہیں نہ کہیں مل رہے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں شاید۔" اس نے شانے اچکا کر بے نیازی سے مبہم انداز میں کہا۔ چونکہ انہیں آفس جلدی واپس پہنچنا تھا' اس لیے بقول روبرٹو کے وہ لوگ لنچ جلدی ختم کر کے اٹھ رہے تھے۔ اپنے حساب سے اس نے لنچ کرنے میں ایک گھنٹہ ضائع کر دیا تھا۔ جبکہ کھانا دس سے پندرہ منٹ کے اندر کھا لیے جانے والی چیز تھی۔

روبرٹو ہنستے ہوئے اسے بتا رہا تھا' آفس ٹائمنگ کے دوران بھی ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا لنچ اٹالینز کے لیے بڑی عام سی بات تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ سے اٹھ رہے تھے جب لیزا نے اسے اپنا فون نمبر دیا۔

"کیا پتا کبھی تمہیں آرٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی پینٹنگ بنوانا چاہو۔" وہ بلاوجہ۔ بے تکلف ہوتی مسکرا کر بولی تھی۔

"یا قسمت تم دونوں کو ملوانا چھوڑ دے اور تم لیزا سے ملنا چاہو۔" روبرٹو مسکرا کر بولا تھا۔ وہ لیزا کو چھیڑ رہا تھا۔

لیزا ہنسی تھی۔ "ہاں بالکل۔"

وہ تینوں آفس آ گئے تھے۔ لیزا اپنی میٹنگ کے لیے چلی گئی تھی' جبکہ وہ آتے کے ساتھ ہی اپنے کیبن میں آ گیا تھا۔ اس طویل لنچ میں اچھا خاصا وقت برباد ہو گیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے فورا" اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔"

اگلے روز وہ اور روبرٹو کینٹین میں ساتھ بیٹھے تھے۔ کام کے دوران چائے کافی کے لیے وقفہ کیا گیا تب کافی کے گھونٹ لیتا روبرٹو اپنی بیوی اور بچے کی بات کرتے کرتے یک دم لیزا کے بارے میں بات کرنے لگا۔ یا وہ خود ہی سنا رہا تھا کہ یا پھر اس کا ذکر ہونا رہے گا۔ ایسے جیسے جانتا نہیں وہ کتنی اہم شخصیت ہے۔ اس نے دل میں بے زاری اور کوفت محسوس کی' پر چہرے پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"لیسے بڑی لاابالی' لاپروا اور غیر سنجیدہ سی لگتی ہے' مگر وہ دوسروں کی بہت پروا کرنے والی بڑی پیاری لڑکی ہے۔ پتا ہے سکندر لاسٹ ایئر جب میری بیوی پریگننٹ تھی' ڈلیوری کا ٹائم بالکل قریب تھا' تب اچانک ہی مجھے آفس کے کام سے تین' چار دنوں کے لیے اسپین جانا پڑ گیا تھا۔ میں اپنی بیوی کے لیے فکر مند تھا۔ میں اس کی ماں اور بہن سے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گیا تھا۔ لیزا ان دنوں چھٹیوں میں روم آئی ہوئی تھی۔ جانتے ہو' جس روز میری بیوی کو اسپتال جانے کی ضرورت پڑی تب اس کی ماں اور بہن سے بھی پہلے لیزا اس کے پاس پہنچی تھی۔ وہ اسے اسپتال لے کر گئی تھی۔"

اس قصے میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں' مگر جب اسے اس قصے ہی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تو سمجھنے کی ضرورت بھی کہاں تھی۔ اس نے محض سر ہلا کر یہ تاثر دیا تھا کہ اس نے روبرٹو کی لیزا کے متعلق ساری بات سنی ہے۔

☆ ☆ ☆

اسے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ چلا رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اسے اندھیرے سے نکلنا تھا۔ کوئی کیوں نہیں آ رہا اسے اندھیرے سے نکالنے' وہ مدد کے لیے چلا رہا' بری طرح رو رہا تھا۔ اسے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہاں کوئی تھا جو اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس پر قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔

وہ بے چینی اور اضطراب میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ پورا کا پورا پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سوتے میں کہیں چلے جانے' کہیں بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لبوں سے بہت ہلکی ہلکی بچاؤ' بچاؤ اور ہیلپ' ہیلپ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ بے چینی سے ہاتھ پاؤں چلاتے اس نے یک دم ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سکندر! میں چاہتا ہوں تم ہارورڈ میں ایڈمیشن لو۔" کھانے کی میز پر وہ چاروں موجود تھے۔ شہریار خان سکندر سے مخاطب تھے۔

"ہارورڈ سے گریجویشن کے بعد پھر وہیں سے لاء پڑھو۔"

"جی پاپا۔" وہ مؤدب بنا جوابا" گردن ہاں میں ہلا کر بولا تھا۔

زین نے اسے بغور دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی فرماں برداری اور سعادت مندی والی اس اداکاری سے نفرت تھی۔ پاپا کے سامنے اتنا اچھا بن کر آخر وہ خود کو کیا ثابت کرنا چاہتا تھا؟ ان کی امی جان' شہریار خان کے آگے مختلف ڈشز رکھ رہی تھیں۔ وہ اسی طرح شوہر کی خدمت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ شہریار خان اس گھر کے حاکم اعلا تھے۔ جو وہ پسند کرتے تھے وہ یہاں ہوا کرتا تھا جو ناپسند کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی وہ کر سکتا۔ بے کار سی امید تھی' پھر بھی وہ امید سے باپ کی طرف دیکھتا رہا شاید ابھی وہ اس کے بارے میں بھی اپنی کسی خواہش کا اظہار کریں۔ "زین میں چاہتا ہوں تم پڑھو زین تم فلاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا۔" مگر اس کی حسرت حسرت ہی رہی تھی۔ سکندر' شہریار کے آگے انہیں وہ نہ کبھی نظر آیا تھا' نہ ہی آ سکتا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سکندر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ اس کے کیریئر' پروفیشن اور مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کیا کیا پلان کر رکھا ہے' وہ یہ سب کچھ سکندر کو بتا رہے تھے اور وہ۔ جی پاپا' اچھا پاپا اور او کے پاپا کہتا ان کے ہر پلان سے اتفاق کر رہا تھا۔

سکندر کی تمام تر کیریئر پلاننگ شہریار خان نے کر رکھی تھی' جبکہ زین شہریار کے لیے ان کی کوئی کیریئر پلاننگ نہ تھی۔ وہ جہاں پر بھی پڑھنا چاہے اور جو کچھ بھی پڑھنا چاہے' انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ وہ پیسہ اس پر بھی خرچ کریں گے مگر اس کے لیے ان کے اس طرح کے کوئی خواب نہ تھے جیسے سکندر کے لیے اور ان کے گھر کی اس ugly duckling نے ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دے دینا تھا جو وہ اس سے امیدیں اور آس باندھتے۔ ان کی امیدوں کا مرکز تو ان

http://www.pakfunplace.com

کا اٹھارہ سالہ ولی عہد شہزادہ سکندر شہریار تھا۔ وہ اپنے اندر بہت سی کڑواہٹ محسوس کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد کمرے میں آگیا تھا۔ عجیب سی ایک سوچ اس کے اندر آئی تھی۔ کاش ایسا ہو سکندر کا ہارورڈ میں داخلہ نہ ہو سکے۔ گو ناممکن سی بات تھی' پھر بھی وہ سوچ رہا تھا سکندر ہمیشہ ہی تو فاتح عالم نہیں ہوا کرتا۔ سکندر بھی ہار بھی تو جاتا ہے' تو اب کی بار کیوں نہیں؟

☼ ☼ ☼

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں تمام افراد غیر معمولی تھے۔ high achievers تھے۔ اس کے دادا' اس کے پاپا' اس کا بھائی۔ اس کے پاپا بڑے فخریہ انداز میں اپنے والد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں کیمبرج پڑھنے گئے تھے' جب کسی کا بچہ اگر میٹرک پاس کر لیا کرتا تھا تو ماں' باپ کے خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ کیمبرج میں پڑھ کر آئے تھے بلکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ذہانت و قابلیت کا سکہ جما کر آئے تھے۔ پھر اس کے پاپا جو ہارورڈ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ وہاں کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ اس کے پاپا ایک مغرور آدمی تھے۔ ایسے ویسے لوگ اور ایسی ویسی کارکردگی تو ان کی نگاہ میں جچ ہی نہ سکتی تھی۔ وہ اپنے لوگے خاندان' اعلا نسب اور اپنی خاندانی ذہانت و قابلیت پر فخر کیا کرتے تھے۔

"پیسہ تو بہت لوگ کما لیتے ہیں۔ پیسہ ہونا خوبی کی بات نہیں' خوبی کی بات تو آپ کا اعلا نسب اور اعلا علمی و تعلیمی قابلیت کا ہونا ہے۔ ان دو چیزوں کے ساتھ آپ نے پیسہ بھی کما لیا ہو تو یہ اصل فخر کی بات ہے۔" اس نے بچپن سے اپنے پاپا کے منہ سے یہ ہی جملے سنے تھے۔

مگر دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے معیار کے مطابق ذہین و قابل نہ تھا۔ وہ غیر معمولی قابلیت' ذہانت اور مثالی وجاہت کی حامل اپنی فیملی میں شاید بدصورت ہی ٹھہرتا۔

اس کے والد ایک بے تحاشا ہینڈسم آدمی تھے۔ ایک بھرپور مردانہ و رعب دار شخصیت کے حامل' مضبوط جسم' لمبا قد' چوڑا سینہ' چہرے پر گھنی مونچھیں' گہری سیاہ آنکھیں جن میں خوب صورتی اور ذہانت دونوں چھلکتی تھیں۔ لمبی مغرورت سی ناک' کشادہ پیشانی۔ وہ چلتے تو یوں لگتا کسی ریاست کا حاکم چلا آرہا ہے۔ بولتے تو ان کی شخصیت کے رعب' بھاری مردانہ آواز اور جاہ و جلال کے آگے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جایا کرتا۔

وہ زندگی میں ہر جگہ' ہر میدان میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ ورلڈ بینک میں ایک انتہائی اونچی اور اہم پوسٹ پر جاب کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں پاکستان میں اپنے خاندانی بزنس کو سنبھالنا تھا' جسے ابھی اس کے دادا سنبھال رہے تھے۔

شہریار خان کی ملازمت کے سبب وہ لوگ واشنگٹن میں رہتے تھے۔ ان کی فیملی چار افراد پر مشتمل تھی۔ شہریار خان' ان کی ماں جنہیں وہ بھائی امو جان بلایا کرتے تھے اور وہ دونوں بھائی۔

ان کی ماں ایک بڑی ہی نرم خو اور مہربان خاتون تھیں۔ دھیمے سروں میں بولنے والی' ہر ایک سے ہمدردی کرنے والی' اپنے بچوں اور شوہر پر جان چھڑکنے والی' وہ اعلا تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھیں۔ مگر شادی کے بعد شہریار خان کے کہنے پر انہوں نے شوہر اور پھر بعد میں بچوں کی خاطر اپنے کیریئر اور پروفیشن کی قربانی دے دی اور پوری طرح اپنے گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ شہریار خان کا جس طرح کا مزاج تھا' وہ جس طرح اپنی بات منوانے کے عادی تھے' جس طرح کی حاکمانہ ان کی طبیعت تھی' ایسے مزاج کے حامل شخص کے ساتھ گزارا کرنا ان کی امو جان ہی کا وصف تھا۔ وہ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور شوہر کی ہر بات کو حکم کا درجہ دینے والی خاتون تھیں۔ ان کے شوہر نے کہہ دیا ہے بس ان کے لیے حکم ہو گیا ہے۔ وہ شکل و صورت میں اپنی ماں پر تھا اور ان کی ماں ایک خوب صورت خاتون تھیں' سو وہ بھی خوب صورت تھا مگر اس کا قد کاٹھ اپنے باپ جیسا نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں سے وہ رعب اور ذہانت نہیں جھلکتی تھی جو اس کے باپ کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت میں وہ Charisma (سحر) نہیں تھا جو اس کے باپ کی شخصیت میں تھا۔ یہ سب اگر کسی میں تھا تو صرف اور صرف سکندر شہریار میں۔ اسے اپنے بھائی کے ساتھ نہ دیکھا جاتا تو وہ ایک خوش شکل ہینڈسم اور چارمنگ لڑکا تھا مگر جہاں وہ دونوں بھائی ساتھ ہوتے' وہ پس منظر میں چلا جایا کرتا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سکندر شہریار اور زین شہریار ایک ساتھ کسی جگہ پر ہوں اور دیکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ بہت بچپن میں وہ اس چیز کو زیادہ محسوس نہیں کیا کرتا تھا' تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاپا سکندر کو اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ان دونوں بھائیوں کی عمروں میں دس ماہ کا فرق تھا۔ وہ سکندر سے دس ماہ چھوٹا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سکندر سے دنیا میں آنے میں دس ماہ پیچھے نہیں' بلکہ اسے زندگی بھر ہر میدان میں سکندر سے چند قدم پیچھے رہنا تھا۔ جب وہ دونوں بھائی چھوٹے تھے وہ تب بھی محسوس کرتا تھا کہ پاپا کے لیے جو اہمیت سکندر کی ہے' وہ اس کی نہیں ہے۔ وہ سکندر کو اس سے زیادہ اس لیے اہمیت دیتے ہیں کیونکہ سکندر ان کے جیسا ہے۔ سکندر بچپن کی بچگانہ باتوں میں بھی ذہانت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا کرتا تھا۔

زین نے ریموٹ کنٹرول والی گاڑی کھلونے کی دکان پر پسند کی تھی اور سکندر نے اسکریبل۔ شہریار خان تو بڑے بیٹے کی اس ادا پر نہال ہی ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اسے تو محض ریموٹ کنٹرول والی کار ہی دلوائی تھی' جبکہ سکندر کو اسکریبل کے ساتھ ریموٹ کنٹرول والی کار' ایروپلین اور کھلونوں کی اسپورٹس کارز کا ایک پورا سیٹ بھی دلوایا تھا۔

اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ اسے دکھ ہوا تھا' وہ گھر آکر اپنی کار سے کھیلا بھی نہیں تھا۔ شام میں سکندر اپنے کھلونے لے کر اس کے پاس آگیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ شہریار خان نے بہرحال جو چیزیں لے کر دی تھیں' صرف سکندر کو دلائی ہوئی تھیں' سکندر اس کے ساتھ شیئر کیا کرتا تھا۔ سکندر اس سے پیار کرتا تھا۔

وہ بھی اس کے ساتھ کھیل لیا کرتا اور کبھی اگر شہریار خان کے جانب دارانہ رویے پر اس کا دل زیادہ دکھا ہوتا تو بدتمیزی سے اسے اپنے کمرے ہی سے نکال دیا کرتا تھا۔ عجیب سا رشتہ تھا اس کا اپنے بھائی کے ساتھ۔ کبھی اسے اس پر پیار آتا' اس کے ساتھ کھیلنے کو جی چاہتا اور کبھی کبھی وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن' سب سے بڑا حریف نظر آتا' پھر اسے سکندر سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ اپنے پاپا کی نگاہوں میں کبھی بھی اہمیت اس لیے نہیں پا سکتا کہ اس کے مدمقابل ہر جگہ پر سکندر موجود تھا۔

سکندر ہر سال اسکول میں ٹاپ کرتا تھا اور وہ اپنی کلاس میں سیکنڈ' تھرڈ پوزیشن لیا کرتا تھا۔ اسکول ایک ہی تھا تو رزلٹ بھی ایک ہی دن ہوا کرتا تھا۔ اس کی رپورٹ کارڈ پر ایک افسوس بھری نگاہ ڈالنے کے بعد شہریار خان کی توجہ کا اصل مرکز سکندر ہوا کرتا تھا۔

وہ سکندر کو ہرانے کے لیے ہر سال گزشتہ سال سے زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ عجیب سی ایک ریس لگی تھی۔ ایک غیر اعلانیہ مقابلہ تھا جو اس کا اپنے بھائی سے تھا۔ وہ سکندر سے آگے نکل سکے' اس سے زیادہ اچھے مارکس لا سکے' مگر تمام تر کوششوں کے باوجود وہ سکندر سے پیچھے ہی رہتا۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس کے مارکس تو زیادہ ہوتے' مگر کہیں نہ کہیں وہ سکندر سے پھر پیچھے ہی ہوتا۔

وہ مڈل اسکول میں تھا۔ مڈل اسکول میں یہ اس کا آخری سال تھا' جبکہ سکندر اس سے ایک کلاس آگے ہونے کے سبب مڈل اسکول سے نکل چکا تھا۔ اس سال اس نے بے تحاشا محنت کی تھی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھتا تھا' یہاں تک کہ بعض دفعہ تو امو جان نے اسے اتنا پڑھتے دیکھ کر آرام کرنے اور پڑھائی کو اتنا

http://www.pakfunplace.com

سر پر سوار نہ کرنے تک کی تاکید کی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ اسے اس بار سکندر سے اگر آگے نہیں نکلنا تھا تو کم ازکم اس کے برابر تو آنا تھا۔ اسے تو کر کے دکھانا ہے جو سکندر کر کے دکھا چکا ہے اور پھر جب ان کا رزلٹ آیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی تھی، بلکہ پورے مڈل اسکول میں بھی اس نے ٹاپ کیا تھا۔

سکندر اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

"مجھے پتا تھا زین! اس بار تمہیں ایسا ہی کوئی کارنامہ کرنا ہے۔ پڑھائی بھی تو کتنی کی تھی تم نے۔"

اسے لگا تھا سکندر اس سے جلے گا، ناخوش ہوگا، مگر ایسا نہ ہوا تھا۔ شاید یہ مقابلہ بازی یک طرفہ تھی یا شاید سکندر اسے اس قابل ہی نہ سمجھتا تھا کہ اس سے مقابلہ کرتا۔ اس نے جل کر سوچا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں اپنا رزلٹ باپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے امید تھی آج وہ باپ پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائے گا کہ وہ سکندر شہریار سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ اس قابل ترین خاندان میں وہ کسی سے کم نہیں۔

"گڈ۔ ویل ڈن زین۔ اچھی کوشش کی ہے تم نے۔ اس کا مطلب ہے اگر تم کوشش کرو تو اس سے بھی بہتر رزلٹ لاسکتے ہو۔ اوور آل 88 پرسنٹیج ہے نا تمہاری۔ لاسٹ ایئر سکندر نے مڈل اسکول میں ٹاپ کیا تھا تو اس کی 92 پرسنٹیج تھی۔ تم بھی اگر اور محنت کرو تو اتنی اچھی پرسنٹیج لاسکتے ہو۔"

باپ کے ان ریمارکس پر اس کی ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ وہ کتنی بھی کوشش کرلے، کتنی بھی محنت کرلے، وہ سکندر شہریار سے ہمیشہ پیچھے رہے گا۔ وہ اس روز اپنے کمرے میں چھپ کر گھنٹوں رویا تھا۔

اس کے باپ کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ ان کے چند جملوں سے انہوں نے اپنے معصوم بیٹے کا دل کس بری طرح توڑا تھا۔ اس روز سے پہلے تک اسے سکندر سے صرف حسد محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے ہرانا چاہتا تھا، مگر اس روز کے بعد اسے سکندر سے عجیب سی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سکندر سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ سکندر اس سے جتنا پیار کرتا، اسے جتنا اپنی طرف کھینچتا، وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا، اس سے الگ الگ رہتا۔

"تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟ اپنے الگ دوست بنالیے ہیں، ان کے ساتھ کھیلتے ہو کیوں؟"

وہ اس کے پاس آکر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سے صرف دس ماہ بڑا تھا مگر پیار یوں کرتا، اس کی فکر یوں کرتا گویا اس سے کئی سال بڑا ہو۔

"مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے میں مزہ نہیں آتا سکندر! تمہارے کھیل بھی کیا ہوتے ہیں؟ پاپا کو خوش کرنے کے لیے تم نے سوئمنگ کرنی ہوتی ہے یا رائیڈنگ، کیونکہ اس سے اسٹیمنا بڑھتا ہے، جبکہ مجھے فٹ بال کھیلنا ہوتا ہے۔ تمہاری طرح پاپا کی خوشامد کرنے کے لیے میں یہ بورنگ کام نہیں کرسکتا۔" وہ اچھی خاصی بدتمیزی سے بولا تھا۔

سکندر کے چہرے پر ایک دم ہی شرمندگی اور دکھ آگیا تھا۔ اس کے تلخ اور بدتمیز لہجے نے سکندر کے دل کو دکھایا ہے، وہ جانتا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے دل کو کٹھور بنالیا تھا۔

سکندر ہر چند کوشش کررہا تھا کہ وہ اس سے قریب ہوجائے، مگر اس نے اس کی کوششوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ اس نے اپنے دوست، اپنی دلچسپی سب سکندر سے اس حد تک الگ کرلی تھیں کہ بعض اوقات دن بھر میں صرف کھانے کی میز پر ہی ان بھائیوں کی ملاقات اور گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس نے خود کو بظاہر بڑا لاپروا اور مضبوط سا بنالیا تھا جیسے اب اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پاپا سکندر کو اس سے زیادہ کیوں اہمیت دیتے ہیں، جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سکندر سے ہمیشہ پیچھے کیوں رہ جاتا ہے۔ وہ اس کی طرح غیر معمولی کیوں

نہیں۔ مگر سترہ سال کی عمر میں وہ اندر سے آج بھی وہ ہی بچہ تھا جو باپ کی ایک نگاہ التفات کا متمنی رہا کرتا تھا۔ جو چاہتا تھا وہ سکندر سے بڑھ کر کچھ ایسا کر دکھائے کہ اس کے پاپا اسے سکندر کی مثال نہ دے سکیں، بلکہ سکندر کو اس کی مثال دیں۔

☆ ☆ ☆

مگر سکندر واقعی سکندر تھا۔ وہ جیتنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ دنیا فتح کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں کہیں شکست کا سامنا نہیں کیا تھا تو اب کی بار کیسے کرلیتا؟ اس کا ہارورڈ میں ایڈمیشن ہوگیا تھا۔ ایڈمیشن مل جانے کی خبر شہریار خان اور امو جان کو سنانے کے بعد وہ بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں آیا تھا۔ گھر میں [illegible] نے اسے یہ خبر پہلے ہی دے دی تھی [illegible] وہ فوری طور پر گھر سے باہر جارہا تھا۔

"زین! میرا ہارورڈ میں ایڈمیشن ہوگیا۔" سکندر بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے سنجیدہ نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

"مبارک ہو۔"

"پاپا اور امو جان بہت خوش ہیں زین۔ تم بھی خوش ہوئے ہو نا زین؟"

"ہاں بہت۔" اس کے لہجے میں خوشی نہیں بلکہ تمسخرانہ ہنسی شامل تھی۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر سکندر حیرت سے بولا تھا۔

"جمی کے پاس، ہمارا فٹ بال میچ ہے۔"

"آج تو مت جاؤ زین پلیز۔"

"کیوں آج کیا خاص بات ہوئی ہے؟ تمہارا ایڈمیشن؟ آئی ایم سوری میرے لیے یہ اتنی امپورٹنٹ بات نہیں کہ میں اپنے سارے پروگرامز کینسل کرکے تمہارے ساتھ گھر پر بیٹھ جاؤں۔"

امو جان اور پاپا کے سامنے تو ہرگز نہیں، مگر اکیلے میں وہ سکندر کے ساتھ اسی ٹون میں بات کیا کرتا تھا بلکہ سکندر کی بات کا جواب دیا کرتا تھا، کیونکہ خود سے تو وہ اسے بہت ہی کم شاذونادر ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس کے بے رخی اور [illegible] لیے جواب نے سکندر کے چہرے پر پھیلی خوشی کو کس طرح مٹادیا ہے، وہ کتنا ہرٹ ہوا ہے، اس پر دھیان دیے بغیر وہ کمرے سے ہی نہیں گھر سے ہی نکل گیا تھا۔ وہ جمی کے پاس نہیں گیا تھا، وہ فٹ بال کھیلنے نہیں گیا تھا، وہ غصے میں مختلف سڑکوں پر اکیلا پھر رہا تھا۔ کیوں سکندر ہر بار جیت جاتا ہے کیوں؟ کیا ہوجاتا اگر زندگی میں ایک بار وہ ہار جاتا؟

وہ جانتا تھا، بچپن سے دہرائی جاتی کہانی ایک بار پھر دہرائی جانی تھی۔ اب اگلے سال اپنے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اسے ہارورڈ میں ایڈمیشن کے لیے جان کی بازی لگا دینی تھی۔ جتنی محنت اور کوشش اس کے بس میں تھی کر ڈالنی تھی۔ وہ سکندر کو ایک بار پھر ہرا نہیں سکا تھا تو کم ازکم اس کے برابر تو آجائے۔ اس کے اندر سکندر کے لیے کڑواہٹیں ہی کڑواہٹیں پیدا ہورہی تھیں۔ باپ نے اس سے کوئی امید نہ باندھی تھی۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے یہ ضد باندھ رہا تھا کہ اگلے سال اسے ہر حالت اور ہر قیمت پر ہارورڈ ہی میں داخلہ لینا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

رات کے خواب کے اس پر ابھی تک اثرات تھے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اتنے کم دنوں کے وقفے سے وہ خواب پھر نظر آکر اس کی تمام توانائیاں نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کل رات نیند لانے کے لیے اس نے دوا لے لی تھی۔ کیونکہ اس کے سر میں شدید درد تھا اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے چند گھنٹوں کی نیند بے حد ضروری ہے۔ مگر وہ چند گھنٹوں کی نیند ہی اس کے لیے بے پناہ اذیتوں کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ خواب سے بیداری کے بعد وہ پھر اسی درد اور اذیت میں مبتلا ہوگیا تھا۔

وہ 32 سال کا بظاہر بہت صحت مند اور بھرپور مرد نظر آتا تھا، مگر اس کے ساتھ صحت کے کئی مسائل تھے۔ وہ ڈپریشن کا دائمی مریض تھا۔ اسے انسومنیا

(بے خوابی) کی تکلیف لاحق تھی۔ اسے ڈراؤنے خواب آتے تھے اور یہ ڈراؤنے خواب اپنے ساتھ اس کے لیے مائیگرین کا درد لاتے تھے۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے ایک شدید درد اٹھتا تھا جو اس کے کندھوں، ہاتھوں اور سر تک پھیل جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اعصابی درد بتایا تھا۔ اس کی میڈیسنز دے رکھی تھیں۔ اسے خوش رہنے اور کوئی بھی پریشان کن بات نہ سوچنے کو ہدایت کر رکھی تھی۔ مگر کیا خوش رہنے کی کوشش کرنے سے انسان خوش رہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے اس کی تمام تکلیف کا سبب اس کے ڈپریشن اور زندگی سے ناامیدی کو قرار دیا تھا۔

یہ وجوہات ختم کرنے سے وہ قاصر تھا سو وقتاً فوقتاً اٹھتے اس درد کو خاموشی سے سہ لیا کرتا تھا۔ کبھی نہ ہوتا تو یہ درد مہینوں نہ ہوتا اور اگر ہونے پر آتا تو کئی کئی دن اس کو نڈھال اور اذیت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔ اس درد کے ساتھ اس کے اندر غصہ اور زندگی سے نفرت لوٹ آیا کرتی تھی۔ وہ بہت غصہ ہو جاتا تھا، معمولی معمولی باتوں پر اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ یہ غصہ درحقیقت اس کے اندر کی اداسیاں اور محرومیاں تھیں۔ جیسے جیسے یہ درد بڑھتا اس کا ڈپریشن بھی بڑھتا اور اس کے اندر اپنی زندگی ختم کر لینے کی خواہش پھر بیدار ہونے لگتی۔ یہ کیفیت مستقل نہیں رہتی تھی۔ کبھی چند دن، کبھی چند گھنٹے، کبھی محض چند منٹ مگر یہ اس کا مستقل طور پر پیچھا بھی نہیں چھوڑتی تھی۔

طبیعت جیسی بھی تھی اسے دفتر تو ہر حال میں جانا تھا۔ وہ ہوٹل میں بیٹھ کر اس درد کے نخرے اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس پر طاری ہوا خود کو ختم کر دینے کا احساس اسے خود کو تکلیف اور اذیت دینے پر اکسا رہا تھا۔ اس کی گردن میں اس شدت کا درد تھا کہ وہ اپنی گردن دائیں بائیں گھما نہیں پا رہا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سانس بھی جیسے کھینچ کھینچ کر آ رہی تھی۔ مگر وہ روز کی طرح تیار ہو کر آفس جا رہا تھا۔ دفتر میں وہ کسی کو پتا نہیں چلنے دے رہا تھا کہ اسے

کتنی شدید تکلیف ہے۔ اسے گردن دائیں بائیں نہ گھماتا دیکھ کر زیادہ سے زیادہ کسی نے کچھ سوچا ہو گا تو یہ ہی کہ رات سوتے میں اس کی گردن میں کوئی جھٹکا وغیرہ آگیا ہے۔ روبرٹو نے تو اس سے یہ بات پوچھ بھی لی تھی۔

"ہاں سوتے میں جھٹکا آگیا تھا۔"

اس نے روبرٹو کی بات کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ روبرٹو اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ چار، پانچ دنوں کے لیے گھومنے پھرنے وینس جا رہا تھا۔

"تم بھی وینس ضرور جانا سکندر۔ اٹلی آئے ہو، وینس گھومے بغیر واپس چلے گئے تو تمہارا ٹرپ ادھورا رہ جائے گا۔"

روم جہاں وہ قیام پذیر تھا، اسے اسے دیکھنے اور وہاں گھومنے پھرنے کا کوئی شوق نہ تھا تو وہ اٹلی کے کسی اور شہر میں کیا جاتا، بہرحال اس نے "ہاں کوشش کروں گا" کہہ کر روبرٹو کی اس بات کا بھی اثبات ہی میں جواب دیا تھا۔ آج رات اسے آفس کے انتہائی اہم کام سے نیپلز جانا تھا۔ وہاں کی ایک کمپنی کی ان کی کمپنی کے ساتھ ایک انتہائی اہم نوعیت کی میٹنگ تھی۔ آفس کی جانب سے اس کے جانے کے انتظامات مکمل تھے۔

اٹلی کی انتہائی تیز رفتار اور مہنگی ٹرین Alta velocita جو اٹلی کے مختلف شہروں کے درمیان چلا کرتی تھی اس میں اس کی سیٹ ریزرو کروائی جا چکی تھی۔ Alta velocita نے اسے سوا گھنٹے میں نیپلز پہنچا دینا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے اس کی میٹنگ تھی اور میٹنگ سے قبل کے چند گھنٹے گزارنے کے لیے آفس کی جانب سے نیپلز کے ایک [illegible] ہوٹل میں اس کے لیے روم بھی بک کروایا جا چکا تھا۔

وہ آفس میں پورا دن گزار کر شام میں ہی اٹھا تھا۔ درد تھا تو ہوا کرے۔ اس نے واپسی کے لیے روزانہ کی طرح واک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میٹرو، ٹیکسی یا آفس کی گاڑی میں اپنے ہوٹل نہیں جائے گا۔ اس نے خود اذیتی سے سوچا تھا۔ ابھی وہ Via Barberini

ہی پر تھا جب پیچھے سے ایک گاڑی اسے ہارن دیتی اس کے نزدیک آ کر رکی۔

"دیکھو تقدیر نے پھر ہمیں ملا دیا۔"

لیزا ہنس کر گاڑی کا شیشہ نیچے کرتی ہوئی اس سے بولی تھی۔ وہ جواباً کچھ بھی نہیں بولا۔ آخر اس لڑکی کی یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کی بے تکلفی سخت ناپسند کرتا ہے۔

"آؤ بیٹھو۔ کہاں جانا ہے؟ تمہیں میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کی کوئی دوست ہو۔ وہ اپنا غصہ دباتا ہوا خشک لہجے میں بولا۔

"نو تھینکس۔ میں واک کرنے جانا چاہتا ہوں۔"

"کم آن سکندر [illegible] مت کرو۔ میں تمہیں ڈراپ [illegible]" [illegible] بے تکلفی اور اصرار لیا جملہ اس نے مکمل نہیں [illegible] دیا تھا۔ بھاڑ میں جائے روبرٹو اس کی دوست اور بھاڑ میں جائے لحاظ اور اخلاقیات۔ غصہ اور بیزاریت اس پر پوری طرح حاوی تھی۔

"جب میں تمہیں منع کر چکا ہوں تو تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟ میں تمہارے ساتھ بات کرنے، بیٹھنے یا دوستی کرنے میں بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ روبرٹو کی دوست ہو تو اس کی دوست بن کر رہو۔ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کیا کرو۔"

وہ بہت بدتمیزی سے خاصی تیز آواز میں بولا تھا۔ لیزا اس کی بدتمیزی پر حیرت سے آنکھیں پھاڑے بالکل ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ غصے سے تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے فوراً آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ اپنے ہوٹل آ چکا تھا۔ اسے شدید تکلیف تھی۔ وہ آتے ہی بغیر لباس تبدیل کیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ مگر اسے لیٹنے میں بھی بہت تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ گردن، کندھے اور بازوؤں میں درد کی شدت کے سبب وہ اپنی مرضی کے مطابق کروٹ بھی نہیں لے پا رہا تھا۔ اس کے سر میں ناقابل بیان حد تک درد تھا۔

جب یہ درد حد سے بڑھتا محسوس ہوا تب وہ بیڈ سے اٹھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ تمام میڈیسنز لایا ہوا تھا جو ڈاکٹر نے اس کے لیے تجویز کر رکھی تھیں۔ اس نے گلاس میں پانی نکالا اور خالی پیٹ وہ تیز اثر دوا لے لی جو ڈاکٹر نے اس کی اس درد کے لیے تجویز کر رکھی تھی۔

دوا لے کر وہ واپس بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ خود کو پرسکون کرنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس دوا سے درد کم ہونے کے ساتھ ساتھ نیند بھی طاری ہوا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود پر نیند کا غلبہ محسوس کیا تو سوچا کہ اچھا ہے وہ تھوڑی دیر سو لے۔ ابھی اس کی روانگی میں خاصے گھنٹے باقی ہیں۔ وہ سو کر اٹھے گا تو درد ختم نہیں بھی ہوا ہو گا تو کم ضرور ہو چکا ہو گا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر سویا ہے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مائیگرین میں کمی تھی مگر گردن اور کندھے کا درد اپنی جگہ برقرار تھا۔ اسے یاد آیا وہ آفس سے آ کر دوا لے کر سو گیا تھا۔ اس وقت چونکہ سورج غروب نہیں ہوا تھا، باہر سے روشنی آ رہی تھی، اس لیے اس نے کمرے کی لائٹس بھی آن نہیں کی تھیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟ اسے جانے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔ اس نے پاس رکھا موبائل اٹھا کر اس میں وقت دیکھا۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ شاید وہ موبائل میں ٹائم غلط دیکھ رہا ہے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج کر دو منٹ اور اس کی ٹرین کو رات کے ایک بجے روانہ ہونا تھا۔

وہ گھبرا کر ایک دم ہی بیڈ پر اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اس کی ٹرین مس ہو گئی۔ اب وہ وقت پر نیپلز کس طرح پہنچ پائے گا؟ وہ اس طرح سے کیسے سو گیا۔ اسے دوا نہیں لینی چاہیے تھی۔ چند گھنٹوں کی تو بات تھی، برداشت کر لیتا درد۔ بہرحال جو ہو چکا تھا، وہ تو ہو چکا تھا۔ اب اس کو فوری طور پر اس پریشانی کا کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔ اسے فوری طور پر نیپلز پہنچنے کے لیے کوئی

http://www.pakfunplace.com

اور راستہ ڈھونڈتا تھا۔

اس نے ہوٹل کے ریسپشن کا نمبر ملایا۔ وہاں پر اسے بتایا گیا کہ Alta velocita یا eurostar ان دونوں تیز رفتار ٹرینوں میں سفر کے لیے پہلے سے سیٹ ریزرو کروانی پڑتی ہے۔ اچھا تو وہ سیٹ ریزرو کروالیتا ہے' اگلی ٹرین روانہ کتنے بجے ہوگی۔ ریسپشن پر موجود لڑکی نے اسے اس کی مطلوبہ معلومات پچیس منٹ کے بعد فون پر پہنچائی تھیں۔ صبح چھ بجے eurostar نے روانہ ہوتا تھا' مگر اس میں کوئی سیٹ دستیاب نہیں تھی اور اگلی Alta velocita نے روم سے نیپلز کے لیے روانہ ہی صبح آٹھ بجے ہوتا تھا۔

وہ حقیقتاً "پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھا تھا۔ میٹنگ کی اہمیت' اس کی حساس نوعیت' اسے تو وہاں وقت سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا' جبکہ یہاں تو اس کے صحیح وقت پر ہی پہنچنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ روبرٹو کے علاوہ اس کے پاس اپنے یہاں کے آفس کے کسی بھی فرد کا کنٹریکٹ نمبر نہیں تھا۔ اب وہ کیا کرے' کسی نہ کسی سے تو اسے مدد لینی پڑے گی۔ اٹلی اس کا ملک نہیں' اسے یہاں کی زبان نہیں آتی' ہوٹل سے تو معمولی سی معلومات ہی اسے آدھے گھنٹے بعد پہنچائی گئی تھیں۔

"کیا پتا کبھی تمہیں آرٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی پینٹنگ بنوانا چاہو۔"

روبرٹو کے علاوہ اور کون اٹالین ہے جسے وہ جانتا ہے اور جس کا کنٹریکٹ نمبر اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے ذہن دوڑانا شروع کیا تو یک دم ہی اسے دو روز قبل لیزا کے ساتھ لنچ کرنا اور اس کا اسے اپنا فون نمبر دینا یاد آیا۔ اس نے وہ چٹ کہاں رکھی تھی۔ پھینکی تو نہیں تھی' یہ اسے یاد تھا۔ ہاں روبرٹو کے سامنے مروت ظاہر کرنے کو اس نے وہ چٹ جیب سے اپنا والٹ نکال کر اس میں رکھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ باہر جا کر پھینک دے گا۔ مگر پھر اسے وہ پھینکنا یاد نہیں رہی تھی۔

وہ ایک دم ہی تیز رفتاری سے اٹھا۔ والٹ اس کے کوٹ کی جیب میں تھا اور کوٹ صوفے پر پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے والٹ میز پر پورا کا پورا خالی کر دیا۔ اس میں سے وہ چٹ نکل آئی تھی۔ وہ لیزا کا موبائل نمبر تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے وہ نمبر ڈائل کیا تھا۔ وہ نیپلز جلدی پہنچنے کا کوئی متبادل ذریعہ اس سے پوچھ لے گا۔ اس کا تو یہ ملک ہے' وہ اسے ضرور کوئی متبادل بتا سکے گی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر یہ ٹائم کیا اسے فون کرنے کا کوئی مناسب ٹائم ہے؟ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو پونے پانچ بجا رہی تھی۔

وہ لیزا کا دوست نہیں۔ اس کا لیزا پر ایسا کوئی حق نہیں کہ وہ اسے بے وقت فون کر ڈالے' جبکہ گزشتہ شام وہ اس سے کافی ٹھیک ٹھاک بدتمیزی بھی کر چکا ہے۔ اس خیال کے آنے کی دیر تھی' اس نے فوراً" ہی لائن کاٹ دی تھی۔ نہیں' لیزا کو فون کرنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ ابھی اس نے لائن کاٹی ہی تھی کہ لیزا کے نمبر سے اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے فوراً" ہی کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔ جواباً" وہ اٹالین میں روانی سے کوئی جملہ بولی تھی' جو ظاہر ہے' اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ جواباً" انگریزی میں بولا تھا۔

"لیزا! یہ میں ہوں سکندر۔"

"اوہ سکندر! تم ہو؟" وہ جیسے ان جانے نمبر سے کال کرنے والے کو اب شناخت کر پائی تھی۔

"میرے پاس نامعلوم نمبر سے کال آئی اور پھر فوراً" ہی لائن کاٹ دی گئی تو میں نے حیران ہو کر سوچا کون ہے' اس ٹائم پر کال کرنے والا کون ہے' یہ چیک کرنے کے لیے وہ... کال کی تھی۔" وہ اپنے اسی مخصوص خوش اخلاق انداز میں بول رہی تھی۔

"سوری' میں نے تمہیں غلط وقت پر کال کی۔"

"کوئی بات نہیں' میں جاگی ہوئی ہی تھی۔ تم بتاؤ کیسے فون کیا تھا؟ کوئی پرابلم؟" وہ کل اس سے کتنی بدتمیزی سے پیش آ چکا ہے' اس بات کا ہلکا سا بھی تاثر اس کے لہجے میں موجود نہیں تھا۔ اس کی وہی بے تکلفی و خوش دلی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"مجھے صبح آٹھ بجے نیپلز پہنچنا ہے' ایک بہت ہی اہم میٹنگ کے لیے۔ اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور میری ٹرین مس ہو گئی ہے۔ پلیز تم مجھے یہ گائیڈ کر دو کہ میں اب کس ذریعے سے سفر کروں کہ نیپلز درست وقت پر پہنچ سکوں۔"

"تمہیں نیپلز جانا ہے' ہوں۔" اس نے سوچنا شروع کیا۔

"جہاز کا آپشن تو فضول ہے۔ فلائٹ کا ٹائم تو ایک گھنٹے سے بھی کم ہے۔ مگر یہاں سے ایئرپورٹ پہنچنے پھر وہاں تمام فارمیلٹیز سے گزرنے کے بعد نیپلز پہنچو گے تو وہاں ایئرپورٹ سے شہر کے مرکز تک پہنچنے میں تمہیں گھنٹے لگ جائیں گے۔ جتنی بھی فاسٹ ٹرینز ہیں ان میں تمہیں کم سے کم بھی ایک دن پہلے سیٹ ریزرو کروانی پڑے گی کیونکہ ٹورسٹ سیزن ہے اور ان پر رش ہوگا۔ سلو ٹرینز سے پہنچنے میں تمہیں ساڑھے تین گھنٹے لگ جائیں گے۔"

وہ جیسے مختلف آپشنز پر غور کرتی جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"بائے روڈ۔" وہ ایک دم ہی بولی۔ "تمہیں بائے روڈ نیپلز جانا چاہیے۔ صبح سویرے کا وقت ہے' اس وقت تمہیں زیادہ ٹریفک نہیں ملے گا اور ڈرائیور اگر مجھ جیسا ہوا تو تم ڈھائی گھنٹے میں نیپلز میں ہو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

ابھی وہ جواباً" کچھ بول بھی نہیں پایا تھا کہ وہ فوراً" ہی مزید بولی۔

"تم مجھے اپنے ہوٹل کا نام بتاؤ۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں' جتنی دیر مجھے پہنچنے میں لگے گی تم اس میں اپنی تیاری کر لو۔"

وہ اس سے صرف مشورہ اور حل معلوم کرنا چاہتا تھا' اس کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ بالکل بھی مناسب نہیں تھا' اپنی وجہ سے کسی کو زحمت دینا' نیند سے اٹھانا اور پھر دوسرے شہر جانا۔

"تم زحمت مت کرو لیزا میں۔" اسے خود نہیں پتا تھا' وہ خود کس طرح بائے روڈ نیپلز پہنچ جائے گا۔ ٹیکسی وغیرہ کا بھی اگر بندوبست کرتا ہے تو زبان کا مسئلہ راستے میں اور ہوٹل تک پہنچنے میں درپیش آ سکتا تھا۔ لیزا اس کے ادھورے جملے کے جواب میں فوراً" بولی تھی۔

"ابھی ان فارمیلٹیز کو رہنے دو' اس وقت تمہارے لیے اہم ہے وقت پر نیپلز پہنچنا۔ تم جلدی سے تیاری کرو' میں فوراً" پہنچ رہی ہوں۔"

ہاں اس وقت اسے مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔ اس نے نیم رضامندی کے ساتھ لیزا کو اپنے ہوٹل کا نام بتا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا گھر قریب تھا یا وہ واقعی اپنے دعوے کے مطابق تیز ڈرائیونگ کرتی تھی جو محض پندرہ منٹ کے اندر اس کے ہوٹل میں موجود تھی۔ وہ ہوٹل کی لابی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیزا نے اسے کال کی تھی۔

"میں پہنچ گئی ہوں' تم باہر آ جاؤ۔"

وہ اپنا لیدر بریف کیس ہاتھ میں لیے باہر آ گیا تھا۔ اسے سخت شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کسی سے آپ اتنی بدتمیزی کریں اور پھر محض بارہ گھنٹوں کے اندر اندر اسی شخص سے مدد لیں۔ اسے لیزا کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ مگر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اس نے کریم کلر کی جرسی ٹی شرٹ بلیک جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ اس کے سرخی مائل براؤن بال شانوں سے کچھ نیچے آتے تھے اور اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ اس نے آگے کے بالوں کو کانوں کے پیچھے کر رکھا تھا۔ پنک لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ ہمیشہ کی طرح نفیس اور ڈیسنٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ سیٹ بیلٹ باندھے ہوئے بیٹھی تھی۔

"چلو سکندر۔"

"چلو۔" وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

http://www.pakfunplace.com

اس نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ پانچ پینتیس' پانچ چالیس پر سورج طلوع ہوا کرتا تھا گویا ابھی سورج بھی طلوع نہ ہوا تھا جب سوا پانچ بجے انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

"ایم سوری لیزا! تمہیں میری وجہ سے اس قدر زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

جو وقت لوگوں کے سونے اور آرام کرنے کا ہوتا ہے' اس وقت اپنے آرام دہ بستر سے نکل کر وہ اسے ایک دوسرے شہر پہنچانے جا رہی تھی۔ وہ سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے ایسا کون سا دوستانہ رویہ رکھا تھا جو بدلے میں اپنے لیے کسی احسان کی توقع رکھتا۔

"اتنے پرتکلف بھاری بھرکم جملے مت بولو' تم روبرٹو کے کولیگ ہو اور روبرٹو میرے بچپن کا دوست ہے۔ وہ اگر روما میں موجود نہیں ہے تو اس کی غیر موجودگی میں مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

"تم اس وقت جاگی ہوئی کیسے تھیں؟" اسے یاد آیا' وہ فون پر یہ ہی کہہ رہی تھی کہ وہ جاگی ہوئی تھی۔

لیزا اس کے سوال پر ہنسی۔ "میں اپنے اسٹوڈیو میں تھی' پینٹنگ کر رہی تھی۔ تمہارا شاید کبھی واسطہ نہیں پڑا' ہم آرٹسٹ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کام کی دھن سوار ہو جائے تو دن اور رات کے احساس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"

اس کی نگاہیں اسٹیئرنگ پر جمے لیزا کے ہاتھوں پر پڑیں۔ اس کی انگلیاں لمبی مخروطی تھیں۔ بلاشبہ یہ ہاتھ ایک آرٹسٹ ہی کے ہاتھ تھے۔ ٹرین مس ہونے کی فکر اور نیپلز وقت پر پہنچنے کی پریشانی میں اسے اپنا درد بھول گیا تھا۔ اب پرسکون ہو کر گاڑی میں بیٹھا تھا تو درد کا احساس جاگا تھا۔ وہ لوگ ہائی وے کی طرف رواں دواں تھے۔ لیزا کا دعوا تھا کہ وہ اسے ساڑھے سات اور پونے آٹھ کے بیچ نیپلز پہنچا دے گی۔ اسے دوبارہ درد کی شدت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ گردن کے پچھلے حصے سے اٹھتا' کندھے اور بازوؤں تک جاتا ہوا درد' اس وقت صرف اس کے سر میں درد نہیں ہو رہا تھا۔ ایک' دو منٹ کے لیے اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ سیٹ کی پشت سے کمر ٹکائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا کی توجہ ڈرائیونگ پر ہے۔ اس کا دھیان اس پر نہیں گیا ہوگا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں' لیزا نے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنے الفاظ میں زور پیدا کرتا فوراً" بولا۔

"مجھے نہیں لگ رہی۔" وہ جواباً" سنجیدگی سے بولی۔ اس بار وہ جواب میں چپ رہا تھا۔ اس کا اپنی طبیعت کو موضوع گفتگو بنانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چونکہ اسے گردن دائیں بائیں کرنے میں تکلیف ہو رہی تھی' اس لیے اس سے بات کرنے کے لیے وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔ اب جبکہ وہ اس کا احسان لے چکا تھا اور وہ اتنی غیر معمولی حد تک جا کر اس کی مدد کر رہی تھی' تب اخلاق اور تہذیب کا تقاضا یہ ہی تھا کہ وہ اپنے کل شام کے رویے پر اس سے معذرت کرے۔ اس کے کچھ کہنے سے بھی پہلے پتا نہیں لیزا نے اسے اتنے غور سے کیوں دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی و بردباری سے گویا ہوا تھا۔

"ایم ایکسٹریملی سوری لیزا! میں [illegible] ساتھ کافی مس بی ہیو کیا تھا۔ [illegible] کسی اور بات پر اپ سیٹ تھا۔"

"مگر میں تمہارے سامنے آئی اور تم مجھ پر خفا ہو گئے۔" وہ اس کا جملہ اچک کر مسکرا کر بولی۔ جملے کے اختتام پر وہ جیسے اپنی ہی بات کا مزہ لیتی ہنسی۔ اسے اتنی ملاقاتوں کے بعد اب اندازہ ہو چکا تھا کہ بات بے بات ہنسنا اور بے تحاشا بولنا اس لڑکی کی عادت تھی۔

"بے فکر رہو' میں نے تمہاری باتوں کا برا نہیں مانا۔ مجھے کل ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی اور بات سے اپ سیٹ ہو۔ ویسے تم کس بات پر اپ سیٹ تھے؟"

پھر وہی ذاتی سوال' آخر یہ لڑکی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کیوں کرتی تھی؟ شاید نہیں۔ یقیناً"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات آئے تھے کہ وہ اس سوال کو ناپسند کر رہا ہے تب ہی وہ جلدی سے معذرت کرنے والے انداز میں بولی۔

"نہیں بتانا چاہتے۔ مت بتاؤ' مگر دوبارہ مجھ پر اپ سیٹ مت ہونا۔"

جملے کے آخر میں وہ مسکرائی تھی' تکلیف کے باوجود اس بار وہ بھی مسکرایا تھا۔

"تمہاری گردن میں تکلیف ہے؟" اسے اب لیزا کا چند منٹ قبل اپنی جانب بغور دیکھنا سمجھ میں آیا تھا۔ وہ جس طرح پورا کا پورا اس کی طرف گھوما تھا بات کرنے کے لیے' اسے لیزا نے محسوس کیا تھا۔

"ہاں' شاید سوتے میں [illegible]۔" وہ لہجے کو قصداً" بہت لاپروا بنا کر بولا۔ لیزا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی سیٹ بیک کو پیچھے کی طرف کر دیا۔

"تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ' چاہو تو پیچھے سیٹ پر لیٹ جاؤ۔" وہ اس آفر پر اب کی بار ہنس پڑا تھا۔

"تم کیوں ہنسے؟ میں نے کیا کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" لیزا نے اسے گھورا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی۔" وہ ہنسی روک کر بولا۔

"تم کیا پینٹ کرتی ہو؟" اس نے پہلی بار اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پوچھا تھا۔

"زیادہ تر لینڈ اسکیپ' اسٹل لائف اور پورٹریٹس' کبھی کچھ اور موڈ بن جائے تو وہ بھی پینٹ کر لیتی ہوں' ورنہ میرے خاص موضوعات یہ ہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تم روما میں رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری فیملی بھی وہیں رہتی ہے؟"

لیزا نے یہ سوال شاید یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ مگر اس کے لب ایک دم ہی بھنچ گئے تھے۔ چہرے پر سختی اور کھردرا پن آ گیا تھا۔

"بہتر ہو گا لیزا! اگر تم مجھ سے پرسنل سوالات نہ کرو۔" سخت لہجے میں بولتے بولتے اسے ایک دم ہی یاد آ گیا کہ وہ اس وقت اس کی گاڑی میں اس کے آسرے پر اس کی مدد کے سہارے نیپلز جا رہا ہے' تب فوراً" ہی اپنی ٹون نارمل کر کے اپنے سخت جملے کا اثر زائل کرنے کے لیے بولا۔

"میں اکیلا ہوں' میری فیملی نہیں ہے۔" لیزا نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اس کے فیملی نہ ہونے والے جملے کو بھی نہیں لیا تھا' اس نے اگر نوٹس لیا تھا تو اس کے پل بھر میں بدلتے لب و لہجے کا۔ ایک اٹالین لڑکی کے لیے فیملی کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی جو وہ اس کے جملے میں موجود کرب کو محسوس کر پاتی۔

"ہو تم اچھے خاصے بدتمیز' پر سچ کہوں یہ بدتمیزی تمہیں سوٹ کرتی ہے۔"

وہ جملہ مکمل کرنے کے بعد مسکرائی تھی۔ وہ جس رفتار سے ڈرائیونگ کر رہی تھی' اسے یقین تھا وہ اسے مقررہ وقت سے پہلے نیپلز پہنچا دے گی۔ ایک' دو بار تو اس نے اتنے خطرناک انداز میں موڑ کاٹا تھا کہ اسے لگا تھا اب ایکسیڈنٹ ہوا کہ تب۔

"تم مجھے ٹائم پر پہنچانے کے لیے اس اسپیڈ سے ڈرائیو کر رہی ہو؟"

"نہیں' یہ میری عادت ہے' ان فیکٹ یہ تمام اٹالینز کی عادت ہوتی ہے' فاسٹ ڈرائیونگ ہم اٹالینز کی پہچان ہے۔"

جو بات قابل فخر ہرگز نہ تھی' وہ اسے بھی فخریہ انداز میں بیان کر رہی تھی۔ وہ اس کے فخریہ انداز میں گردن اونچی کر کے بولنے پر مسکرایا تھا۔ چند منٹ خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہنے کے بعد لیزا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھا بیٹھا ونڈ اسکرین سے اس پار ہائی وے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی نگاہیں محسوس کر کے وہ پھر گردن اس کی طرف نہ گھما سکنے کے باعث سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پورا اس کی طرف گھوما۔

"تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے نا؟ تم نے کوئی میڈیسن لی؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میڈیسن لے لی تھی۔ تکلیف زیادہ نہیں ہے۔ لاؤ اب میں ڈرائیو کروں؟" اس نے لیزا سے کہا۔ اتنی صبح سویرے وہ اسے دوسرے شہر پہنچانے جا رہی تھی'

http://www.paktunplace.com

اسے مسلسل شرمندگی کا احساس تھا۔
"تم آرام سے بیٹھو اور میری ڈرائیونگ سے لطف اندوز ہو۔" وہ مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں بولی۔
"تمہاری اس ڈرائیونگ کے دوران صرف اللہ یاد آسکتا ہے اور آرہا ہے۔" وہ اسی کی ٹون میں جواباً بولا۔
لیزا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ "میری یہ ڈرائیونگ ہی تمہیں ٹھیک وقت پر تمہاری منزل پر پہنچائے گی۔"
اسے بات بے بات کس قدر ہنسنے کی عادت تھی۔
"تم نے میرے روما میں اب تک کہاں کہاں گھوم لیا؟ کتنی جگہوں کی سیر کرلی؟"
چند منٹوں کی خاموشی کے بعد لیزا نے اس سے پوچھا۔ اس کے میرے روما کہنے میں اپنے شہر کے لیے بے پناہ محبتیں چھپی ہوئی تھیں۔
"کسی بھی جگہ کی نہیں، میں نے صرف Via Barberini اور Veneto Via کے آس پاس کی جگہیں آتے جاتے دیکھی ہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔
"کیا؟ تم eternal city میں ہو، دنیا بھر کے ٹورسٹ کی فیورٹ جگہ پر آئے ہوئے ہو اور وہاں پر کچھ بھی نہیں دیکھا؟"
وہ حیرت کی زیادتی سے چلائی تھی۔ لیزا کے لفظ اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے شہر سے محبت کرتی ہے اور اس پر فخر میں بھی جتاتی ہے۔
"ہاں، میرے پاس ٹائم نہیں تھا اور میرا دل بھی نہیں چاہا تھا۔"
وہ جواباً سنجیدگی سے بولا تھا۔ لیزا نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔
لیزا نے اپنے وعدے کے مطابق پونے آٹھ بجے اسے نیپلز پہنچا دیا تھا۔
"Wel come to naples the birth place of pizza"
(پیزا کے پیدائشی شہر نیپلز میں خوش آمدید) لیزا نے مسکرا کر قدرے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا، وہ جواباً "فوراً" بولا۔
"and organized crime" — (اور منظم جرائم) لیزا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ وہ اپنے روما ہی سے نہیں وہ اپنے پورے اٹلی سے محبت کرتی تھی۔ تب ہی اس کے خلاف کچھ سننا اسے پسند نہیں تھا۔
"کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا۔ پیزا کی پیدائش نیپلز میں ہوئی تھی تو دنیا بھر میں منظم جرائم کا آغاز بھی تو یہیں سے ہوا تھا کیا یہاں کا مافیا کامورا (camorra) دنیا کا خطرناک ترین مافیا نہیں؟"
وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اب پرسکون تھا، اس لیے اسے لیزا کو چڑانے میں لطف بھی آیا تھا۔
"ہاں ہے۔ مگر عام لوگوں کے ساتھ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ نیپلز کی ریپوٹیشن بری زیادہ ہے۔" وہ فوراً "نیپلز کے دفاع میں بولی تھی۔
آٹھ بجے وہ اسے اس سڑک پر لے آئی تھی جہاں اس کمپنی کا ہیڈ آفس واقع تھا جن کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ جس علاقے میں وہ تھے وہاں جدید عمارتیں تھیں۔ وہ سامنے نظر آتی بلڈنگز کو دیکھ رہا تھا جب لیزا اس سے بولی۔
"نیپلز کے دو رخ ہیں۔ ایک تاریخی اور ایک ماڈرن۔ اس ماڈرن علاقے سے ذرا نکلو تو تمہیں تاریخی عمارتیں، گرجا گھر اور فوارے جا بجا نظر آئیں گے۔"
اس نے سر اثبات میں [illegible] اپنی ول پاور کو استعمال کرکے تکلیف [illegible] بھی احساس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا۔
[illegible] اس کی میٹنگ تھی اور اس کے لیے اسے بہت الرٹ اور ایکٹو رہنا تھا، اپنے ذہن کو [illegible] حاضر رکھنا تھا۔ اب چونکہ اس کی منزل نزدیک آچکی تھی، گویا لیزا کا شکریہ ادا کرنے کا وقت آچکا تھا۔
اس نے دل میں ارادہ کیا تھا، وہ اٹلی سے واپس جانے سے قبل لیزا کو کوئی بہت اچھا اور قیمتی تحفہ دے کر جائے گا۔ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے

نہیں، یہ تو بہت چھوٹی سوچ ہوتی، مگر اسے یہ ضرور بتانے کے لیے کہ وہ اس کے خلوص اور دوستانہ رویے کی دل سے قدر کرتا ہے۔
"تمہارا بہت شکریہ لیزا! تم آج حقیقت میں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنی ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نیپلز ٹھیک وقت پر پہنچ پایا ہوں۔"
اس نے تشکر کے احساس سے لبریز الوداعی جملے بولنے شروع کیے ہی تھے کہ لیزا گاڑی کو ایک بار کے پاس لا کر روکتی ہوئی بولی۔
"ابھی کہاں سے شکریہ آگیا؟ جب ہم روما واپس پہنچ جائیں گے تب میرا شکریہ ادا کرنا۔"
"تم یہاں رکو گی؟ [illegible] دیکھو میری دونوں طرف کی ٹرین کی سیٹیں [illegible] ہیں۔ میں شام میں اپنے طے ہوئے پروگرام کے مطابق Velocita Alta سے روم جاؤں گا۔"
"اور میں اتنی لمبی ڈرائیو، وہ بھی خالی پیٹ کر کے واپس روما روانہ ہو جاؤں؟ تم نے مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے، مسٹر سکندر؟" میں نے ابھی ناشتا کرنا ہے، کچھ دیر آرام کرنا ہے، پھر جاؤں گی واپس۔ تمہیں ساتھ لے کر، مجھے ڈر ہے، کہیں تم پھر سے اپنی ٹرین مس کر دو۔"
لیزا اسے جواب دے کر گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی۔
"آجاؤ ناشتا کر لیتے ہیں، جلدی سے۔ پھر تمہاری میٹنگ کا ٹائم ہو جائے گا۔"
وہ مسکرا کر کہتی گاڑی سے اتر گئی تھی۔ لیزا کا انداز اٹل تھا، گویا وہ اسے ساتھ لے کر ہی واپس جائے گی۔
وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں گزارا تھا۔ جہاں بار کا مطلب وہ جگہ تھی جہاں شراب نوشی کے لیے جایا جاتا تھا۔ اٹلی آکر اسے پتا چلا تھا کہ یہاں بار کا مطلب امریکہ والے بار سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں بار کا مطلب وہ جگہ تھی جہاں اٹالینز صبح اپنے کام پر جانے سے پہلے کافی پینے اور ناشتا کرنے آیا کرتے تھے، اسی طرح شام یا رات کے اوقات میں بھی یہاں زیادہ تر اٹالینز کافی پینے ہی کے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
SOHNI HAIR OIL
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
نئے بال اگاتا ہے۔
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید۔
ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت =/100 روپے
سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/100 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔
2 بوتلوں کے لیے .... =/250 روپے
3 بوتلوں کے لیے .... =/350 روپے
نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

http://www.pakfunplace.com

لیے میزوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ بار ہی سے لوگ اپنے روزمرہ استعمال کے دودھ کے ڈبے اور بوتلیں خرید اکرتے تھے۔ یہ بارز اٹالین سوشل لائف کا ایک اہم حصہ تھے۔ وہ جتنے دنوں سے روم میں تھا، روزانہ آفس جاتے وقت راستے میں پڑتے ایک بار پر لوگوں کو سینڈوچ، پیسٹری، ڈونٹ کے ساتھ جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ جلدی ان کے اپنے کام پر پہنچنے کی عجلت کو ظاہر کیا کرتی تھی۔ وہ دونوں اندر آگئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے جو بار ٹینڈر کھڑا تھا۔ لیزا نے اس کو دو سینڈوچز اور دو کپ کافی کا آرڈر کیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ میزوں پر بیٹھے کافی اور پیسٹری یا سینڈوچز کھا رہے تھے، جبکہ زیادہ تعداد میں لوگ کاؤنٹر کے سامنے ہی کھڑے جلدی جلدی اپنا ناشتا نمٹانے میں مصروف تھے۔ وہ اور لیزا ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔

"تم پلیز اپنی سہولت کے حساب سے واپس چلی جاؤ۔ میری میٹنگ پتا نہیں کتنے گھنٹے چلے؟" وہ سینڈوچ کھاتے ہوئے اس سے بولا۔ وہ اسے اپنی وجہ سے مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

"سینئور سکندر! میں کوئی بھی کام ادھورا نہیں کرتی، یہ میری عادت ہے۔ تمہیں ساتھ لے کر آئی ہوں تو اب ساتھ واپس لے کر بھی جاؤں گی۔ ایسی دکھی شکل مت بناؤ۔ میں آج کافی سالوں بعد نیپلز آئی ہوں۔ تمہاری بدولت اگر یہاں آہی گئی ہوں تو تھوڑا وقت یہاں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تک تم اپنی میٹنگ میں مصروف ہوگے میں یہاں کی کچھ آرٹ گیلریز کو وزٹ کرلوں گی۔ Napoletana پزا کھا لوں گی۔ بڑا عرصہ ہوگیا مجھے نیپلز کا پزا کھائے ہوئے۔"

وہ اسے یہاں نہ رکنے کے لیے اب مزید کچھ بھی کہہ نہیں سکتا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اپنے اس مختصر ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ لیزا نے اسے اس کمپنی کے آفس کے سامنے اتار دیا تھا۔

"جب تمہاری میٹنگ ختم ہوجائے تو مجھے کال کر دینا۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے بولی تھی۔

وہ لیزا پر سے اپنی سوچ کو ہٹاتا ہوا بلڈنگ کے اندر داخل ہوگیا تھا کہ سردست اس کے لیے سب سے اہم چیز اس کی میٹنگ تھی۔

☼ ☼ ☼

میٹنگ ختم ہونے پر اس نے لیزا کو کال نہیں کی تھی۔ اسے یہ بات ہی بہت غلط محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اپنے دیگر کام چھوڑ کر یہاں نیپلز میں اس کی خاطر رکی ہوئی تھی۔ مگر لیزا نے خود ہی اسے فون کرلیا تھا۔

"ختم ہوگئی میٹنگ؟"

"ہاں۔" وہ آج صبح سویرے سے اس کے احسان لیتا شرمندہ سے شرمندہ تر ہوتے چلا جارہا تھا۔

"آجاؤ باہر، میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔" وہ فوراً" ہی باہر آگیا تھا۔

"تم یہاں کب سے میرا انتظار کررہی ہو؟"

"پندرہ بیس منٹ ہوئے ہیں مجھے آئے ہوئے زیادہ دیر سے نہیں کھڑی۔ جتنی دیر تمہاری میٹنگ چلی ہے میں نے دو آرٹ گیلریز وزٹ کرلیں۔ ایک دو جگہیں اور بھی جانے کا موڈ تھا، بچپن کی یادیں تازہ کرنے کا مگر میں نے سوچا وہاں کہیں دیر نہ لگ جائے۔ پھر بلاوجہ تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے گا۔"

وہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔

"تمہاری میٹنگ کیسی رہی؟"

"بہت اچھی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہوگیا۔" وہ پرسکون انداز میں بولا۔ لیزا کے چہرے پر خوشی بھرا تاثر ابھرا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوگیا۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

اس نے میٹنگ کے اچھے انداز میں ہوجانے پر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی فوراً" اس کی طبیعت بھی پوچھی۔ ابھی وہ اس سوال کے جواب میں کچھ بھی

نہ بولا تھا کہ وہ فوراً" سنجیدگی سے بولی۔

"اگر یہ پرسنل سوال نہیں اور تم جواب دینا چاہو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔"

وہ اسے اس کی کسی بات جتا رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"نہیں، یہ پرسنل سوال نہیں۔ میری طبیعت ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مگر صبح سے کافی بہتر ہے۔ اصل میں مجھے cervical pain ہو رہا تھا۔"

"اوہ تب ہی تم اتنی تکلیف میں لگ رہے تھے۔ تمہاری شکل دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ فکر سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ اس بار جواباً" کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

"تمہاری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ورنہ میں نے سوچا تھا، تمہیں نیپلز کی ایک دو خوب صورت جگہیں دکھاؤں گی تاکہ آئندہ تم نیپلز کو صرف منظم جرائم کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کے خوب صورت کوسٹل ایریا اور اس کی history rich (تاریخی اہمیت) کے حوالے سے بھی یاد رکھو۔" وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔

"تم نے میری بات دل پر لے لی۔ مجھے یقین ہے نیپلز بہت خوب صورت شہر ہے۔ میں نیپلز پہلی بار آیا ہوں مگر میں نے کئی موویز میں نیپلز کی کافی خوب صورت جگہیں دیکھ رکھی ہیں۔" لیزا اس کا جواب سن کر مسکرائی تھی۔

"چلو پزا کھاتے ہیں۔ نیپلز آکر تم نے یہاں کا پزا نہیں کھایا تو یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہو جائے گی۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دنیا بھر میں مقبول یہ ڈش نیپلز میں غریبوں کی خوراک کے طور پر تیار کی گئی تھی، آج سوچو تو کس قدر عجیب ہوتا ہے۔"

وہ اور لیزا نیپلز کی ایک خوب صورت پتھروں سے بنی سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے باہر میز پر بیٹھے پزا کھا رہے تھے۔ باہر لگی میزوں پر ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ بیٹھے تھے جن میں کچھ مقامی اور کچھ ٹورسٹ تھے۔ یہ نیپلز کا وہ حصہ تھا جو تاریخی عمارتوں سے بھرا تھا، ہر دوسری بلڈنگ کم سے کم بھی دو تین سو سال پرانی تھی۔ جس ریسٹورنٹ میں وہ پزا کھا رہے تھے لیزا بتا رہی تھی کہ وہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل اور بہت قدیم تھا۔

"ہاں۔ نیپلز میں جب خوراک کی کمی ہوگئی تھی۔ غربت بہت بڑھ گئی تھی۔ تب غریب گھریلو عورتوں نے اپنے بچوں اور دیگر افراد خانہ کی خوراک کے لیے جو کچھ ان کے پاس دستیاب تھا اس سے کھانا بنانا شروع کیا تھا۔ انہوں نے میدہ، اولیو آئل، ٹمیٹر اور چند ہربس (herbs) کو اپنے گھروں میں موجود تندور میں بیک کرکے دنیا کا سب سے پہلا پزا تیار کیا تھا۔"

لیزا اس کی بات کے جواب میں پزا کے دریافت ہونے کی ہسٹری بیان کرنے لگی تھی۔

"آج بھی سارے اٹلی میں نیپلز کا پزا بیسٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔" لیزا اسے بتا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح کسی بھی طرح کے گوشت کے بغیر والا پزا کھا رہی تھی۔ شاید وہ گوشت کی دلدادہ نہیں تھی۔ پزا تو مزے کا تھا، ساتھ آس پاس کا ماحول بھی بڑا زندگی سے بھرپور سا تھا۔ آس پاس سے گزرتے مقامی لوگ، ٹورسٹس، بندہ اکیلا بھی بیٹھا ہو تو بور نہ ہو۔ تاریخی عمارتوں کے درمیان گھری یہ جگہ واقعی دیکھے جانے اور وقت گزارے جانے کے لائق تھی۔

☼ ☼ ☼

جو کچھ زندگی اب تک اس کے ساتھ کرتی آئی تھی وہی ایک بار پھر دہرایا گیا تھا۔ وہ نہ سکندر کو ہرا سکتا تھا نہ ہی اس کے برابر آسکتا تھا۔ وہ نمبر ون تھا اسے ساری زندگی دوسرے نمبر ہی پر آنا تھا، اتنی سی خواہش کی تھی اس نے کہ سکندر کی طرح اس کا بھی ہارورڈ میں داخلہ

http://www.pakfunplace.com

ہو جائے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا' بے تحاشا محنت کی تھی' راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا تھا' مگر وہ سکندر کے مقابلے میں پھر ہار گیا تھا' جہاں سکندر کو رسائی نصیب ہوئی تھی وہاں اس کے قدم پہنچ نہ سکے تھے۔

شہریار خان کو اس کے ہارورڈ میں داخلہ نہ مل سکنے کا زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بچپن کی باتیں تھیں جب وہ اسے سکندر کی مثالیں دے کر اس جیسا high achicever بننے کی تاکید کیا کرتے تھے اب شاید وہ اس سچائی کو تسلیم کر چکے تھے کہ ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا ان صلاحیتوں اور قابلیت سے محروم ہے جو پہلی پوزیشن لینے والوں کے پاس ہوتی ہے' جو سکندر شہریار کے پاس ہے۔

وہ ذہین ہے مگر غیر معمولی ذہین نہیں' وہ قابل ہے مگر غیر معمولی قابلیت کا حامل نہیں' وہ محنتی ہے مگر اس قدرتی خوبی سے محروم ہے جس کے بل پر لوگ دنیا فتح کر لیا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سکندر شہریار نہیں۔ شہریار خان اس کی تعلیم پر بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کر رہے تھے جتنا سکندر کی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے حوالے سے انہوں نے کچھ پلان نہیں کر رکھا تھا' مستقبل کی ساری پلاننگ انہوں نے سکندر کی کر رکھی تھی۔ کس سال اس کی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز پوری ہوں گی اور کس پوزیشن کے ساتھ ہوں گی' پھر کس سال وہ لاء کا امتحان پاس کرے گا اور کتنے امتیازی نمبروں کے ساتھ کرے گا' پھر وہ کس جگہ ملازمت سے اپنے شاندار و بے مثال پروفیشنل کیریئر کا آغاز کرے گا۔ لہٰذا اس کا ہارورڈ میں ایڈمیشن نہ ہونا ان کے لیے کوئی دکھ کی خبر نہیں بنا تھا' اس کا کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا' سکندر نے اسے اس کے داخلے کی مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا۔

"مبارک ہو زین۔"

"کس بات کی مبارک باد؟" اس نے خنک لہجے میں پوچھا تھا' اسے لگا تھا سکندر اس پر فخر کرنے اور اس مذاق اڑانے کے لیے اسے فون کیا ہے۔ دیکھ لو جہاں میں ہوں وہاں تمہاری رسائی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

"تمہارا اتنی اچھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے اس بات کی مبارک باد۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی بہت اچھی ہے زین۔"

"مگر ہارورڈ سے کم۔" اسے لگا دل ہی دل میں اس پر ہنستے سکندر نے یہ ضرور کہا ہو گا۔ اسے سکندر کی خوشی تمسخرانہ اور اس کی ہنسی اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا' وہ سکندر کے لبوں کی ہنسی اور اس کی زندگی کی ہر خوشی اس سے چھین لے۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں واپسی کے سفر پر تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا تھا۔

"میری وجہ سے تمہارا آج کا پورا دن ضائع ہو گیا۔ یقیناً" تمہاری آج کے دن کے لیے اپنی بہت سی مصروفیات ہوں گی۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اب اس کے درد میں بہت کمی تھی۔

"میں آج کل اپنی ویکیشن (چھٹیاں) انجوائے کر رہی ہوں۔ لہٰذا وقت کی کوئی کمی نہیں۔ اچھا ہوا تمہارے ساتھ آ گئی' اس بہانے کئی سال بعد میں نے نیپلز دیکھ لیا' میں یہاں آخری بار شاید چھ سات سال پہلے آئی تھی۔"

وہ جتنا اس کا ممنون اور اس کا احسان مند ہو رہا تھا وہ اتنا ہی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ آ کر اس نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ وہ کہاں جانا چاہتی ہے' وہ آج کل اپنی چھٹیاں انجوائے کر رہی ہے اس نے پوچھا نہیں۔

پھر ڈھائی گھنٹے کا سفر طے کیا گیا تھا۔ وہ روما کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ لیزا اس کی طرف دیکھ کر خیر مقدم کرنے والے انداز میں مسکرا کر اٹالین میں بولی۔

a roma la citta eterna"

"Benvenuto

وہ اس کے اٹالین جملے پر مسکرایا تھا۔

"La citta eterna" تو سمجھ میں آ گیا۔ باقی جملے کا مطلب بتاؤ۔"

to roma the cternal city"

"Welcome

(لافانی شہر روما میں خوش آمدید)

وہ بڑے جذب سے بولی تھی۔ اس نے بغور لیزا کو دیکھا تھا۔

"تم اپنے شہر سے بہت پیار کرتی ہو' ہے نا؟"

"ہاں' بہت' مجھے اپنے روما سے عشق ہے۔ یہاں کی سڑکیں' یہاں کی گلیاں' یہاں قدم قدم پر بکھری ہسٹری۔ میں ان سب کی عاشق ہوں۔"

"حالانکہ تم یہیں کی رہنے والی ہو۔ یہاں کی ہسٹری' آرٹ ہو یا آرکیٹیکچر سب کچھ ہر وقت ہی تو تمہارے ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ عموماً" تو خوب صورت شہروں اور تاریخی جگہوں پر رہنے والے لوگ ان سب کو صبح شام دیکھ دیکھ کر فار گرانٹڈ (for granted) لینے لگتے ہیں۔"

وہ اپنے شہر سے اس کی والہانہ محبت محسوس کر کے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں اپنے شہر کی کسی بھی چیز کو for granted نہیں لیتی۔ میں روما کی ہسٹری' آرٹ' آرکیٹیکچر کسی بھی چیز سے بور نہیں ہوتی۔"

لیزا نے بولتے بولتے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی عادت کے مطابق مسکرا نہیں رہی تھی بلکہ قدرے سنجیدہ تھی۔

"پتا ہے سکندر! جب کوئی چیز ہم سے چھن جاتی ہے تب ہمیں اس کی زیادہ قدر ہو جاتی ہے۔ اگر میں ہمیشہ روما میں رہتی تو شاید اس کی یوں قدر نہ کرتی جتنی آج کرتی ہوں کیونکہ اب یہ ہر وقت میرے سامنے نہیں ہوتا۔"

اس نے لیزا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا احساس ابھرتے دیکھا۔ وہ جس روز سے اس سے ملا تھا اس نے اس لڑکی کو صرف بے تحاشا بولتے اور ہنستے ہی دیکھا تھا۔ نجانے وہ اپنے اندر کس طرح کا دکھ بسائے بیٹھی تھی۔ کیا دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں؟ اور کسی کو نہیں مگر کم از کم اسے ایسا لگتا تھا اور خوشیاں بکھیرتی اس لڑکی کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ زندگی کو اس لڑکی کو تو خوشیاں دینی چاہئیں۔

آج صبح جب سے اس کے ساتھ تھا' اپنی عادت کے برخلاف کتنا زیادہ بولا تھا' کتنی بار مسکرایا تھا۔ وہ چند دنوں بعد جب روما سے واپس چلا جائے گا تب لاکھ وعدے کر لینے کے باوجود بھی اس انجان لڑکی سے کبھی کوئی رابطہ نہیں رکھے گا مگر پھر بھی وہ اس اجنبی لڑکی کو اس لیے ہمیشہ یاد رکھے گا کہ اس کی وجہ سے آج پورے بارہ سالوں بعد وہ اس طرح مسکرایا ہے' اتنا زیادہ بولا ہے۔ لیزا اس کی سوچوں سے انجان اسے بتا رہی تھی۔

"میں تیرہ سال کی تھی جب میرے ممی پاپا کی ڈائی ورس ہو گئی تھی۔ علیحدگی کے وقت ان دونوں کے درمیان' جس طرح باقی تمام چیزوں کا بٹوارہ ہوا تھا' اسی طرح ہم دونوں بہنوں کا بھی۔ اس منصفانہ بٹوارے میں' میں پاپا کے حصے میں آئی تھی اور میری بہن ممی کے۔ میری ممی کا تو یہ ملک تھا' وہ یہاں سے کیوں جاتیں۔ میرے پاپا البتہ اٹالین نہیں تھے' انہوں نے یہاں کی صرف نیشنلٹی لے رکھی تھی۔ ممی سے علیحدگی کے بعد وہ یہاں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر لندن چلے گئے تھے۔ اور یوں سکندر! تیرہ سال کی عمر میں مجھ سے میرا روما چھن گیا تھا۔"

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولتے بولتے ایک پل کے لیے خاموش ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔

"میں یہاں سے گئی تو میرا دل یہیں رہ گیا تھا۔ میرا دل کبھی لندن کا نہ ہو سکا۔ میرا دل ہمیشہ یہیں رہا' میرے روما میں۔ میرے پاپا کا ملک تو نہ اٹلی تھا نہ انگلینڈ' ان کا ملک تو پاکستان تھا' سو وہ روم میں رہتے یا لندن میں ان کے لیے کچھ فرق نہ تھا۔ ان کی جذباتی

وابستگی تو ان دونوں میں سے کسی بھی جگہ سے نہیں تھی۔"

لیزا کی ساری بات میں اس کے لیے حیرانی کی بات اس کے والد کا پاکستان سے تعلق ہونا تھی۔ اسے پہلے دن سے لے کر آج تک کبھی ایک پل کے لیے بھی لیزا کے مکمل اٹالین ہونے پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار حیرت سے پوچھا تھا۔

"تمہارے والد پاکستان سے ہیں لیزا؟"

لیزا نے اس کی حیرت کو حیرت سے دیکھا پھر جیسے کچھ یاد کر کے اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"دیکھو ذرا ہم کتنے دنوں سے مل رہے ہیں مگر ابھی تک ایک دوسرے سے مکمل طور پر اپنا تعارف تک نہیں کروایا ہے۔"

بات مکمل کر کے پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی پھر کچھ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"ویسے ابھی تک تعارف ٹھیک سے نہ ہو پانے کی وجہ یہ بھی رہی کہ تمہیں پرسنل باتیں کرنا پسند نہیں ہے سو میں تمہارے تعارف سے محروم رہی اور تم اتنا روڈ ہو کر ملتے تھے کہ اپنے بارے میں بھی کبھی ڈھنگ سے کچھ بتا نہیں سکی۔"

وہ اس کی بدتمیزی اسے جتا رہی تھی اور آج مشکل وقت میں اس کی مدد کر کے اب اتنا حق تو وہ رکھتی تھی کہ اس کی بدتمیزی اور بداخلاقی کا ذکر کر سکے۔ وہ تھوڑا شرمندہ سا ہوا تھا۔ یہ بالکل سچ تھا کہ آج تک اس نے اسے یہ موقع دیا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا مکمل تعارف کرا پاتی۔ وہ شرمندگی کے حصار سے نکلنے کے لیے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری شکل صورت سے لے کر نام تک کسی بھی چیز سے مجھے کبھی یہ نہیں لگا کہ تم اٹالین اور کرسچن نہیں ہو۔"

"لیزا Hebrew (عبرانی) نام ہے اور یہ نام مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کی ہوئی۔"

تو لیزا پاکستانی اور مسلمان باپ اور اٹالین اور کرسچن ماں کی بیٹی تھی۔ اسے اس انکشاف پر حیرت ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی حیرت کا اظہار کر نہیں رہا تھا۔ ایسا کرنا اسے بچکانہ پن لگ رہا تھا۔

"باقی میرا تعارف یہ ہے کہ میں لندن میں رہتی ہوں۔ میں نے لندن سے پینٹنگ میں ماسٹرز کیا ہے۔ میں وہاں رائل کالج آف آرٹس میں پینٹنگ لینڈ اسکیپ اور اسٹل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ پینٹنگ میرا پیشن (عشق) بھی ہے۔ پروفیشن بھی۔ جاب سے بچ جانے والے ٹائم میں میں پینٹنگز بناتی ہوں، اپنی ایگزیبیشن کی تیاریاں کرتی ہوں۔ اپنی لائف میں کافی ممکن کافی مصروف رہتی ہوں۔ مگر میں جتنی بھی مصروف ہو جاؤں، سال کے یہ دو مہینے لازماً روما میں گزارتی ہوں۔ اپنے اس روٹین پر میں اٹھارہ سال کی عمر سے کاربند ہوں۔ میں نے روما سے جا کر بھی اپنا رشتہ کبھی یہاں سے ٹوٹنے نہیں دیا، اسی لیے میرے اسکول کے دوست، بچپن کے ملنے جلنے والے ان سب سے میرا آج بھی یہاں پر وہی پہلے جیسا تعلق ہے۔ میں آج بھی لندن سے زیادہ روما ہی میں خود کو ایٹ ہوم محسوس کرتی ہوں۔ میں یہاں ایسے آتی ہوں جیسے کوئی اپنے گھر آتا ہے، شاید اسی لیے تمہیں میں مکمل اٹالین بھی لگی تھی اور روما میرا گھر بھی لگتا ہے۔"

وہ دونوں اب روم کی مصروف اور ٹریفک سے بھری سڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔ اس کا ہوٹل اب نزدیک ہی تھا۔ مگر ٹریفک میں پھنسنے سے کچھ وقت لگ رہا تھا۔

"میرا تعارف تو ہو گیا اب تم اپنے بارے میں بتاؤ؟" وہ دونوں اس بڑے ٹریفک میں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تب لیزا اس سے بولی۔

"میں؟" اس نے ایک پل کے لیے سوچا، پھر سنجیدگی و بردباری سے بولا۔

"میں نے امریکہ سے لاء میں بیچلرز ڈگری لی ہے۔ روبرٹو بی کی کمپنی کے روما میں واقع ہیڈ آفس میں لیگل ایڈوائزر ہوں۔"

وہ جیسے ہی اپنے بارے میں مختصر لفظوں میں بول کر

خاموش ہوا لیزا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"اتنا تفصیلی تعارف؟ میں سنتے سنتے تھک گئی۔ تم بولتے بولتے نہیں تھکے؟"

وہ اس کا طنز سمجھ رہا تھا مگر جواباً خاموش رہا تھا لیزا آنکھوں میں شرارتی سی چمک لیے مسکرا کر مزید بولی۔

"تم اگر اپنے تعارف میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی اور بولتے تو میں بہت حیران ہوتی کیونکہ میں یہی توقع کر رہی تھی کہ سینور سکندر نے مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتانا ہے۔"

وہ اس کے صاف گو انداز پر تھوڑا کھسیانا سا ہوا تھا۔ گاڑی اس کے ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ خود کو اس کھسیاہٹ سے نکال کر اس نے ممنونیت سے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ اچھے لفظوں اور بہت اچھے انداز میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

"لیزا! بہت بہت شکریہ۔ تم نے میرے لیے بہت زحمت اٹھائی ہے۔"

وہ مزید بھی کچھ اور جملے بولنا چاہتا تھا مگر لیزا نے اسے اس کی بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"سینور سکندر! اس طرح کی رسمی باتوں سے مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے اور ویسے بھی آپ کے اوپر آپ کا روڈ انداز زیادہ جچتا ہے۔ ساری دنیا سے ناراض، غصے میں بہت کم بولتے ہوئے۔"

وہ ہنس کر اسی بے تکلفانہ و شریر انداز میں بولی تھی اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دیا تھا۔ لیزا نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

"کیا اب ہم دوست ہیں؟"

اس نے مصافحہ کے لیے بڑھا لیزا کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ہاں۔" وہ روم سے جا کر زندگی بھر اس سے ملے گا نہیں اس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھے گا تو دوستی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ مگر وہ نا بول کر اس کا دل بھی نہیں توڑ پایا تھا "او کے سینور سکندر تمہاری اس دوست کی تمہیں advice (نصیحت) یہ ہے کہ اپنے ہوٹل روم میں جا کر اب میڈیسن لے کر صرف اور صرف آرام کرنا کیونکہ تمہاری طبیعت مجھے ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ سینور سکندر کا لفظ بولا بڑے [illegible] کرتی تھی۔ وہ اس کے اس انداز پر [illegible] رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے ہوٹل روم میں آ کر ابھی جوتے ہی اتار پایا تھا کہ اس کے موبائل پر کسی کی کال آنے لگی۔ اس کا موبائل ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ اٹھ کر میز کے پاس آیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ یہ کال آمنہ کی تھی۔ اس کے چہرے کے سخت سے تاثرات یکلخت ہی نرمی میں تبدیل ہوئے تھے۔ اس نے بہت جلدی کے عالم میں کال ریسیو کی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے عاری نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہی وقت میں بہت سے جذبات تھے۔ محبت، خوشی، اداسی، شکوہ، رنج، وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
زرد موسم
راحت جبیں

قیمت -/600 روپے
32735021

http://www.pakfunplace.com

مگائرہ انور

سکون

"امی! ابو جان کب واپس آئیں گے؟"

یہ وہ سوال تھا جو ہر پانچ منٹ کے بعد تینوں میں سے کوئی ایک بچہ ضرور آکر اس سے پوچھتا۔

وہ پیار سے اس کے گال چھوتی اور مسکرا کر تسلی دیتی۔ "بس ابھی آجائیں گے چندا۔"

اور وہ بچہ امید کے ٹمٹماتے ہوئے دیے کو آنکھوں میں لیے باہر چلا جاتا۔ لیکن اس بار اسماء کے یہ سوال کرنے پر وہ جھنجلا گئی۔

"کہا ہے نا آجائیں گے ابھی کیوں تنگ کر رہی ہو مجھے اسماء؟"

اس نے کہہ تو دیا، لیکن اسے امید نہیں تھی کہ حسان ابھی واپس آجائے گا یا اگر آبھی گیا تو اس کے پاس کچھ ہوگا بھی نہیں۔ اس بار اسماء بھی مکمل مایوس ہو کر لوٹی تھی۔

"یہ کیا طریقہ ہے بچوں سے بات کرنے کا؟" اماں نے اسے ٹوک دیا۔

"تو کیا کروں میں اماں! دوپہر سے بھوک بھوک کی رٹ لگا رکھی ہے ذرا سی بھوک نہیں برداشت کر سکتے یہ لوگ۔" اس کی بےزاری عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔

"وہ بچے ہیں زینب! اور بچے بھلا کب بھوک برداشت کرتے ہیں؟"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس وقت سے بہلا تو رہی ہوں ان کو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ امید مجھے بھی نہیں ہے کہ کچھ انتظام ہو سکے گا۔"

"کیسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہو، میں کہہ رہی ہوں نا، ابھی آجائے گا حسان۔"

"اگر کوئی انتظام ہونا ہوتا اماں! تو اب تک ہو چکا ہوتا۔"

"بہت ناشکری ہوتی جا رہی ہو تم زینب۔ ایک چھوٹی سی آزمائش ہے یہ بیٹا! صبر سے کام لو، اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے، اتنا اچھا شوہر دیا ہے، فرماں بردار بچے دیے ہیں۔ اتنی اچھی نوکری کر رہا ہے حسان، پورا مہینہ آرام سے گزر جاتا ہے، یہ تو اچانک وہ اتنا شدید بیمار ہو گیا، دس دن کام پہ نہ جا سکا، اس لیے تنخواہ کٹ گئی اور تم کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ آج سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

اس نے اماں کی پوری بات سنی ہی کب تھی جو جواب دیتی۔ اس کی سوئی تو اسی بات میں اٹکی تھی کہ "پورا مہینہ آرام سے گزر جاتا ہے" پورا مہینہ وہ کس طرح کنجوسیاں کر کر کے گزارتی تھی یہ تو وہ ہی جانتی تھی۔ اگر یہ آرام ہوتا ہے تو مشکل کیا ہوتی ہے۔

"اذان ہو رہی ہے زینب! نماز پڑھ لو جاکر۔" اماں نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"جی اماں" کہتے ہوئے وہ ... باہر نکل آئی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ آسمانوں پر اکا دکا بادلوں کے ٹکڑے ... صحن میں لگے ہوئے آم کے درخت سے ... ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور پھر ہوا کے ... سے گھر میں ناچتے پھر رہے تھے۔ صحن کے ... میں اسما اور اویس کسی کھیل میں مشغول تھے جبکہ دس سالہ سائرہ برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھی شاید اسکول کا کام نمٹا رہی تھی۔ دور کہیں سے اب بھی اذان کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

"امی جان! ابو آگئے ہیں۔" ابھی اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ عقب سے اسماء کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بیٹا! اللہ تو اتنا رحیم ہے، مانگنے سے پہلے ہی عطا کر دیتا ہے۔ بس ہم انسان ہی بےصبرے ہیں۔"

اس کو بےساختہ اماں کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔ وہ شرمندہ ہو گئی اور ساتھ ہی اللہ کا شکر بھی ادا کرنے لگی۔

برآمدے میں آکر دیکھا تو شاپر میز پر پڑے اسی کے منتظر تھے۔ شاپر اٹھا کر کچن میں چلی آئی۔ جلدی جلدی روٹیاں پکائیں، ساتھ ساتھ سالن تیار کیا۔ پھر کھانا دسترخوان پر لگا کر سب کو بلایا۔ سب نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ کھانا کھاتے ہوئے تینوں بچوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ اس کے اندر ڈھیروں سکون اتر گیا۔

"سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا۔"

کھانے کے بعد اماں نے بلند آواز میں دعا پڑھی۔ پھر ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔ زینب نے برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔ عشاء کا وقت ہو رہا تھا سو پہلے نماز پڑھی پھر بچوں کو سلایا اور پھر کچن میں آکر برتن دھونے لگی۔ وہ اپنے سارے کام وقت پر نبٹا لینے کی عادی تھی۔ کبھی آج کا کام کل پر نہ چھوڑتی۔ برتن دھو کر وہ کمرے میں آگئی اور بستر پر گرتے ہی منٹوں میں نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح کا وقت اس کے لیے سب سے کٹھن ہوتا تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ نماز پڑھ کر سوتی تو پھر امی کی ڈانٹ ڈپٹ تو کبھی مار کھا کر ہی بستر چھوڑتی۔ اب بھی حالات زیادہ مختلف نہ تھے۔ حسان کے دس مرتبہ جگانے پر وہ بمشکل آنکھیں کھولتی اور پھر اس کے منت سماجت کرنے پر دل پہ جبر کرتی اور بستر چھوڑ ہی دیتی۔ منہ دھو کر پہلے اپنی نیند بھگاتی اور پھر بچوں کی شامت آجاتی۔ بچے بھی اس کی طرح نیند کے رسیا تھے۔ ایک کو اٹھا کر جب تک دوسرے کو جگاتی پہلا مزے سے سو رہا ہوتا۔ بچوں کے یونیفارم، جوتے، جرابیں اور بیگ وہ رات کو ہی تیار کر کے رکھ دیتی۔ بچوں کو وین میں بٹھانے کے بعد وہ آکر حسان کا ناشتہ بناتی اور ساتھ

http://www.pakfunplace.com

ہی اماں کو بھی ناشتہ دیتی اور حسان کے جانے کے بعد کہیں وہ آرام سے بیٹھتی۔ ناشتہ کرنے کے وہ گھر کے کاموں میں جُت گئی۔ سارے گھر کی صفائی کے بعد صحن میں جھاڑو دی۔

"آج حسان کو کہہ کر لازمی اس کو کٹوانے کا بندوبست کرتی ہوں۔" درخت کے پتے اکٹھا کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

کچے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا تو مٹی کی بھینی بھینی خوشبو زمین سے اٹھنے لگی۔ اسے بے ساختہ اپنا بچپن یاد آگیا۔ ان کے گھر کا تو سارا صحن ہی کچا تھا۔ جب بھی جو بارش ہوتی یا پانی کا چھڑکاؤ کرتے تو مٹی کی دل فریب خوشبو پورے گھر میں پھیل جاتی۔ وہ بڑی فرصت سے کرسی صحن میں رکھ کر بیٹھ جاتی اور جب تک خوشبو ختم ہوتی' وہ وہاں سے ہلتی بھی نہیں۔ کیسے بے فکری کے دن تھے وہ۔

اماں کو سارے گھر کا کام کرتے دیکھتی تو بہت گھبراتی یہی وجہ تھی کہ وہ شادی کے نام سے ہی چڑتی تھی لیکن وہ اماں ہی کیا جو بیٹی کی سن لیں۔ سو اس کے لاکھ نا نا کرنے پر بھی شادی کرکے ہی چھوڑی۔

شروع میں تو بہت گھبرائی تھی لیکن پھر حسان کی اماں نے اسے سہارا دیا۔ وہ بھی اس کی اماں کی طرح نرم مزاج اور سدا کی صابر عورت تھیں۔ اس نے کبھی ان کو کسی مشکل میں گھبراتے یا اللہ سے شکوہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اللہ پر کامل یقین رکھتی تھیں اور دوسروں کو بھی ہمیشہ اسی کی تلقین کرتی تھیں۔

لیکن زینب میں صبر کی بہت کمی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرا جانا اس کی بچپن کی عادت تھی۔ اماں کی صحبت کا کچھ تو اثر ہوا تھا لیکن اب بھی وہ زیادہ دیر صبر نہیں کر پاتی تھی۔

"بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے زینب! کھانا بنالو۔" اماں کی آواز پر چونک گئی۔

"جی بس بنانے لگی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔

ادھر کھانا پکا' ادھر بچے بھی پہنچ گئے۔ بچوں کے کپڑے تبدیل کروا کر اس نے کھانا لگایا۔ کھانا کھا کر روز کی طرح بچے بے سدھ ہو کر سو گئے اور وہ برتن دھونے بیٹھ گئی۔

"کچھ آرام بھی کر لیا کرو زینب! ہر وقت کام میں لگی رہتی ہو۔" اماں نے کمرے میں جاتے ہوئے ہدایت دی۔

"جی اماں! یہ برتن دھولوں۔" وہ کہتے ہوئے جلدی جلدی برتن دھونے لگی۔ اچانک کسی بچے کی رونے کی آواز آئی۔

"ابھی تو سوئے تھے بچے۔" وہ حیران ہوتی کمرے کی طرف آئی لیکن وہاں تو مکمل خاموشی تھی۔ وہ چپ چاپ باہر نکل آئی۔

"کون رو رہا ہے؟" اماں بھی کمرے سے نکل آئیں۔

"ساتھ والوں کا بچہ ہے شاید۔" اس نے اندازہ لگایا۔ آواز ساتھ والوں کے گھر سے آرہی تھی۔

"ذرا دیکھ تو جھانک کر' آخر ہوا کیا ہے؟" اماں پریشان ہو گئیں۔

وہ کرسی رکھ کر اس پہ کھڑی ہوئی اور دیوار کے پار جھانکا۔

"چپ کر جاؤ ورنہ ایک لگاؤں گی۔" نبیلہ تھپڑ دکھا کر بچے کو ڈرا رہی تھی۔ لیکن چپ ہونے کے بجائے بچے کے رونے میں شدت آگئی۔

"ارے اس کو کیوں ڈانٹ رہی ہو؟ بے چارہ صبح سے بھوکا ہے روئے نہ تو کیا کرے۔" کہنے والی غالباً نبیلہ کی نند تھی۔

"ہاں تو میں کیا کروں؟ اس کے باپ کو ہی پروا نہیں ہے۔" وہ بھڑک گئی۔

"کیا ہوا ہے زینب؟" اماں نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ کرسی سے اتر گئی۔

"اماں! نبیلہ کے گھر صبح سے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"اور ہمیں پتا بھی نہیں ہے۔ ہائے ہم سے اتنی بڑی غلطی ہوگئی۔ پڑوسی بھوکے ہیں اور ہم اپنا پیٹ

بھرتے رہے۔" اماں کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ "چلو زینب! جلدی سے رسوئی سے سامان لو اور ان کو دے آؤ۔ فی الحال ہم تو یہی کر سکتے ہیں' آگے اللہ مدد فرمائے گا۔"

"لیکن اماں۔۔۔" وہ ہچکچائی۔

"جلدی کرو زینب! کیا بات ہے؟" اماں نے اسے تذبذب میں کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

"ہم تو خود اتنی مشکل میں ہیں۔ تھوڑا سا ہی تو راشن پڑا ہے۔ مشکل مہینہ پورا ہوگا۔"

"یہ وقت یہ سب کچھ سوچنے کا نہیں ہے بیٹا! پڑوسی بھوکے ہیں تو ہم چین سے کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ کیا تم نے وہ حدیث نہیں سنی' "جو پڑوسیوں کی بھوک سے بے نیاز ہو کر شکم سیر ہو وہ کامل مومن نہیں۔" اور جہاں تک رزق کا سوال ہے تو بیٹا اس کی فکر تم نہ کرو۔ جب اللہ بندے کو پیدا کرتا ہے تو اس کے رزق کا ذمہ بھی خود لیتا ہے۔ جس کے نصیب میں رزق لکھا ہے وہ اسے مل کر رہتا ہے۔ کوئی کسی کے حصے کا رزق نہیں کھا سکتا۔ شاید اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعے سے ان تک ان کا رزق پہنچا رہا ہو۔ تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تمہیں نیکی کرنے کا موقع دیا ہے۔"

اماں کی باتوں نے اسے جی بھر کر شرمندہ کیا۔ وہ چپ چاپ کچن میں جا کر سامان اٹھانے لگی تاکہ جلد از جلد اپنی اس غلط سوچ کی تلافی کر سکے۔

☆ ☆ ☆

وہ انگلیاں موڑتے ہوئے بے چینی سے صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے قدموں کی تیزی اور آنکھوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"تھوڑی ہی دیر میں بچے آکر کھانا مانگیں گے' حسان! جلدی آجاؤ۔" وہ سوچتے ہوئے مزید پریشان ہوگئی۔ "مگر اس دن نبیلہ کی مدد نہ کرتی تو۔۔۔"

"یہ کیا سوچ رہی ہو زینب؟ تم نیکی کرنے پر پچھتا رہی ہو؟" کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ میں تو بس۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ میں اتنی بزدل کیوں ہوں؟ ذرا ذرا سی باتوں پر گھبرا جاتی ہوں۔" آج اس نے پہلے سے زیادہ خشوع و خضوع سے نماز پڑھی اور دعا میں اللہ سے صرف صبر اور پختہ ایمان مانگا۔

نماز پڑھ کر وہ باہر آئی تو سامنے کا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔

"ارے بیگم! دیکھتی ہی رہو گی یا کچھ پکاؤ گی بھی؟ بھئی جلدی کرو بہت بھوک لگی ہے۔ بچے بھی آنے والے ہوں گے۔" وہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔

"لیکن حسان یہ اتنا سب دال سبزی' پھل وغیرہ کیسے؟" اس نے بہ مشکل پوچھا۔

"بس اللہ نے مدد کردی اچانک ورنہ میں تو مایوس ہی ہو چلا تھا۔"

"پھر بھی کچھ تو بتائیں' یہ سب ہوا کیسے؟ کہاں سے آئے اتنے پیسے؟"

"فکر نہ کرو۔ کہیں ڈاکہ نہیں ڈالا میں نے۔" وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

"افوہ حسان! مذاق بند کریں اور ٹھیک ٹھیک بتائیں۔" وہ جھنجلا گئی۔

"اچھا بابا! بتاتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے' دو سال پہلے ہم نے خالہ زبیدہ کے بیٹے علی کو قرض دیا تھا؟" اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ مزید گویا ہوا۔ "بس وہ ہی ملا تھا آج بازار میں۔ کہنے لگا کہ شہر سے آکر اس نے ہمیں قرض لوٹانے کے لیے ڈھونڈا لیکن ہم نے تو گھر ہی تبدیل کر لیا تھا۔ لہٰذا وہ رقم اس نے اپنے پاس محفوظ کر لی اور آج ملنے پر لوٹا دی۔ اب جلدی سے کھانا بناؤ اور صبر نہیں ہوتا۔"

آخر میں پیٹ پکڑ کر التجا کرنے لگا۔ وہ مسکرا کر کچن میں چلی گئی۔ آج اللہ پر اس کا ایمان مزید پختہ ہو گیا تھا۔

بلاشبہ اللہ پر بھروسہ رکھو تو وہ امید سے بڑھ کر نوازتا ہے۔

☆

http://www.pakfunplace.com

ناولٹ

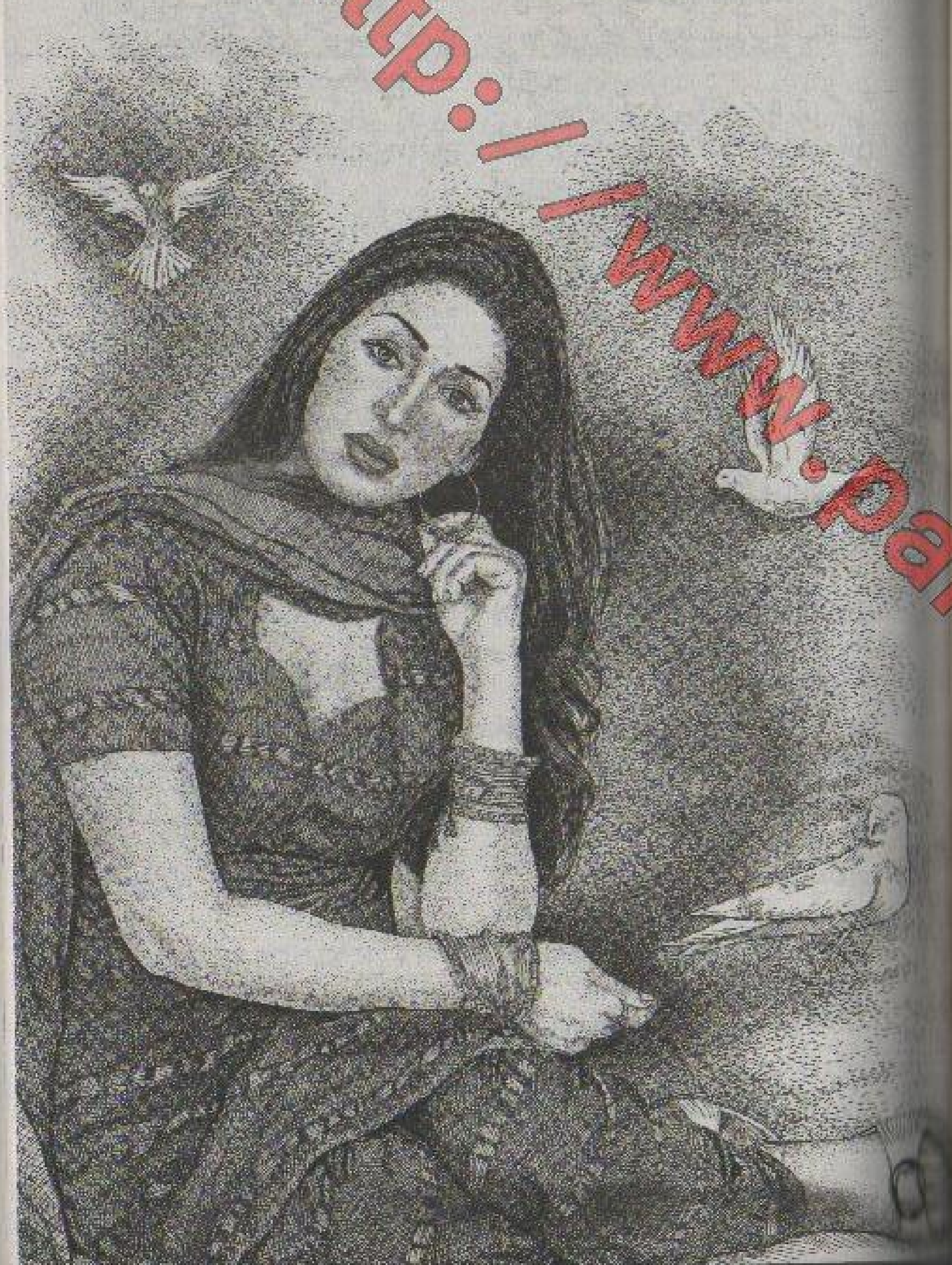

آسیہ رزاقی

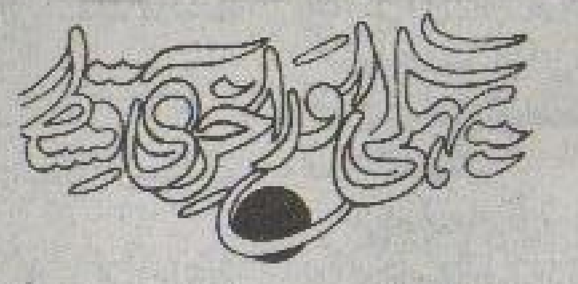

ایک دن ذکیہ آپا آگئیں، عرصے کے بعد، سب سے بڑی خالہ کی بیٹی تھیں۔ برسوں پہلے آئی تھیں۔ سب سے چھوٹی خالہ کی وفات پر، جو ہما کی امی تھیں، بہت کم زندگی ملی تھی انہیں۔ ذکیہ آپا کا پورا خاندان لاہور میں رہائش پذیر تھا۔ مصروفیات اور فاصلے ہی درمیان میں تھے۔ ورنہ سگے رشتے داروں سے انسان کبھی کبھار مل ہی لیتا ہے۔ یوں تو اوکاڑہ خاص دور نہ تھا۔

یہ لوگ یعنی اوکاڑے والے ہی لاہور جا سکتے تھے۔ شکوہ بے جا نہ تھا۔ خالہ کہہ نہ سکیں۔ انہیں بھی تو وقت کی کمی کا مسئلہ تھا۔

دراصل ذکیہ آپا کے والد بہت ہی امیر کبیر خاندان کے تھے۔ ان کی بیٹیاں بھی ان کے ہم پلہ لوگوں میں بیاہی گئی تھیں۔ معاشرت کا فرق، طبقاتی خلیج، بڑے شہر کی رہائش اور اب تو ان کے بھائی نے ایک کمپنی بھی بنالی تھی، جس میں سیکڑوں لوگ ملازم تھے۔ سنا تھا خوب ترقی کی ہے، جرمنی، انگلینڈ اور فرانس جا کر خوب پڑھ کر آئے تھے۔ خالہ بے چاری ملنا چاہتی بھی تھیں تو ان لوگوں کا ایڈوانس ماحول اور دولت کی ریل پیل ارادے میں مزاحم تھی۔ ہما کو تو اعتراض تھا۔

”بھئی ہم ان سے کچھ مانگنے تو نہیں جائیں گے۔ بس مل لیں گے، اور اگر وہ لوگ اپنی گاڑی میں ہمیں لاہور کی سیر وغیرہ کرادیں تو... کیا ہی بات ہو۔“

یوں خالہ بھی کوئی کم نہ تھیں۔ اچھا بڑا سا گھر، زمین کی آمدنی، خالو نے بھی اچھا خاصا کمایا تھا اور اب تو ان کا بیٹا بھی برسر روزگار تھا مگر پھر بھی وہ بڑے لوگوں سے

http://www.pakfunplace.com

ملتے ہوئے ہچکچاتی تھیں۔ ہما تو ماں کے بعد خالہ کے گھر آئی تو پھر کہیں گئی ہی نہیں۔ چند سال کے بعد ہی اس کے بے چارے ابا بھی فوت ہو گئے۔ تب تو کوئی لاہور والا نہیں آیا۔ اب تو یہی گھر تھا ہما کا۔

ہما بی اے کر کے گھر بیٹھی گرہستی کے ہنر سیکھ رہی تھی اور اب جو ذکیہ آپا آئیں تو حسب عادت خالہ نے ان سے بھی بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

"ذکو! کہیں کوئی اچھا لڑکا نظر آئے تو میری ہما کا خیال رکھنا، بڑی ذمے داری ہے مجھ پر۔"

اور تب سے ہی ذکیہ آپا کی نظریں ہما کا پیچھا کرتی نظر آئیں۔ وہ کہیں جا رہی ہے، کام کر رہی ہے، ذکیہ آپا کی نظریں اس پر جمی ہیں۔ وہ پریشان ہو گئی، پتا نہیں کیا کھوج رہی ہیں آنکھیں ان کی، ویسے وہ بہت بے فکری لاابالی لڑکی تھی۔ وہ نہ تو بہت غم زدہ ہوتی (کہ بھئی بے ماں، باپ کی ہے) نہ ہی پریشان۔ (کہ اب کیا ہو گا، کون اس کا سہارا ہو گا، وغیرہ) اسے خالہ کے گھر میں ماں، باپ کا پیار بھی ملا، بہن، بھائی کی محبت بھی، اس کے زیادہ مطالبات تھے، نہ نخرے۔

ذکیہ آپا اپنی خالہ سے ملنے، ان کے بچوں سے ملاقات کے لیے آئی تھیں کہ بھئی صورت شناسا تو ہوں۔

پھر وہ اپنی لمبی چمکیلی کار میں جیسے آئی تھیں، ویسے ہی چلی گئیں۔ سب کے لیے تحائف لائی تھیں، کیونکہ افسر کی شادی میں اپنی کسی بہت اہم مصروفیت کے باعث آ نہ سکی تھیں۔ اس کی معذرت اور بہو کو سلامی وغیرہ دینے آئی تھیں۔ اکیلی ہی آئی تھیں ڈرائیور کے ساتھ۔ میاں نہ آسکے "انتہائی ضروری مصروفیت کے باعث۔

☆ ☆ ☆

چند دن بعد وہ پھر آگئیں، سب حیران ہوئے۔ وہ خالہ سے راز و نیاز میں مصروف ہو گئیں۔ رات کو خالہ ہما کے پاس آئیں، بڑی رازداری سے اس کے قریب ہو کر بیٹھیں۔

"میں نے کہا، ہما! ذرا سننا، یہ ذکیہ کیا کہہ رہی ہے؟ لو، حد ہو گئی۔"

حد ہو گئی کا فقرہ اس وقت ادا ہوتا تھا جب انہیں کسی تجویز سے نیم رضامندی کا اظہار کرنا ہو۔

ہما انہیں دیکھنے لگی، نہ جانے یہ ذکیہ آپا اب کیا کہنے آئی ہیں۔

"بہت امیر لوگ ہیں۔" خالہ سر ہلا رہی تھیں، جب انہیں سو فیصد یقین ہو تب اس طرح ہی سر ہلاتی تھیں۔ "میں نے کہا ہما! یہ ذکیہ باؤلی تو نہیں ہو گئی، لو سنو ذرا اپنے بھائی کے لیے، ارے اس رنڈوے کے لیے تمہارا رشتہ دے رہی ہے۔"

ذکیہ کے بھائی کی بیگم فوت ہو چکی تھیں، ایک بچی بھی تھی۔

"ویسے۔۔۔ پتا نہیں کیا نظر آیا یہاں۔۔۔ نہ ہم ان کی برابری کے ہیں۔۔۔ نہ اتنی واقفیت ہے، ہاں بس رشتہ تو ہے۔"

انہوں نے پھر سر ہلایا، ہما پر بم گرا کر سر ہلا رہی ہیں، واہ۔

"خالہ!" وہ چیخی۔ "کیا کہہ رہی ہیں رنڈوا؟" یعنی وہ جو گندی عورت ہوتی ہے رنڈی، اس کا مرد؟ آ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا میرے لیے گندا مرد؟"

خالہ کو زور کی ہنسی آئی۔ انہوں نے بے تکلفی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے اس کے بازو پر زور [illegible] اور دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر ہنسی کو بے قابو ہونے سے روکا۔ (بے تکلفی کے ریکارڈ وہ توڑتی رہتی تھیں۔)

"بے وقوف، وہ والا نہیں، ارے جس کی بیوی مر جاتی ہے وہ والا۔"

"اچھا، بیوہ نہیں، بیوہ مرد۔" سکھ کا سانس لیا اور ایک جھٹکا مزید کھایا، کھلکھلاہٹ کے ساتھ۔

"کیا ہے؟ مارے جا رہی ہیں۔" شدید جھلاہٹ تھی۔

"بتا رہی ہوں، سمجھتی نہیں، مرد بیوہ نہیں ہوتا، رنڈوا ہوتا ہے، پاگل!"

"پاگل بھی ہے؟" بم پہ بم توپ پر توپ چلا رہی تھیں۔ آنکھیں پھٹنے کو تھیں اس کی۔ اگلے دھوکے سے بچنے کے لیے وہ کھسک کر پرے ہو گئی۔ "یہ ہیں میرے نصیب، ہائے اللہ۔"

"تمہیں کہہ رہی ہوں پاگل۔ وہ تو سو سیانوں کا سیانا ہے، مگر بس ایک سال ہی شادی کو ہوا تھا کہ بے چاری بیوی دنیا چھوڑ گئی۔ بچی چھوڑ کر، ہائے۔۔۔ ہائے۔" ہتھیلیاں رگڑ رہی تھیں۔

"اب بچی کو پالنے کے لیے ماں چاہیے، کوئی نیک، سیدھی، شریف اور اچھی عادت کی۔"

"میں تو بہت بری ہوں [illegible]۔" وہ انگلیوں پر گنوانے لگی۔ "میں [illegible] ہوں، کسی کام کی نہیں، سست ہوں، کاہل [illegible] کھانا پکانا نہیں آتا، استری بھی [illegible] سے ہمیشہ گریز، ٹیڑھی کرتی ہوں، جھاڑو [illegible] ہے اور۔۔۔ اور نیند بہت آتی ہے مجھے۔"

"[illegible] نہیں، بچی کی ماں چاہیے، دھوبن، خانساماں نہیں۔ بہت نوکر ہیں وہاں، آیا بھی ہے بچی کے لیے، مگر ماں کی محبت بچی کو حاصل نہیں، بس سوچ لو، نہ کھانا پکانا، نہ استری کرنا، بس آرام ہی آرام، اور مرضی کا سونا جاگنا، عیش ہی عیش۔"

اسے بے آرام کر کے مزے سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ذکیہ آپا کی دولت کا اسے اندازہ تو تھا۔ لاہور سے ڈرائیور کے ساتھ لمبی سی گاڑی میں آنا۔ بہترین قیمتی تحائف کے ساتھ اور پھر بھائی بھی سنا تھا بہت ہی امیر الامراء ہی ہیں۔ پھر بھلا مسکین سی ہما میں کیا نظر آیا انہیں؟

اگلے دن اسریٰ نے بھی اس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے گردن ہلا ہلا کر اس کے عیش و آرام پر خراج تحسین پیش کیا۔

"واہ بھئی۔ خانساماں ہے، بیرا ہے، چوکیدار، مالی اور صفائی کے لیے پوری فیملی ہے، نہ کچھ کرنا نہ دھرنا، عیش کرنا، ٹی وی، ٹیلی فون، بس یہ ہی مصروفیت ہو گی، ہما بھئی واہ، کیا لمبا ہاتھ مارا ہے۔"

"اور دوسروں کی بچی پالنا، اس کی ریں ریں، چیں چیں برداشت کرنا کیا عیش ہیں؟" وہ جل بھن کر کوئلہ بن [illegible] تھے، روتے دھوتے۔

"[illegible] نہیں ہے کہ ریں ریں کرے گی، چار [illegible] سمجھ دار ہے۔" اسریٰ نے بتایا۔

"بھائی بہت پریشان رہتا ہے، بچی کو ہر جگہ ساتھ لے جاتا ہے، اسے دوسروں پر بھروسہ نہیں ہے۔ اچھی سی سمجھ دار لڑکی مل جائے تو اس کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر شریف اور خاندانی ہو کہ اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ (لو جی، شکی مزاج بھی ہیں۔) دراصل ہر جگہ تو بچی کو لے جایا نہیں جا سکتا ہے۔ گھر میں قابل اعتماد ہستی ہو، جو اسے سنبھال سکے۔ بڑی آپا ساتھ رہتی ہیں۔ بیوہ ہو کر بھائی کے پاس آگئی تھیں۔ ان کی اپنی مصروفیات ہیں۔"

"وہ چاہتی ہے کہ تم کو ساتھ لے جائے، تم بھی دیکھ لو، وہ بھی تمہیں دیکھ لے، اور حرج بھی کیا ہے، خالہ زاد بہن جو یتیم ہے اور تمہیں تو شوق بھی ہے لاہور کی سیر کا۔"

چلو۔ خالہ نے تو اس کی سیر کا بندوبست بھی کر دیا اور یتیمی کی بے کسی کا احساس بھی دلا دیا۔

"اور ذکیہ کہہ رہی ہے کہ اگر افسر نے پھر بھی منع کر دیا تو ہما کے لیے وہاں اور بھی رشتے مل سکتے ہیں۔ بس تم تیاری کر لو۔ ذکیہ کوئی غیر نہیں، جو اس کے گھر جانا معیوب ہو۔ وہ تمہیں واپس بھی گاڑی میں بھجوا دے گی اور ابھی وہ ہر کسی سے تمہارے بارے میں کچھ بتائے گی تھوڑی۔ بس یہ کہ بچی سیر کی شوقین ہے، اگر اسریٰ فارغ ہوتی تو اسے بھی تمہارے ساتھ بھیج دیتی۔"

بچی سیر کی شوقین تھی۔ لہٰذا وہ فٹافٹ تیار ہو گئی اور بھئی حرج بھی کیا ہے، سگی خالہ زاد بہن کے گھر جانا معیوب تو نہیں۔ افسر نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☆ ☆ ☆

لمبی چمکیلی گاڑی میں ذکیہ آپا کے ساتھ وہ لاہور پہنچ

http://www.pakfunplace.com

گئی۔ گلبرگ میں ان کی کوٹھی تھی۔ اونچے گیٹ اور بڑے سے لان والی' اندر بھی کئی کمرے تھے۔ خوب ہوا دار' روشن' اور بہترین فرنیچر سے آراستہ' گلفی دولت مند لگتی ہیں اور وہ۔ جس کے لیے وہ لائی گئی ہے' نہ جانے کیسا ہو' البتہ اگلے دن زہرا اور بڑی آپا آگئیں۔

بڑی آپا بڑی خالہ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں' پھر ذکیہ آپا' ان کے بعد اشفاق' چھوٹی زہرا تھی۔ خاصی دلچسپ لڑکی تھی۔ بڑی آپا' ہما کا معائنہ کرکے واپس چلی گئیں' وہ بھائی کے ساتھ رہتی تھیں' بیوہ تھیں' زہرا نے بے تکلف ہونے میں ایک منٹ بھی نہ لگایا۔ ہم عمر تھی' ہما نے بھی شکر ادا کیا۔ بڑی آپا کے جانے کے بعد زہرا اسے اوپر کا گھر دکھانے لے گئی۔ پھر ٹیرس پر آکر پڑوس میں جھانکنے لگی۔ ہما کو بھی دعوت دی۔ وہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو کر جھانکنے لگی۔

پڑوس کے ٹیرس پر ایک لڑکا شاید اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہما نے سوچا شاید زہرا سے پڑوس والوں کی واقفیت ہوگی مگر بات پوچھنے پر زہرا کو ہنسی آگئی۔ ہنستی چلی گئی' پھر ہما بھی ہنس پڑی' بے وجہ۔

"پتا ہے میں اور بھابھی دلہن جب بھی ذکیہ آپا کے گھر آتے تھے اوپر آکر پڑوس میں جھانکتے تھے۔ پھر مجھے ہنسی آجاتی۔ بھابھی دلہن بھی خوب ہنستیں' اب یاد آگئی تو ہنسی آگئی۔ بھابھی' دلہن بہت ہی ہنسوڑ اور زندہ دل تھیں۔" ہنستی مسکرائی۔

"بہت اچھی تھیں؟ تمہارے بھائی کو تو بہت دکھ ہوا ہوگا۔"

"اوہو بہت زیادہ۔ کتنے دن تو گم صم رہے' پھر غصہ بڑھا' اب تو۔۔۔ سنبھل گئے ہیں' مگر۔۔۔ عجب کنفیوژن ہے۔" زہرا کچھ ہچکچائی جیسے سوچ رہی ہو' بتاؤں کہ نہ بتاؤں' ہما کو الجھن ہوگئی۔ "کیا؟ کیسی کنفیوژن۔"

"اصل میں۔۔۔ مجھے لگتا ہے' بلکہ لگتا تھا جیسے وہ بھائی میاں کے آزمانے کے لیے چھپ گئی ہیں۔"

ہما اچھل پڑی۔ "ہیں۔۔۔ کیا وہ زندہ ہیں؟"

زہرا نے کندھے اچکائے۔ گویا کیا پتا۔ ہما حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو لاپروائی سے پھر پڑوس کے لان میں تاک جھانک کر رہی تھی۔

"مگر۔ ذکیہ آپا نے تو کہا کہ وہ۔۔۔ فوت ہوگئی ہیں۔"

"کہتے تو یہ ہی ہیں سب' مجھے مگر اس میں شک ہے۔"

"وہ کیوں؟ بھلا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ زندہ آدمی کو سب مردہ سمجھ لیں۔"

"وہ اس لیے کہ ہم میں سے کسی نے ان کا جنازہ نہیں دیکھا۔" زہرا اسے شاید خوف زدہ کرنا چاہتی تھی یا حیران۔۔۔ مگر وہ پریشان ہوگئی۔

"جب ان کی فوتگی کا یہاں فون آیا۔" وہ ریلنگ پر ٹک کر بولی۔ "بھائی میاں جاپان گئے ہوئے تھے' غالباً فیکٹری کی مشینری کا سودا کرنے۔ میں پشاور اپنے کزن کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ ذکیہ آپا چھلے میں تھیں۔ فوراً" تو کوئی پہنچ نہ سکا' جب ہم وہاں گئے' تو پتا چلا بچی پیدا ہوئی اور وہ ختم۔"

"تو۔۔۔ آخر۔۔۔ موت کے گھر کے ماحول سے تو معلوم ہوتا ہے نا' رشتے دار' پڑوسی۔"

"مشکل یہ تھی۔" زہرا نے ڈھونڈ کر چند اینٹیں ایک جگہ جمع کرلی تھیں۔ ان پر چڑھ کر پڑوس کے شاید کمروں تک رسائی چاہ رہی تھی۔ "ان کے سارے عزیز تو کراچی میں ہیں۔ یہاں چند لوگ تھے۔ پھوپھی' چچا' اماں' ابا۔۔۔ ہاں ایک خالہ آئی ہوئی تھیں۔ کچھ سنکی سی تھیں۔ بھابھی دلہن کی بہن نے ہی بتایا تھا کہ یہ سنکی ہیں۔" زہرا اینٹوں سے اتر گئی تھی۔

"تو۔۔۔ قبر تو ہوگی ہے مرنے والے کی۔" وہ سراسیمہ ہوگئی۔

"ہوگی۔۔۔ ظاہر ہے مرنے والے کی ہی قبر ہوتی ہے۔ زندہ کون دفن ہوتا ہے۔ خیر سخت سردی تھی اور بارش موسلا دھار' پاس پڑوس والے کوئی آنہ سکے' ان کی بہن کی اطلاع کے مطابق۔۔۔ تو۔۔۔ اور قبرستان میلوں دور' بارش کی طوفانی لہریں تھیں' سیلاب آگیا تھا' ہم واپس مشکل سے ہی آئے۔"

ہما کا تو حال خراب تھا۔ کاٹو تو خون نہیں' یہ کیا سلسلہ ہے' کیسا ڈراما ہے۔

"تم کو' تم کو ہی آخر یہ شک کیوں ہے۔" سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بھی خشک تھی۔

"بھئی۔۔۔ زندگی میں ہی کہتی رہتی تھیں کہ تمہارے بھائی میاں کی محبت میری زندگی تک ہی ہے۔ میرے مرتے ہی یہ دوسری شادی کرکے عیش کرتے رہیں گے۔ ہر مرد یہ ہی کرتا ہے۔"

"مگر۔۔۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمہارا شک' کوئی بھی' مطلب کسی اور کو بھی۔"

"بھئی دس دفعہ تو انہوں نے میرے سامنے کہا کہ وہ بھائی میاں کو آزمائیں گی' ان کی محبت کا امتحان لیں گی' بھائی میاں ان سے لڑتے بھی تھے۔ یقین دلاتے تھے کہ وہ سچی محبت کرتے ہیں' وہ کہتی تھیں۔" زہرا سانس لینے رکی' پھر اینٹوں پر چڑھ گئی۔

"کہتی تھیں مرد کی محبت بس چند روزہ ہوتی ہے' زندگی کے ساتھ دعوے کرتے ہیں۔ مرتے ہی بھول بھال کر۔ میں انہیں ثابت کرکے دکھاؤں گی کہ میرا دعویٰ سچا ہے اور دیکھ لو۔"

زہرا پھر اینٹوں سے اتر گئی۔

"کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ لوگ شاید جنوں کی نسل سے ہیں' کبھی جو کوئی سامنے نظر آئے۔ اف۔۔۔ ہاں۔۔۔ تو دیکھ لو چھپی بیٹھی ہیں بھائی میاں کا امتحان لینے کے لیے' جوں ہی انہیں خبر ہوئی بھائی میاں کی شادی کی۔ فوراً "آن موجود ہوں گی' دیکھ لینا۔"

"تمہیں۔۔۔ تمہیں یقین ہے کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ مگر چار سال تک کون انتظار کرتا ہے۔" ہما بے یقینی سے زہرا کو دیکھتی رہی۔

"چار سال؟ ارے محبت کرنے والے تو ساری زندگی انتظار کرتے ہیں' کتابوں میں تو یہ ہی لکھا ہے' اور بھی کتابیں جھوٹی نہیں ہوتیں۔"

"چار سال' تو پھر۔۔۔ بچی کو کیوں نہیں رکھا اپنے پاس۔" وہ سٹپٹائی ہوئی تھی۔

"یہ ہی ظاہر کرنے کے لیے کہ مرچکی ہیں اور بھائی میاں' اوہو' وہ کون سا تنگ کرتا انہیں' جا کر لے آئے اور اب وہی ان کی زندگی ہے' وہ ہی محبت ہے' وہ ہی سب کچھ۔"

"تمہارے بھائی میاں کو بھی کیا یہ شک ہے کہ۔۔۔ وہ آزمانے کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔"

"نہیں بھئی' یہ ہی تو مشکل ہے کہ انہیں تو ذرا بھی شک نہیں۔۔۔ میں مثالیں دے دے کر یقین دلاتی رہی انہیں مگر میرا یقین نہیں' کہنے لگے' ڈرامے بہت دیکھتی ہو' میں نے کہا' میں حیران ہوں' انہوں نے وفات کے لیے وہ ہی دن کیوں چنے' جب بھائی میاں جاپان میں' پشاور اور ذکیہ آپا چھلے میں تھیں۔ یقیناً" آزمانے کے لیے' بہترین موقع تھا۔ نہ کسی نے جنازہ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میں عبدالقادر ہوں
ثروت نذیر
قیمت -/225 روپے

دیکھا نہ قبر اور بھائی میاں کئی مہینے تو حواس باختہ رہے' پاگل ہونے میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ بچی کو جا کر لائے' تب کچھ حواسوں میں آئے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' کب تک آزماتی رہیں گی؟ چار سال کم تو نہیں ہوتے۔"

"جیسے ہی بھائی میاں شادی کریں گے آجائیں گی' ویسے پچھتا رہی ہوں گی۔"

زہرا کا شک بلکہ یقین اور ہما کی پریشانی۔ اگر یہ... اسی طرح ہے' تو اس کا آنا بے کار ہی ہوا۔ مگر اگلے دن جب وہ زہرا کے ساتھ شالا مار باغ اور جہانگیر کے مقبرے کی سیر کے لیے ذکیہ آپا کی لمبی گاڑی میں اڑی جا رہی تھی تو ساری فکر ذہن سے نکال دی تھی۔ زہرا بھی شاید بھول گئی تھی۔

اگلے دن قلعہ اور مینار پاکستان' شاہی مسجد کی سیر کا طے ہو گیا۔ ہما خوش تھی' کچھ فائدہ ہی ہوا لاہور آنے کا۔

☼ ☼ ☼

رات کو بوا' ذکیہ آپا کے بچوں کے کمرے میں کہانی سنا رہی تھیں۔

"اور پھر اللہ کا کرنا کیا دیکھا شہزادے نے کہ پان شق ہوا' اس میں سے یہ حسین مہ جبین چندے آفتاب چندے ماہتاب شہزادی باہر نکلی اور کھانے کی میز پر رکھے کھانے پر ٹوٹ پڑی۔"

"اتنے سے پان میں' پوری شہزادی؟ بوا' وہ کوئی چڑیا جتنی تھی؟"

"بھئی چپ کر کے سنو' وہ تھی رانی بن بسی۔ پان کی شہزادی' کھانے کے اوپر ٹوٹ پڑی۔ جتنی زیادہ چیزیں تھیں ہر ڈش میں سے نکال کر کھائی' بھی یہ بھی وہ' ہر چیز چکھتی' کھاتی۔"

"سارا کھانا جھوٹا کرتی رہی' ایں بوا؟ بد تمیز بھی تھی۔"

"اف... سنو' پھر جیسے ہی وہ کھانی کر پان میں داخل ہونے لگی۔ شہزادے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تو سو جان سے عاشق ہو گیا تھا شہزادی پر۔"

"ارے بوا! اب ان کو سونے دو' صبح اسکول جانا ہے۔" ذکیہ آپا باہر سے ہی پکارنے لگیں۔

"فضول کہانیوں میں الجھا رہی ہو' یہ کوئی بچوں کو سنانے والی باتیں ہیں۔"

"لو' کہانیاں کیا بڈھوں کو سنائی جاتی ہیں' لو اور سنو۔" بوا خفا ہو گئیں۔

زہرا منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔ "سنا تم نے بچوں کے لیے کہانیاں' جس میں شہزادہ سو جان سے عاشق ہوتا ہے شہزادی' چندے آفتاب ۔ کل جو کہانی سنا رہی تھیں اس میں شہزادی کو پری جمال بنا دیا۔ جس پر زید نے کہا۔ بوا پری جمال نہیں' تنویر جمال ہے' جو ڈراموں میں کام کرتے ہیں انکل۔ اب ان کہانیوں سے کیا سبق لیتے ہوں گے اس زمانے کے بچے' جب بوا کی نانی' دادی یہ کہانیاں سناتی ہوں گی' ظاہر ہے ہر قسم کی پری جمال پر عاشق ہوتے ہوں گے۔"

"فکر نہ کرو' اب اس زمانے کے بچے کوئی سبق نہیں لیں گے۔ ان کے لیے ٹی وی کی پری جمالیں اور شہزادیاں کافی ہیں۔" ہما نے اطمینان دلایا۔ رات دیر تک وہ باتیں کرتی رہیں۔ زہرا تو شاید بالکل ہی [illegible] تھی کہ اس نے ہما کو بھابھی دلہن کے [illegible] طرح مشکوک بنا دیا ہے۔ زہرا اشفاق بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ بڑی آپا کے ساتھ [illegible] اس کی چھٹی تھی' اس لیے سیر کا [illegible]

صبح سویرے [illegible] لے کر نکل گئیں۔ ناشتہ کر کے پہلے [illegible] گئیں۔ وہاں سے شاہی مسجد' تصویریں [illegible] قلعے میں گھس گئیں' شیش محل کے [illegible] باہر بھی تصویریں کھینچیں۔ خوب لطف لیا۔ ہما کی زندگی کی بہترین تفریح تھی۔ تفریح کے ساتھ زہرا کی دلچسپ گفتگو۔ تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات بھی بہت تھیں۔ زہرا سے اس کی پکی دوستی ہو گئی۔ سہ پہر کو گھر پہنچیں' تھک کر چور کھانا کھایا' تھوڑا آرام کیا' نیند آ گئی۔ شام کو اٹھ کر نہا کر باہر آئی' لاؤنج میں چائے کا انتظام ہو رہا تھا۔ زہرا اسے ہاتھ پکڑ کر باہر لائی۔ اس کے بھائی میاں آ چکے تھے مع بچی کے۔ ذکیہ آپا' ان کے شوہر' بچے' سب موجود تھے۔ زہرا شاید قلعے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ پھر وہ ذکیہ آپا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ زہرا ہی بولتی رہی۔ چائے کے ساتھ سموسے اور کیک بھی تھا۔

بھائی میاں اچھے اسمارٹ اور خوش جمال تھے مگر بچی کی طرف ہی متوجہ رہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتے رہے' پھر ذکیہ خالہ نے کہا۔

"یہ... ہما ہے' خالہ [illegible] چھوٹی خالہ کی بیٹی۔ تمہیں یاد ہو گا بہت خوب صورت' حسن و جمال میں یکتا تھیں۔ [illegible] کرا میں۔" ذکیہ آپا نے سرد آہ بھری۔

"ہاں... حسن و جمال نہیں' پری جمال کہیں۔" ان کا بیٹا بول اٹھا۔

"[illegible]... یہ بوا کی کہانیاں۔" ذکیہ آپا گھور کر رہ گئیں۔ "چپ رہو عماد۔"

ان کا بیٹا پھر بول اٹھا۔ "چندے آفتاب چندے ماہتاب تو یہ ہما آنٹی ہیں' بوا سے پوچھا تھا میں نے' انہوں نے کہا' ہاں ایسی ہی شہزادی تھی وہ۔"

"چلو اٹھو بھاگو یہاں سے۔ عماد! اب نہ بولنا تم۔" زہرا کو ہنسی آ رہی تھی' ذکیہ آپا کو غصہ' بھائی میاں بیٹی کی خاطر میں مصروف۔

ہما چائے لے کر کمرے میں آ گئی۔

"چھوٹی خالہ کی وفات کے بعد اسلم خالو بھی چل بسے۔ جب سے ہما' شبو خالہ کے پاس ہے۔ بی اے کر کے فارغ ہوئی ہے۔" ذکیہ آپا ان کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ بچی میں گم' ہما کچن میں کسی اور لذیذ چیز کی تلاش میں چلی گئی۔ اس کے کان لاؤنج میں ہی لگے رہے۔

"ارے نہیں آپا! بچی ہے' زہرا جیسی۔" اب ان کی آواز آئی تو انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

"ہاں ں... ذکیہ آپا نے لمبی ہاں کی۔ "شادی کے قابل ہے۔ اسی [illegible] شادیاں ہوتی ہیں۔ منجھلی خالہ بہت فکر [illegible] ماں باپ بھی نہیں' اور... معصوم سے [illegible] آپ بھی ہے' کسی بے سہارا کو سہارا [illegible] آپ جو تم کہو۔"

[illegible] خاموشی' پھر زہرا کچھ کھاتی ہوئی آئی۔

"بریانی بنے گی رات کے کھانے میں۔ بھائی میاں کھانا ادھر ہی کھائیں گے۔ چلو' کچھ وقت تمہارے ساتھ اور اچھا گزر جائے گا۔ وہاں تو... اف' تنہائی اور سناٹا' اوپر سے بھابی افشی کے نخرے۔"

"کیوں' وہاں بڑی آپا بھی تو ہیں۔"

"وہ کوئی میری سہیلی یا رازدار تو نہیں ہیں۔ دوسرے وہ نماز اور وظیفوں میں مشغول رہتی ہیں۔ میں پڑھائی میں' اور اب دو دن جو یہاں رہ گئی تو ایک ہفتہ تک تو آ نہیں سکوں گی۔ بڑی آپا کا کہنا ہے کہ قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا' تمہاری وجہ سے رہ بھی لی۔ ورنہ یہاں بھی ذکیہ آپا مصروف' بچے کھلنڈرے' خیر میں بھی ان کے ساتھ کھیل لیتی ہوں مگر میری پڑھائی کا حرج ہوتا ہے' اس لیے بڑی آپا میری سیر تفریح کے شوق سے بہت خفا رہتی ہیں۔"

"سنو زہرا پلیز' ذکیہ آپا سے کہو' اب مجھے بھی اوکاڑہ بھیج دیں۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"ہیں؟ اتنی جلدی؟ دل نہیں لگا یہاں؟"

"دل تو خیر لگ گیا مگر... تم بھی جا رہی ہو اور... میں اکیلی کیا کروں گی۔ سیر بھی کر لی۔ خالہ ذرا سا کام کر کے تھک جاتی ہیں' اسریٰ تو پڑھائی میں غرق رہتی ہے۔"

زہرا نے باہر جا کر بات کی ہو گی' واپس آ کر کہا۔ "کام بن گیا' کوئی صاحب اوکاڑے جا رہے ہیں۔ ان کا ساتھ ہو جائے گا۔ بھائی میاں تمہیں خود بس پر بٹھانے جائیں گے۔"

"نہیں... نہیں' وہ کیوں تکلیف کریں۔" ہما گھبرا گئی۔ "منع کر دو پلیز' ڈرائیور کے ساتھ۔"

ذکیہ آپا اندر آ گئیں' معذرت کرنے لگیں کہ وہ

http://www.pakfunplace.com

وعدے کے مطابق خود اسے چھوڑنے نہیں جاسکتیں۔ کراچی سے ان کی نند آرہی ہیں کل۔

"اشفاق کے آفس کا لڑکا اپنی والدہ کے ساتھ جارہا ہے۔ اشفاق نے کہا کہ وہ تمہیں گھر تک پہنچادیں گے۔ تمہیں آرام رہے گا۔ ہمیں اطمینان۔"

ہما نے شکر ادا کیا' ذکیہ آپا نے اسے بہت خوب صورت سوٹ بھی دیا۔ اور ہم رنگ چوڑیاں بھی۔ اس کے نہ۔۔۔ نہ کرنے پر وہ خفا بھی ہوئیں۔ زہرا نے بھی اسے ملتان کی کڑھائی کا دوپٹہ دیا۔ جاتے وقت گلے لگایا اور بولی۔

"اچھا۔ میں چلتی ہوں' تم پھر کبھی آسکو تو ضرور آنا۔ میرا تو اوکاڑہ جانا ہو نہیں سکتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" ہما نے گلے لگے لگے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر تمہاری سسرال اوکاڑے میں ہو۔"

"میرا تو امکان کم ہے۔ البتہ تمہاری سسرال لاہور میں ہو سکتی ہے۔ پھر ملاقات ممکن ہے۔" زہرا نے کہا۔

زہرا اپنے بھائی' بھتیجی کے ساتھ چلی گئی۔ ہما کا دل بہلانے ذکیہ آپا کے بچے تھے اب۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کے بعد وہ بالکل تیار تھی۔ آخر گیارہ بجے بوا نے آکر بتایا۔ "گاڑی آگئی ہے' چلو۔" ملازم نے بیگ اٹھالیا۔ ذکیہ آپا نے گلے لگایا۔ دعائیں دیں۔ وہ گیٹ پر آگئی ہوا ساتھ تھیں باہر ایک گاڑی تھی' ایک نوجوان باہر کھڑا تھا اندر برقعہ پوش خاتون بھی تھیں۔ ڈرائیور نے اس کا بیگ لے کر ڈگی میں رکھا۔ پیچھے بیٹھی خاتون کو سلام کیا۔ نوجوان اندر بیٹھ گیا۔ گاڑی نے بس اسٹینڈ پر پہنچادیا۔ ٹکٹ لیے جاچکے تھے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ اپنے ٹائم پر بس چل پڑی۔ خاتون ہما سے باتیں کرنے لگیں۔

ان کی بیٹی اوکاڑے میں رہتی ہے۔ بیٹا اشفاق صاحب کی کمپنی میں ملازم ہے۔ بیٹی نے ایک لڑکی کا بتایا ہے۔ اماں جان اس لڑکی کو دیکھنے جارہی ہیں بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ اگر لڑکی ان کی مرضی کے مطابق ہوئی تو۔۔۔ رشتہ دے کر جواب لے کر ہی لاہور جائیں گی۔ ہما کے بارے میں بھی انہوں نے معلومات لے لیں۔ وہ یتیم ہے' خالہ کے گھر رہتی ہے' بی اے کرلیا ہے' اشفاق صاحب خالہ زاد ہیں' وغیرہ۔

راستے میں بس دو' تین جگہ رکی۔ ان کے بیٹے نے نیچے اتر کر اماں کو پھل لاکر دیے' جو انہوں نے ہما کو بھی بہ اصرار کھلائے۔ اوکاڑہ آیا' ٹیکسی کرکے پہلے ہما کو پہنچانے خالہ کے گھر گئیں۔ ٹیکسی والے سے کہہ دیا۔

"ذرا بچی کو اندر پہنچادوں' دس منٹ رکنا۔"

خالہ سے بھی سلام دعا' بلکہ اسریٰ نے چائے بھی پلائی۔ ان کے بیٹے اور ٹیکسی ڈرائیور کو بھی دروازے کی اوٹ سے ٹرے پکڑائی۔ پھر کسی دن آکر ملنے کے وعدے کے ساتھ خاتون رخصت ہوئیں۔ خالہ کو وہ بہت پسند آئیں۔ ان کا اخلاق اور احساس ذمہ داری' مگر ہما سے انہوں نے یہ ہی کہا۔

"اتنی جلدی کیا تھی آنے کی؟ وہ چار دن اور رہ لیتیں۔"

"مجھے سنبعہ یاد آرہی تھی۔" اس نے بھابھی کی گود سے سنبعہ کو لپک لیا۔

رات کو بھابھی نے اس سے پوچھا۔ "کیسی رہی لاہور کی سیر' اشفاق بھائی کیسے لگے۔"

"پتا نہیں' کل ذرا دیر کو دیکھا ہیں۔"

"ان سے کوئی بات نہیں ہوئی' انہوں نے تم سے مل کر کچھ کہا ہوگا۔"

"جی۔۔۔ کہا تھا تم بچی ہے۔" کہہ کر ہما کھلکھلائی۔ بھابھی مسکرادیں۔

"اور اماں تو امید لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید تمہارے ساتھ ذکیہ آپا آئیں گی منگنی کرنے۔"

"بھابھی! بھائی جان سے کہیں مجھے کوئی جاب دلوا دیں' خالی بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی ہوں۔"

"لو حد ہوگئی' جاب کیا اتنی آسان ہے' لاہور میں اشفاق بھائی سے کہتیں۔ ان کی کمپنی میں شاید مل بھی جاتی۔ رشتے داری کی مروت میں۔"

خالہ نے سنا تو شور کرنے لگیں' مگر ہما' خالہ کے اس کی شادی کے شوق کو پس پشت ڈال کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سعی کررہی تھی۔

"کس نے کہا کہ تم بوجھ ہو' یا ہم تمہیں کھلا نہیں سکتے' تو اور سنو فضول کی فرمائشیں۔"

بہو سے بھی شکایت ہوگئی۔ "لو جی' ہم لڑکی کی شادی کے لیے پریشان ہیں' یہاں تو منصوبے ہی اور بن رہے ہیں' بالا ہی بالا۔"

بے چاری بھابھی کہہ کر پچھتائیں۔

"اماں! اگر لاہور میں کوئی امید ہوتی تو وہ جاب کا نہ کہتی۔ آپ نے ذکیہ آپا سے بات نہیں کی۔"

"ہاں۔۔۔ خاص بات نہیں کی' بس اس کی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے خود ہی بتایا کہ اشفاق نے ابھی جواب نہیں دیا ہے۔" خالہ دائیں بائیں دیکھنے لگیں (یعنی انہیں بھی امید نہ رہی۔)

"ارے بھئی مجھے تو یہ لالچ ہے کہ ایک تو اپنا خاندان' پھر دولت کی ریل پیل۔ عیش کرے گی' سکھ سے رہے گی۔ مجھے بھی تسلی ہوگی۔ اب۔۔۔ غیر لوگ' جانے کیسے ہوں' کسی کے دل میں گھس کر پہلے سے تو پتا نہیں چلایا جاسکتا۔"

"اماں! اف۔۔۔ عمر کا فرق بھی تو ہے۔ آج کل تو اس پر بھی ریسرچ ہورہی ہے' کم عمر لڑکی' بڑی عمر کے مرد کے ساتھ' خوش نہیں رہتی۔"

خالہ چونک گئیں۔ "اس نے تم کو کچھ بتایا؟"

"نہیں' بتایا تو نہیں' میں نے خود پوچھا تھا۔ اشفاق بھائی کو دیکھا' کیسے لگے' تو کہنے لگی' ذرا دیر کو دیکھا تھا' وہ تو کمرے میں چلی گئی۔"

"پاگل کہیں کی' ذرا دیر سامنے بیٹھتی' کچھ بات کرتی' بچی سے مخاطب ہوتی' ہائے کیسے عقل سکھاؤں' جس کام کے لیے گئی تھی وہ ہی نہ ہوا۔" خالہ سخت بدمزا ہوئیں۔

"اماں! اس کی قسمت پر چھوڑ دیں' دس گھنٹے بھی سامنے بیٹھ کر جاچکی۔ کسی کا پتا نہ چلتا۔ وہ کوئی اتنی تجربے کار بھی نہیں کہ اندازے لگاتی۔"

خالہ چپ ہوگئیں' ابھی ذکیہ کی طرف سے بھی تقاضا نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

بھائی جان نے بھی کمال کردیا۔ اس کے لیے ایک جاب تلاش کرلی۔

"بھئی واہ کیا بات ہے ہما کی۔ ادھر میں نے عظمت صاحب سے ذکر کیا' انہوں نے کہا' ہماری فرم میں لیڈی ٹیلی فون آپریٹر کی ضرورت ہے۔ فرم کی پک اپ اسٹاف کو لانے لے جانے کی ذمہ دار ہے۔ مسئلہ ہی نہیں' ٹریننگ دو دن ہوگی' بس' پھر کام شروع۔" بھائی جان بہت خوش تھے۔

عظمت صاحب پچھلی گلی میں رہتے تھے۔ عظمت صاحب اسے لینے اور ڈرائیور کو گھر بتانے آگئے۔ وہ بے فکری سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آفس بہت بڑا نہ تھا۔ اسٹاف میں بھی زیادہ لوگ نہ تھے۔ ایک لیڈی آپریٹر موجود تھی۔ اس نے کافی کچھ سمجھادیا۔ کام بہت مشکل نہ تھا۔ بس ذمے داری کا تھا' اور دو دن میں وہ اچھی طرح سمجھ بھی سکتی تھی۔ جب چھٹی ہوئی وہ سب کے ساتھ باہر آرہی تھی۔ تو اسے احمر نظر آیا۔ ہم سفر' وہ ٹھٹک گئی' وہ بھی حیران سا تھا۔

"آپ۔۔۔ یہاں؟ گئے نہیں؟" منہ سے نکل گیا۔

"ہاں بس۔۔۔ وہ' چار دن اور رکنا ہے' ادھر۔ کیسے؟"

"وہ۔۔۔ مجھے۔۔۔ یہاں کام مل گیا ہے۔ ٹیلی فون آپریٹر کا۔" اس نے کچھ جھجک کر بتایا۔ اتنی بڑی پوسٹ نہ تھی کہ فخریہ بیان کرتی۔

"آپ کے۔۔۔ اس کام کا کیا ہوا؟ خالہ جی جس کے لیے آئی تھیں۔" وہ گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"پتا نہیں' اماں کو ہی معلوم ہوگا۔" اور آگے بڑھ گیا' شرمیلا۔

"خالہ جی کو میرا سلام کہیں۔" آخر اس نے راستے میں خاطر تواضع کی تھی۔ اس کی اماں نے بھی' اور اب اسے علم ہوا۔ وہ خود بھی اشفاق بھائی کی فرم میں ہی

http://www.pakfunplace.com

جاب کر رہی ہے۔

واہ۔ پتا ہی نہیں تھا کہ عظمت چاچا ان کی کمپنی کے اکاؤنٹنٹ ہیں۔ بھائی جان نے بھی نہیں بتایا۔ گھر آ کر اس نے شکوہ کر ڈالا۔ اسریٰ نے تو خوب چیخ چلا کر مبارک باد دی۔ مگر خالہ۔ ناک پر انگلی رکھ کر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر بیٹے سے کہا۔

"لے... میں نے کہا۔ انصر۔ بھلا بتاؤ' کوئی خوشی کی بات بھی ہو' ارے نوکری اور اشفاق کی کمپنی میں؟ ان کے آفس میں' معمولی سی نوکری' کیا سوچیں گے اشفاق۔"

"اماں... انہیں سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نہ ان کے پاس کچھ سوچنے کا ٹائم ہوگا۔"

"لے لو یہ کیا بات ہے' اپنے آفس کی معمولی نوکر سے شادی کرنا اچھا لگے گا؟ اسے برا تو لگے گا ہی' دفتر والے بھی مذاق اڑائیں گے۔"

"تو نہ کریں شادی' بات ختم۔" انصر نے بات ختم کر دی۔

خالہ کو بیٹے کی بات پسند نہیں آئی۔ بڑبڑانے لگیں۔ "اب ذکیہ پوچھے گی' میں نے تو خود اس سے کہا تھا' کوئی لڑکا' کوئی رشتہ ہو تو یہ ہوا' بات ختم' ایسے کیسے ختم بھئی۔"

"اماں! آپ کو جلدی کیا ہے؟ ہما کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ ابھی اتنی عمر بھی نہیں ہے کہ کہیں بھی دھکا دے دیں۔ آپ اشفاق بھائی سے کب ملی تھیں؟ یاد ہے کچھ؟"

"پاکستان... بس یہ ہی کوئی اچھا خیر... ذکیہ صفیہ تو آئی تھیں نا فرو کے انتقال پر۔ اشفاق... بس کوئی دس' بارہ سال کا تھا جب اسے دیکھا تھا۔" خالہ از سر نو مستعد ہوئیں۔

"سن لو یہ ہماری اماں ملے بغیر دیکھے بغیر ہی رشتے پر آمادہ ہیں' کیا بات ہے؟ واہ۔"

وہ اٹھے اور نکل گئے۔ خالہ بڑبڑاتی رہ گئیں۔ اشفاق کی دولت' کاروبار کی وسعت' شاہانہ ہو گئی' عیش آرام کی زندگی۔ "ان لوگوں کو یہ نظر نہ

آوے۔" اس پر اعتراض تھا انہیں۔

اگلے دن وہ مٹھائی لے کر آفس گئی۔ میز پر ڈبہ رکھ کر عظمت چاچا کو دعوت دی۔ انہوں نے سب کو بلا لیا۔ ڈبہ کھلا رکھا تھا اور سب اپنا حصہ بٹا رہے تھے۔ کچھ دلچسپ فقرے بھی کان میں پڑے۔

"یار! خدا کا خوف کرو' شوگر کے مریض ہو' احتیاط لازم ہے' کہیں یہاں کے اسپتال نہ لے جانا پڑے۔"

"اوئے' پیٹ اپنا ہے کہ کرائے پر لائے ہو' رحم کرو اب۔"

"لگتا ہے آج بیوی نے ناشتا نہیں دیا' بھوکے پیٹ آ گئے اصغر صاحب۔"

احمر نے اپنی پسند کی مٹھائی چن کر نکالی۔ "تو' ان کو دیکھو جیسے شریک حیات پسند کر رہے ہیں' ارے اٹھا لو میاں کوئی سی بھی۔"

"لڑکیوں کے لیے کچھ چھوڑو گے کہ... مبارک باد بھی دو مس ہما کو اور شکریہ بھی۔"

پھر سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ "مبارک ہو مس ہما اور تھینک یو' شکریہ' مہربانی۔" شام کو گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔ خالہ سے لپٹ گئی۔ انہوں نے ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھا۔

"تو بوا' ہو گئی نوکری کی شروعات' میں نے کہا' لڑکیوں کو گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے اب۔"

"گھر میں رہنے' بور ہونے سے بہتر ہے کہ نوکری کر لیں' گھر میں کیا فائدہ؟"

"ہزاروں فائدے... کچھ گھرداری سیکھنی ہو' سلائی کڑھائی کرنی ہو' موتی ستارے ٹانکنے ہوں' آخر جہیز کے لیے لڑکیاں خود ہی یہ سب کرتی ہیں۔ دفتر لے جا کر تو یہ کام ہو نہیں سکتا۔" خالہ کو تو بس شادی کی فکر تھی۔

"ہو جائے گا' ہو جائے گا خالہ! میں کر لوں گی' جو آپ کہیں گی کر لوں گی' موتی' ستارے' کڑھائی' سلائی' بنائی' سب کر لوں گی' جہیز کی نوبت آئے تب نا' خوش؟"

"ہم تو چاہتے ہیں آج شادی ہو جائے گی' مگر بھئی

http://www.pakfunplace.com

ہم کون۔۔۔ کہ خوامخواہ۔"

"آپ تو میری سب کچھ ہیں۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ "خوامخواہ تو میں ہوں۔"

"چل خوشامدی۔" آخر ہنسی آگئی۔

شام کو کیا دیکھتے ہیں، جناب ہم سفر احمر سلطان مع والدہ اور بہن کے چلے آرہے ہیں۔

"تمہاری خالہ سے وعدہ کیا تھا اس لیے آگئی، یہ بیٹی ہے۔" انہوں نے تعارف کرایا۔ خالہ کو بتایا، وہ آگئیں۔

ہما چائے بنانے کچن کی طرف دوڑی۔

اسریٰ نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ہما آپی لگتا ہے یہ لوگ آپ کا رشتہ لائے ہیں۔"

"ہیں؟" وہ چکرا گئی۔ "نہیں بس، راستے میں بہت خیال رکھا انہوں نے۔"

وہ چائے لے کر اندر گئی تو خالہ سے وہ خاتون بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی بیٹی بھابھی سے، بھائی آگئے تھے وہ احمر سے حالات حاضرہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ خاتون خوش تھیں کہ ان کی بیٹی کو ایک گھر مل گیا۔ ورنہ یہاں ان کے ملاقاتی بہت ہی کم تھے۔ سب کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی، تو خالہ کچھ چپ چپ تھیں۔

"لو یہ ہوا۔" کہہ کر وہ کہیں چل دیں۔ غالباً بھابھی کے کمرے میں۔

"اچھے لوگ ہیں، احمر کے بہنوئی کا جنرل اسٹور ہے، میں اکثر وہیں سے سودا لیتا ہوں۔" بھائی کسی سے کہہ رہے تھے غالباً" خالہ ہی ان کی مخاطب تھیں۔

"بہنوئی سے کیا لینا ہے، لڑکے کی بات کرو۔" خالہ ہی تھیں متفکر سی۔

"لڑکا بھی ٹھیک ہے، ابھی کم عمر ہے، ترقی کے چانس ہیں۔" بھائی اطمینان دلا رہے تھے۔

"عظمت صاحب سے پوچھوں گا" لاہور جا کر بھی۔" وہ باتیں کرتے رہے ہما باہر آگئی۔

اسریٰ کا اندازہ صحیح تھا۔ بڑی بی احمر کے لیے رشتہ دے گئی تھیں۔ بھائی احمر کے [illegible] کم عمر،

تعلیم یافتہ، شریف خاندان، چھوٹی فیملی، خالہ متامل تھیں۔ انہیں کوئی کمی لگ رہی تھی، رات کو ذکیہ آپا کا فون آگیا۔

"میں نے بات تو کی تھی اشفاق سے، اصل میں بچی کی وجہ سے فکر مند ہیں کہ سوتیلی ماں آگر نہ جانے کیسا سلوک کرے گی، اسی لیے کسی نیک خوخاندانی لڑکی کی تلاش تھی۔ ہما ہر لحاظ سے بہتر ہے کہ اپنی ہے اور خوش مزاج بھی ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں ایک سال ٹھہر جائیں۔ بچی بھی سمجھ دار ہو جائے گی، ہما بھی اچھی طرح سوچ لے۔"

خالہ نے بیٹے کو آگاہ کیا۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ یوں تو اشفاق ہر لحاظ سے بہترین تھے۔ معاشی طور پر مضبوط، نگران کے ساتھ ان کی بیٹی تھی۔ سنا کہ وہ بہت جذباتی بھی ہیں۔ اس کے بارے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے، ہر جگہ اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔

انصر ایک دن لاہور گئے۔ رات کو واپس آگئے۔ اشفاق سے ملے، گھر دیکھا، ان کا رویہ، اخلاق سے متاثر بھی ہوئے۔ بچی۔ ان سے الگ ہی نہیں ہوئی۔ بس کچھ پریشان کن بات تھی۔ پتا نہیں، ہما معاملے کو سنبھال بھی سکے گی، وہ ایک بے فکر لا ابالی سی لڑکی، بچی یا شوہر کے ساتھ، کس طرح کا واسطہ ہوگا اور ان کی توقعات اور امیدوں پر پوری اتر بھی سکے گی۔

دراصل انہیں ہما کی خوشیوں سے [illegible] بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ بہت بڑی [illegible] ذمہ داری تھی ان پر۔

اسریٰ کے لیے اس [illegible] چچا کے بیٹے کا رشتہ آیا۔ اختر لندن پڑھنے گیا تھا۔ وہیں جاب مل گئی۔ انصر نے سوچا اسریٰ کا نکاح ہما کی شادی ساتھ کردیں گے۔

اسریٰ کو پتا چلا خوب شور مچایا، وہ لندن جانا نہیں چاہتی تھی اور شادی کے لیے تو تیار ہی نہ تھی۔

"لندن بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔" وہ چیخی۔

"بس سیر کے لیے جاؤ اور آجاؤ کافی ہے۔"

انصر نے کہا۔ "چپ رہو، ورنہ میں اشفاق بھائی سے تمہاری شادی کرا دوں گا۔ وہ لندن جاتے رہتے ہیں گھر لائیں گے سیرو تفریح۔"

اسریٰ نے سریلی چیخ ماری۔ "ہائے نہیں، میں بڈھے سے تو کبھی شادی نہیں کروں گی۔"

انصر نے ماں کو دیکھا، فیصلے کے لیے کسی اشارے کے منتظر انصر نے فیصلہ کرلیا۔ احمر۔

"ہے بیٹے! انصر! کچھ عقل سے کام لے، کہاں اشفاق، اس کا محل، دولت کے انبار، اور کہاں یہ احمر، معمولی تنخواہ، لوگ کہیں گے، لڑکی بوجھ تھی بوجھ اتارا ہے۔"

"اماں! لوگوں کو اتنی فرصت نہیں کہ جستجو کریں، پریشان نہ ہوں۔"

"ارے بھیا! اپنا خاندان، کیا خوش اور پھر پیسے کی ریل پیل، عیش آرام۔"

"خاندان۔۔۔ تو [illegible] ضروری نہیں ہے، میں ہما کے کاندھوں پر اشفاق بھائی کی دولت کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر وہ اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکی تو جھک جائے گی یا [illegible] جائے گی۔ عمر کے فرق کی وجہ سے ذہنی مطابقت نہ ہو سکی تو مرجھا جائے گی۔ احمر کے ساتھ کم از کم ذہنی عمر کی برابری تو ہوگی۔ اور احمر کا رزلٹ آگیا ہے ایم بی اے میں پوزیشن لی ہے اس نے۔ ترقی کرے گا اور باقی سب قسمت پر چھوڑ دیں، اپنی طرف سے تو میں نے بہتر فیصلہ کیا ہے، دعا کریں کہ ہما بہت خوش رہے۔"

خالہ پر فکروں کا بوجھ لاد کر وہ بے فکر ہو گئے۔ انصر نے لاہور آفس اور عظمت صاحب سے بھی احمر کے بارے میں معلوم کیا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا سنجیدہ اور سادہ طبیعت کا ہے۔ دونوں طرف سے یہ ہی اطلاع ملی تھی۔ ذکیہ آپا سے انصر نے ہی بات کی۔ معذرت اور جلدی شادی کا پروگرام، بہتر رشتہ ملنا ادھر سے بھی عجلت اور تقاضے، ذکیہ آپا کو مایوسی ہوئی۔ مگر کیا کہتی، ہما سے بھابھی نے دونوں کے بارے میں رائے لی تھی۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی، سوائے اس کے کہ خالہ اور بھائی کو اختیار ہے۔

☆ ☆ ☆

ہما کی شادی کے دن ہی اسریٰ۔۔۔ کی بارات بھی تھی۔ دونوں کے نکاح ہوئے۔ اسریٰ کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر بھی اس نے اختر کو کہنی مار کر کہا۔

"کیا جلدی تھی، میں کہیں بھاگی جا رہی تھی؟ اب چین آیا؟"

"ہاں بہت۔" اختر نے بھی کیمرے کی طرف مسکراتے ہوئے تصویر بنواتے ہوئے زیر لب کہا۔ "کیا بھروسا تھا تمہارا۔"

اسریٰ کے منہ سے حسب عادت چیخ نکلی۔ "پھر کیوں؟ پیچھے پڑ گئے تھے؟ بھروسا نہیں تھا تو۔"

"عادت، ضرورت، محبت۔" اختر کھل کر ہنسا۔ بھابھی نے اسریٰ کو گھور کر دیکھا۔

"کیمرے کے سامنے تو تماشا نہ دکھاؤ اسریٰ۔ خاموش رہو، ہما کو دیکھا ہے، کیسے مشرقی دلہن کی طرح بیٹھی ہے۔ ایک تم ہو، ہاتھ کھلا، آنکھیں کھلی، منہ کھلا ہوا۔" انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

"مجھے ابھی رخصت نہیں ہونا۔ اس لیے بول رہی ہوں بعد میں تو۔۔۔ منہ بند کر کے کان کھولنے پڑیں گے سننے کے لیے، صرف۔"

"اچھا۔۔۔ تو میں ابھی اماں سے رخصتی کا کہتا ہوں۔"

اختر کی بن آئی۔ نکاح ہو چکا تھا۔ اب کون اعتراض کرتا۔ بے چاری اسریٰ ہکا بکا سی اماں اور چچی کے مذاکرات کے نتیجے کا انتظار کرنے لگی۔ نتیجہ تو برعکس تھا۔ خاصی سراسیمہ ہو گئی اور وقت رخصت اس نے اختر کے کئی بار کہنی ماری۔ اور بازو پر چٹکی لی۔ وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

اسریٰ کی بے چارگی پر ہما کو ہنسی آگئی۔ کس طرح مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی روتی ہوئی جا رہی تھی۔

ہما رخصت ہو کر لاہور آئی، ولیمہ میں اشفاق بھائی اور زہرا آئے تھے۔ زہرا بہت خوش تھی۔

"دیکھا کیا کہا تھا میں نے، تمہاری سسرال لاہور میں ہو تو ملنا ممکن ہے اور وہ ہو گئی۔ دعائیں دو ہمیں، اب میں تو روز آؤں گی تنگ آجاؤ گی۔"

http://www.pakfunplace.com

ہما بھی اس سے مل کر خوش ہوئی۔ ذکیہ آپا کے شوہر بیمار تھے۔ اس لیے وہ نہیں آئیں۔ اوکاڑہ سے خالہ، بھائی، بھابھی اسریٰ اور اختر بھی آگئے۔ ان کا ولیمہ ایک ہفتے بعد ہونا تھا۔ رخصتی جو آنا"فانا" ہوئی تھی۔

ولیمہ کے لیے پروگرام بعد میں طے ہوا، اشفاق بھائی نے ہما کے جہیز اور دولہا کی سلامی کے نام سے پچاس ہزار کا چیک دیا۔

"یہ ہمارے ہنی مون کے لیے ہے۔" اس نے طے کیا اور احمر کو بتا دیا۔ اسے کیا اعتراض ہوتا۔ دس دن مری، بھوربن، نتھیا گلی، چترال، ناران، ایوبیہ کی سیر کر کے آئے تو فوراً اوکاڑے جانا پڑا۔ اسریٰ کا ولیمہ، اوکاڑہ میں سب سے مل جل کر اپنی سیر کی داستان سنا کر واپس لاہور آگئے۔ خالہ اسے خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔

اسریٰ کو بھی اشفاق بھائی نے چیک دیا تھا۔ وہ اس نے بینک میں جمع کرا دیا اور اختر کے خرچ پر مری نتھیا گلی کی سیر کو چلی گئی۔

ہما اس کی ہوشیاری پر حیران ہو گئی۔

"ہائے مجھے یہ عقل کیوں نہ آئی۔ اچھی خاصی رقم ہوٹلوں کے کمروں اور ٹیکسی کے کرایوں میں پھونک دی۔" لیکن کچھ دن بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ احمر اپنے خرچ پر کبھی نہ لے کر جاتا "چلو، رقم تو بچتی نہ جانے اتنی لمبی سیر کو مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔"

احمر نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ مزے سے پیسہ اڑاتا رہا اور بھلا اسے اعتراض بھی کیوں ہوتا۔ کون سا اس کی جیب سے خرچ ہوا۔ اور وہ ویسے بھی اپنی کم حیثیتی کا رونا روتا تھا۔

ذکیہ آپا نے نئے دولہا دلہنوں کی دعوت کی۔ اسریٰ کے ساس، سسر، اختر کے علاوہ خالہ اور بھائی، بھابھی آئے۔ زہرا بھی میاں کے ساتھ آئی تھی۔ مستقل ہما کے ساتھ لگی رہی۔ ہما سب سے دوبارہ مل کر بے حد خوش تھی۔ اوکاڑہ جانے کو دل چاہتا تھا سب سے ملنے کے لیے۔ ذکیہ آپا کی بدولت سب سے مل لی۔

☆ ☆ ☆

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ ہما کو بہت سی نئی باتوں کا ادراک ہوا۔ ساس اماں بے حد مہربان اور شفیق، نند بس خوش مزاج، احمر کا کچھ صحیح پتا نہ چلا۔ کبھی نرم، کبھی گرم، کبھی خاموش اور سنجیدہ۔ کبھی بہت خوش مزاج، ہما کو اندازہ تھا کہ اسے احمر کے ساتھ خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ اپنے دل کو سمجھانا ہو گا۔ ضبط سے کام لینا ہو گا۔ اپنے لاابالی پن کو خیرباد کہنا ہو گا۔

ایک سال بعد۔ ذکیہ آپا نے بھائی کو آخر کار سہرا بندھا دیا۔ ہما شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ وہ اسپتال میں تھی۔ صبح اس کے لیے خوش خبری لے کر آئی تھی۔ وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی تھی۔ تیسرے دن وہ بچے کو لے کر گھر آگئی۔ سب بہت خوش تھے۔ احمر بھی، زہرا اسے مبارک باد دینے آئی تو اشفاق بھائی کی دلہن کی تصویر بھی لائی، پکی عمر کی خاتون تھیں۔ مگر۔ خوش نظر آرہی تھیں۔

بعد میں کئی ماہ بعد پھر زہرا آئی تو اس نے بتایا۔

"بھابھی خود کو بہت بنا سنوار کر رکھتی ہیں مگر ہیں بہت معمولی شکل کی، مگر بچی کا خیال بہت کرتی ہیں۔ صرف اشفاق بھائی کے سامنے۔ تیز طرار ہیں۔ بھائی مٹھی میں لے لیا ہے۔ مگر خیر گھر سلیقے سے چلا رہی ہیں۔ بھائی مطمئن نہیں۔ انہیں کوئی کمی سی لگ رہی ہے، پتا نہیں کیا؟ مزید خاموش اور سنجیدہ ہو گئے ہیں حالانکہ اتنے سنجیدہ تو وہ کبھی نہیں تھے۔"

"پہلی بیگم کا خیال آجاتا ہو گا۔ کچھ پتا چلا؟ زندہ ہوتیں تو اب تو آہی جاتیں ۔۔۔ مردوں کی بے وفائی ثابت کرنے کے لیے۔"

ہما کو فکر لگی۔ "زندہ یا مردہ، کچھ تو ثابت ہو، کہیں یک دم اچانک آ پہنچیں، تو؟ کیا ہو گا، اشفاق بھائی تو خوش ہو جائیں گے مگر ۔۔۔ بیگم؟ ان کا کیا بنے گا؟"

زہرہ ہنسی۔ "اوہ، تمہیں یاد ہے ارے وہ تو پرانی بات ہو گئی۔ اب تو ان کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔ بس ان دنوں کچھ ایسا شک ہوا تھا۔ حیرانی سی تھی، حالات ہی کچھ پراسرار تھے۔"

"فرض کرو وہ واقعی زندہ ہوئیں، آگئیں تو؟ ان تازہ بیگم کا جانا آسان تو نہیں ہو گا، دونوں ساتھ رہ لیں گی؟"

"جس سے زیادہ محبت ہو گی اشفاق بھائی کو، اسے قربانی دینا پڑے گی، لگتا تو ہے ایسا۔"

"تو اور سنو، پھر تو پہلی کو ہی جانا ہو گا" "یہ کیا بات ہوئی، محبت کا قتل توبہ توبہ۔"

"اوہو بھئی جب پہلی سے بے وفائی کر ہی لی، دوسری شادی کر کے تو دوسری ہی اہم ہوں گی کہ تازہ تازہ ہیں، پہلی تو یوں بھی قصہ پارینہ بن گئیں، پرانی دھرانی بوسیدہ، ان کی کیا ویلیو رہ گئی" "آثارِ قدیمہ۔"

"ہائے۔۔۔ تو پھر یہ محبت تو نہ ہوئی۔ محبت تو جتنی پرانی ہوتی اتنی ہی مضبوط ہوتی۔"

"اب۔۔۔ زمانہ بدل گیا ہے، چلو چھوڑو یہ محبت کا پرانا فارمولا، یہ بتاؤ میاں صاحب کے کیسے مزاج ہیں۔" زہرا اسے چھیڑ کر پوچھنے لگی۔

"کیا مطلب، جیسے تھے ویسے ہیں، اب تو بیٹا بھی آیا ہے خوش ہیں۔" ہما اس کے سوال پر حیران ہوئی۔

"تو۔۔۔ بیٹا کیا سونے کے محل لے کر آیا ہے جو خوش ہیں، پہلے خوش نہیں تھے؟"

زہرا عجیب سی باتیں کر رہی تھی، ہما سمجھی نہیں۔

"بھئی سننے میں آیا ہے کہ ۔۔۔ معاف کرنا تمہارے میاں کچھ اول جلول سی حرکتیں کرنے لگے ہیں، آفس والوں سے آئے دن بحث بحث، فضول ختم کے جھگڑے۔"

"پتا نہیں، آفس کی باتیں وہ گھر میں نہیں کرتے۔"

"اچھا ہی ہے۔" زہرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بچے کے لیے بہت سے تحائف لائی تھی۔ کچھ ذکیہ آپا نے بھیجے تھے۔ زہرا کے جانے کے بعد وہ اس کی لائی ہوئی چیزیں ساس کو دکھانے لائی۔

احمر آیا تو اسے بھی دکھایا، اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

"زبردستی کا احسان۔"

"احسان؟" وہ حیران ہو گئی۔ "احسان کی اس میں کیا بات ہے؟ میرے رشتے دار ہیں۔"

"رشتے دار؟ کبھی پہلے تو ملیں نہ دیکھا، اب اچانک رشتے نکل آئے۔" احمر کا موڈ شاید پہلے سے خراب تھا۔ ہما نے خاموشی اختیار کی، اماں نے مگر سمجھایا۔

"یہ احسان نہیں محبت کا اظہار ہے۔ اپنے عزیز ہی نہیں، غیر لوگ بھی، پڑوسی، ملنے جلنے والے بھی بچے کی پیدائش پر خوشی کے اظہار میں تحفے دیتے ہیں اور یہ تو ہما کے میکے والے ہیں۔ ہما کی خوشیوں میں حصہ دار، تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

احمر چپ رہا، اماں کے سامنے زیادہ نہیں بولتا تھا۔ مگر چہرے پر اعتراض کا بورڈ لٹکا رہا، ایک دن بڑے عجیب لہجے میں کہنے لگا۔

"بھئی واہ، اشفاق سر نے آخر شادی کر ہی لی، اب تم پچھتا رہی ہو گی کہ ایک سال اور کیوں نہ انتظار کر لیا۔"

"میں کیوں پچھتاتی؟ میرا کیا تعلق، وہ سال دو سال چار سال بعد کرتے یا نہ کرتے۔"

"کیوں۔ انہوں نے تم سے شادی کی درخواست کی تو تھی اور ان سے شادی کر کے تم خوب دولت مند ہو جاتیں۔ سونے میں پیلی، موتیوں میں سفید، دولت بہت بڑی طاقت ہے۔"

"میرے پاس اس سے بھی زیادہ دولت موجود ہے میرا بیٹا، مجھے سونے اور موتیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا بیٹا سونے، چاندی اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے۔" اس نے بیٹے کو سینے سے لگایا، اور اسے پیار کرنے لگی۔

"یہ بیٹا تو اشفاق سر بھی تمہیں دے ہی دیتے۔" احمر لاپروائی سے بولا۔

ہما چونک کر حیرت اور تاسف سے احمر کو گھورنے لگی۔ (کیا بکواس ہے؟)

"اوہو۔ یہاں تو نہ نوکر چاکر ہیں نہ ہی عیش آرام، وہاں تمہیں ہل کر پانی نہ پینا پڑتا۔"

ہما منہ بنا کر سامنے سے ہٹ گئی۔ جواب تو تھا اس کے پاس مگر وہ بات بڑھانے سے ڈرتی تھی۔

"ویسے انہیں ٹھکرا کر اپنے لیے کانٹے ہی بوئے

http://www.paktunplace.com

ہیں۔ ارے وہاں تو بیگم کے لیے نئی گاڑی لے لی ہے' ٹھاٹھ ہیں نئی بیگم کے' اڑی اڑی پھرتی ہیں۔"

"تو؟ کیا کروں؟ میں بھی گاڑی میں ہر جگہ جاتی ہوں' پیدل نہیں پھرتی۔"

"اف وہ۔ سوزوکی کہاں اور ان کی وہ شان دار بی ایم ڈبلیو کہاں' خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی تم نے۔"

"میں ایسے فضول خواب نہیں دیکھتی۔" وہ چڑ کر باہر چلی گئی۔ احمر کا مزاج بدل سا گیا تھا۔ کچھ عجیب سا روکھا پھیکا' بے نیاز سا' اس نے خود پر کوئی نقاب پہنا ہوا تھا۔ کچھ دن بعد پھر ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہما پر مہربان' بچے کو سیر کرانے لے جاتا' گھر میں دلچسپی لیتا اور کبھی پھر چپ کا دور' غلطی کی بارش۔

ہما کو زچ کرنے کے لیے اشفاق سر کا نام ہی کافی تھا۔ اور وہ واقعی ان کے نام سے بے زار ہو گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ رقابت ہے یا پھر شک' بظاہر وہ شکی تھا ہی نہیں بس اشفاق سر کے لیے ہی مزاج برہم ہو جاتا۔

ایک دن تو وہ ساس سے شکایت پر مجبور ہو گئی۔ اماں نے احمر کو ڈانٹا' سمجھایا' احمر کا غصہ قابو سے باہر ہو گیا۔

"کیوں کی شکایت؟" ہما پر چیخ چلا کر غصہ اتارا' اور کمرے کی ہر چیز ادھر سے ادھر کر دی۔ کچھ بھی جگہ پر نہ رہا۔ ہما ڈر گئی۔ احمر کی بدمزاجی اور پھر کمرے کی درستی' دن بھر بھی مصروفیت' گھر کے کام' کھانا پکانا' بچے کا خیال رکھنا' ساس کو بھی اس کی ضرورت تھی۔ اوپر سے احمر نواب صاحب کی تخریب کاری۔ تھک کر چور ہو گئی۔ کھانے کے لیے بھی اٹھا نہ گیا۔ بستر پر پڑی رہی۔

ساس نے احمر کے سامنے صفائی دی۔

"تم جو بکھیڑا پھیلا گئے تھے انہیں سمیٹا' کھانا پکایا' بچے کے لیے سیریلک بنا کر کھلایا' تھک گئی بچی' تم کس قدر بے حس ہو گئے ہو احمر۔ بغیر قصور کے سزا دینا گناہ میں شامل ہے۔ طاقت سے زیادہ محنت کرتی ہے۔ تمہارے گھر کو بنانے سنوارنے میں کس قدر مصروف رہتی ہے اور تم۔"

"کیا کروں میں؟" چڑ گیا۔ "گولڈ میڈل پہناؤں' ایوارڈ سے نوازوں۔"

"یاد رہے یہ وہی گھر ہے' جہاں ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ فضول کاغذ' شاپر' کوئی چیز تلاش کے بغیر نہ ملتی تھی۔ تمہاری بہنوں کو گھر سے دلچسپی تھی' نہ صفائی سے' میں کیا بیمار ہوئی کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ اب۔ وہ ہی گھر آئینہ بن گیا ہے۔ ہر کام وقت پر اور سلیقے سے' کس کی وجہ سے؟ ہما کی محنت اور سلیقہ' میں تو اپنی بیماری سے ڈر گئی تھی۔ اسی لیے تمہاری شادی میں جلدی کی۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہما اس گھر میں آئی۔ گھر کا حلیہ بدلا سو بدلا' میری بیماری بھی آدھی رہ گئی' بیٹا قدر کرنا چاہیے' خوش قسمتی ہے ہماری۔"

احمر چپ چاپ سنتا رہا' پتا نہیں اماں کی نصیحت نے کتنا اثر کیا تھا۔ ظاہر تو کچھ ہوا نہیں' ہما کی اداس صورت دیکھ کر اماں نے اسے بھی تسلی دی۔

"پریشان نہ ہو بیٹا! کبھی کبھی اس پر غصہ سوار ہو جاتا ہے' اب تو بہت دن کے بعد دورہ پڑا ہے' پہلے تو اکثر جنون سوار ہو جاتا تھا۔ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔"

دورے۔ آپے سے باہر' جنون' ہما چکرا گئی۔ "اماں تو۔ آپ نے علاج نہیں کرایا؟ کبھی اس طرح کے دورے سے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ اکثر۔ وہ تو نفع نقصان کی پروا کیے بغیر غصے میں اندھا دھند فضولیات بکتا' توڑ پھوڑ کرتا اور۔ کبھی کبھی اپنا سر بھی دیوار سے ٹکراتا تھا۔"

نفع نقصان کی پروا کیے بغیر' یہ تو بہت خطرناک بات تھی۔ وہ حیرت سے اماں کو تک رہی تھی' کس قدر بے فکری سے بتا رہی تھیں۔

"آپ نے۔ علاج کیوں نہیں کروایا۔ یہ اچھی بات تو نہیں۔"

"علاج؟ ارے بیٹا۔ جیسے جنون چڑھتا ہے' اتر بھی جاتا ہے' علاج کیا ہوتا' اصل میں گھر کے حالات' باپ کے مرنے کے بعد کم عمری میں اس پر ذمہ داریاں پڑ گئیں گھر کی۔ پھر بہنیں لاپروا اور بے نیاز' میں بیمار' غصہ آتا تھا' بڑھتا گیا' پھر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی' فکر نہ کرو' ٹھیک ہو جائے گا۔"

اماں بڑی ہمت والی تھیں۔ مگر ہما کی جان پر بن گئی' جنون' خطرناک ہوتا ہے' اور اگر یہ صرف غصہ ہے تب بھی انتہا تک پہنچ کر جنون بن سکتا ہے۔ اسے معمولی سمجھنا غلطی ہے۔ وہ پہلے بھی محتاط تھی۔ اب اور بھی ہوشیار ہو گئی۔ احمر کو خوش کرنے کے سارے جتن کرتی' بس اسے غصہ نہ آئے۔

اب اماں کے سمجھانے کا اثر تھا یا اسے احساس ہو ہی گیا۔ وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ بلکہ بہت خوش رہنے لگا۔ آفس کی باتیں بتاتا' دوستوں سے ملوانے لے جاتا' بچے کے لیے شاپنگ کرتا' ہما بھی خوش تھی۔ اس لیے بھی مزاج اعتدال پر تھا' کیونکہ دورے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔

☼ ☼ ☼

اس دن زہرا آئی' کافی دن بعد آئی تھی' کچھ فکر مند' ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کچھ اٹکتے ہوئے بتایا۔

"اشفاق بھائی کی بیگم چلی گئیں' کافی کچھ لوٹ کر بٹور کر لے گئیں۔ ان کے جانے کے کئی دن بعد بھائی کو علم ہوا کہ وہ خاصی رقم اور مزید قیمتی اشیاء زیورات کے علاوہ لے گئی ہیں۔ بھائی نے انہیں طلاق دے دی' بہت پریشان رہے' اب کچھ اطمینان سے ہیں۔"

ہما کو افسوس ہوا' ہائے بے چارے اشفاق بھائی' کیسی قسمت ہے' زہرا کے جانے کے بعد وہ اماں کو سنانے آئی' ابھی پورا واقعہ سنایا بھی نہیں تھا کہ احمر آگیا۔ وہ چپ ہو گئی' مگر وہ سن چکا تھا' یک دم چلانے لگا۔

"کیوں آتی ہیں یہ ہمارے گھر' ٹینشن پھیلانے' کیوں خبریں سناتی ہیں۔"

اماں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں کیں۔ ہما ٹھنڈا شربت بنا لائی۔

اس نے کہا۔ "تم بھی فون کرو اور آئندہ ادھر آنے سے منع کرو' چلو اٹھو۔"

جب تک اس نے اپنے سامنے فون کروا نہ لیا' اطمینان نہ ہوا' ہما بے حد شرمسار تھی۔ کچھ زیادہ کہنے کا موقع نہ تھا' سامنے بیٹھا گھور رہا تھا۔

"تم ہمارے گھر نہ آیا کرو۔" کہہ کر فون بند کر دیا۔

وہ بھی یقیناً حیران اور پریشان ہوئی ہوگی۔ اگلے دن پڑوس میں جا کر زہرا کو فون کیا' اپنی مجبوری بتائی۔

زہرا آگ بگولہ ہو گئی۔ "تمہاری مجبوری ہے میری نہیں' میں تو ملوں گی' آؤں گی' وہ ہوتا کون ہے منع کرنے والا' پاگل' اس کی خیریت پوچھوں گی اس کی۔"

ہما گھبرا کر اس کی خوشامد کرنے لگی۔

"کچھ نہیں سنوں گی' آؤں گی اور اس تک چڑھے جن کی خبر لوں گی۔"

ہما کے سر میں دھماکے سے ہونے لگے' یہ کیا ہوا' زہرا سے بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ کیا فائدہ ہوا سب کچھ بتا کر اور اب' اگر وہ احمر کی موجودگی میں آگئی' نہ جانے کیا ہوگا احمر کو۔ زہرا کا سامنا کرنے سے کس طرح بچائے' کوئی تدبیر نہ سوجھی' عقل گم تھی' کئی دن گزر گئے۔

پھر اس شام اس نے زہرا کو آتے دیکھا۔ وہ کمرے میں تھی' پھرتی سے الماری کھول کر کھڑی ہو گئی اور کسی ان دیکھی چیز کو تلاش کرنے لگی۔ دل تھا کہ باہر نکلنے کو بے تاب' برآمدے میں احمر اخبار میں گم۔ زہرا خوش طبعی کا مظاہرہ کرتی ہنستی بولتی آرہی تھی۔

"آہا۔ ہیلو ہیلو' بھئی خوش نصیبی ہے میری' آج تو دولہا بھائی کی زیارت ہو گئی اور کہاں ہیں یہ ہمشیرہ صاحبہ' ذرا خبر لوں' کہہ دیا ہمارے گھر نہ آنا' کیوں بھئی؟ کوئی وجہ ہی بتائی ہوتی' کیا خطرے ہیں مجھ سے' چور ہوں' تخریب کار ہوں' دہشت گرد یا قاتل' ملزم کو صفائی کا موقع بھی ملنا چاہیے۔" وہ احمر کے کانوں میں گھس کر تقریر کر رہی تھی اور احمر اسے کچا چبانے کی خواہش میں حق بجانب ہوگا' اماں لپکتی آگئیں۔

"ارے' اپنی زہرا آئی ہے' بہت دن بعد آئی ہو' تو

بیٹھو۔"

"آداب اماں! روز تو آ نہیں سکتی اور اب تو آپ کے بیٹے نے پابندی لگادی ہے۔ اسی لیے آئی ہوں پوچھوں تو سمجھا کیا ہے انہوں نے یہ حکم دیں گے اور میں تعمیل کروں گی ہما سے ملنا چھوڑ دوں گی واہ۔"

بہت خفا تھی۔ احمر سٹپٹا کر کھڑا ہوگیا۔

"میں۔۔۔ کیوں؟ بھلا میں حکم کیوں دوں گا بہت عزت کرتا ہوں آپ کی۔"

زہرا اماں کی جانب بڑھی۔ "دیکھیں اماں! انہوں نے ہما سے فون کروایا۔ صرف یہ کہنے کے لیے کہ میں یعنی زہرا ان کے گھر نہ آؤں؟ کوئی الزام تو لگایا ہوتا مگر بس ایک جملہ اور کھٹ سے فون بند۔ چلیں ان کا گھر ہے جسے چاہیں بلائیں نہ بلائیں منع کریں اچھا نہیں آؤں گی اب تو اب ہما آئے گی ہمارے گھر۔ ہم لوگوں کے سوا اور اس کا کوئی عزیز ہے بھی نہیں یہاں آج تک ہمارے ہاں نہیں آئی کیوں؟ بندہ کسی سے تو ملے اور اچھا بھائی صاحب! آپ میری عزت افزائی نہ ہی کریں تو بہتر ہے مجھ پر پابندی لگا کر اب ہما کو ملنے جلنے کی اجازت دے دیں کیونکہ رشتے داری کے علاوہ میری تو دوستی ہے ہما سے۔"

زہرا کی زبان بھلا کون روکتا اماں بھی کچھ شرمسار تھیں۔ البتہ احمر جھٹکے سے اٹھا اخبار میز پر پٹخا غرا کر بولا۔

"تو ٹھیک ہے لے جایئے اپنی رشتے دار کو بے شک ہمیشہ کے لیے۔"

اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ اندر ہما الماری کھولے ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ ہونق چہرے کے ساتھ اس کو سرخ آنکھوں سے گھورا۔ گرج کر بولا۔

"جاؤ چلی جاؤ اپنی رشتے دار کے ساتھ اور پھر مت آنا۔"

غالباً اس کی اتری ہوئی صورت اور بھیگی بھیگی آنکھوں میں بے چارگی دیکھ کر کچھ ترس آیا۔ کچھ نہیں بولا۔ وہ باہر جاکر زہرا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش

کرنے لگی۔ اماں بھی زہرا سے معذرت کررہی تھیں۔

"بس بیٹا غصے کا تیز ہے سمجھاؤں گی اسے آگے پیچھے کی کچھ سوچتا ہی نہیں۔"

"اماں! سوچنے کی اس میں کون سی بات ہے کیا رشتے داروں سے ملنا گناہ ہے؟ انہیں تو خود چاہیے تھا وہ ہما کو لے کر آتے ذکیہ آپا کے گھر ہی لے جاتے وہ تو کئی بار آئی ہیں یہاں۔"

زہرا شکوہ کرنے سے باز نہ رہ سکی۔ "اتنے قریبی رشتے ایک شہر کی رہائش آخر کیا اعتراض ہے ہم سے کوئی غلطی کوئی قصور ہوگیا ہے تو بتادیں ہم معافی مانگ لیں گے میں تو ڈھیٹ بن کر آجاتی ہوں کہ چلو بھئی ہما پر پابندی ہے تو میں تو مل لوں تو لوجی مجھ پر پابندی لگادی۔"

وہ آبدیدہ ہوگئی ہما شرمندہ۔ اماں بھی اسے منانے لگیں وعدہ کیا کہ وہ خود ہما کو لے کر ذکیہ آپا کے گھر آئیں گی۔

اس کے جانے کے بعد اماں نے احمر کی خوب خبرلی ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ اسے اپنی شرمندگی کا احساس دلایا وہ منہ پھلا کر بیٹھا رہا۔ اماں سے بحث کرتا بھی نہ تھا۔ شامت تو ہما کی آئی تھی شاید وہ آسان ہدف تھی غصے اور جنون کے لیے۔

ہما بہت پریشان ہوگئی ہمت پست ہوگئی نہ جانے کب کس بات کو بنیاد بنا کر وہ۔۔۔ پھر تو وہ ہنسنا بھول گئی اس کی خوش مزاجی اس کا بے پن کم ہوگیا اماں نے بہت چاہا وہ پہلے کی طرح باتیں کرے اپنی حماقتوں کے قصے سنا کر انہیں ہنسائے۔ مگر۔۔۔ وہ تو ہنسنا بھول چکی تھی۔ فکر اور پریشانی نے اس کے اعصاب بھی کمزور کردیے۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ایک ذمہ دار گرہستن ہے اس نے اپنی توجہ بچے اور گھر پر مرکوز کردی۔ احمر کو کسی بات پر غصہ نہ آئے یہ کوشش بھی کرتی۔

انصر بھائی نے اپنے دوست کا ذکر کیا تھا۔ جو خاصا معقول آدمی تھا مگر غصہ اس کا جنون کی حد تک تھا۔ ایک بار اسی جنونی کیفیت میں اس نے بیوی کو قتل

کرنے کی کوشش کی بچوں نے ماں کو بچانا چاہا تو اس نے بچوں کا لحاظ بھی نہیں کیا۔ انہیں زدوکوب کیا بمشکل گھر والوں نے اسے قابو کیا پھر اسے پاگل اسپتال میں داخل کیا گیا مگر اسے کوئی بیماری نہ تھی۔ چند دن نفسیاتی ڈاکٹر کے زیر علاج رہنے کے بعد وہ صحت مند ہوگیا۔ اس نے غصے کو پچھاڑنے کی تربیت حاصل کرلی۔ اللہ تعالیٰ نے غصے کو حرام کیا ہے۔ کسی بھی بڑے نقصان کا سبب بننے سے پہلے اس کا سدباب کرلیا جائے تو غصہ جنون نہ بنے۔ شروع میں ہی بچے کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لایا جاسکتا ہے نقصان کے بارے میں خبردار کیا جائے یا نفسیاتی علاج کرایا جائے۔ ایک شخص کی غلط حرکت پورے گھرانے کے لیے اذیت کا سبب ہوتی ہے۔

وہ اپنی پوری کوشش اور صلاحیت کام میں لارہی تھی۔ نہ وہ ذکیہ آپا کے گھر گئی نہ اماں نے لے جانے کا کہا ان ہی دنوں وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ دو بچے ان کی دیکھ بھال احمر کی نازبرداری اماں کی خدمت حسب سابق مگر احمر ان دنوں کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔

ہما کے ذہن پر بیٹی کا بوجھ تھا ایک اور عورت قسمت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا نہ جانے وہ کون سی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کے نصیب روشن ستاروں کی مانند ہوتے ہیں جگمگاتے جھلملاتے کرنیں بکھیرتے ہما پہلے خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی تھی ماں باپ کی اکلوتی ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔

پھر ماں باپ نہ رہے تو خالہ خالو کی شفقت مل گئی۔ اسے کسی محرومی کا احساس ہی نہ ہوا احمر کی صورت میں ایک رفیق حیات مل گیا۔ وہ کتنی خوش تھی۔ احمر کی محبت رفاقت ماں کا فرماں بردار سادہ طبیعت انسان اپنی خوش نصیبی پر کتنا ناز تھا اسے۔

نہ جانے پھر کس کی نظر لگی کہ وہ تو بدل ہی گیا۔ اسے اشفاق بھائی کے ذکر پر پتنگے لگ جاتے زہرا کی آمد پر مشتعل ہوجاتا یہ کوئی وجہ تو نہ ہوئی اگر ہما کوئی غلط

حرکت کرتی احمر کی مرضی کے خلاف پھر وہ معترض ہوتا تو ہما کسی طور منا بھی لیتی مگر۔۔۔ اشفاق بھائی کا نام لے کر خود ہی اسے جتاتا پھران کی دولت ثروت کا ذکر کسی طور اسے یہ جتاتا کہ وہ اعتراف کررہی ہے کہ یہاں اسے تکلیف ہے اشفاق سے شادی کرکے دولت میں کھیل رہی ہوتی۔

وہ کتنا یقین دلاتی کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی خود پر نفرین بھیجا کرتی کسی خوشی کی ترنگ میں اور کئی باتوں کے ساتھ اشفاق کا۔۔۔ رشتہ آنے کا ذکر کر بیٹھی۔ ذرا بھی اس کے اس قسم کے مزاج سے آگہی ہوتی تو وہ ذکر کرتی ہی کیوں جبکہ اس نے خود احمر کو ترجیح دی تھی۔

☼ ☼ ☼

زہرا نے آنا چھوڑ دیا اگر احمر کی موجودگی میں اس کا فون آتا وہ ٹال جاتی اب وہ احمر سے بھی مخاطب نہ ہوتی۔ اماں اس کی سنجیدگی اور رنجیدگی کو محسوس کرکے خود بے حد افسردہ ہوجاتی تھیں۔ ہما کا مسکراتے رہنا گنگناتے ہوئے گھر کے کام کرنا ہنس ہنس کر قصے سنانا سب قصہ پارینہ بن گیا تھا۔ وہ حد درجہ احتیاط سے کام کرتی کبھی اس سے کوتاہی ہوجاتے تو احمر اسی کو بنیاد بنا کر غصہ کرنے لگے۔ دن بدن خاموش ہوتی جارہی تھی اماں نے ایک دن سمجھایا۔

"بیٹا! اتنی فکریں سر پر سوار نہ کرو یہ فکریں انسان کو جونک کی طرح چمٹ کر خون چوس لیتی ہیں۔ اپنی جان پر ظلم نہ کرو ہنسو بولو وہ ہروقت تو جنونی نہیں ہوتا سال میں ایک بار ہی اسے غصہ چڑھتا ہے تم تو احمر سے بھی بات نہیں کرتیں مردہے کسی دن یہ بات بھی اس کے لیے ناگوار ہو۔"

ہما بے چارگی سے انہیں دیکھنے لگی اس کی کسی بات پر بھی تو بگڑ سکتا ہے خاموشی زیادہ بہتر ہے اس کے ذہن میں انصر کے دوست کا قصہ تازہ تھا۔ کاش کوئی احمر سے کہہ کر اسے نفسیاتی علاج کے لیے رضامند کرلے۔ مگر وہ کس سے کہے خود ہی چپ رہ کر اس

http://www.pakfunplace.com

کے غصے کی تند لو روک سکتی تھی۔

کچھ عرصے بعد پھر احمر کو اس سے شکایت ہوگئی کہ وہ احمر کو نظر انداز کر کے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ شوہر کے پاس کچھ وقت گزارے' اس کی بات ہی سن لے۔

ہما ڈر گئی' چلو جی' اب یہ بات بھی۔۔۔ اماں نے بیٹے کو سمجھایا۔

"ارے بیٹا! فرصت کب ملتی ہے بے چاری کو' گھر کے سارے کام' چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال' ان کی نگرانی' تمہیں بھی جو سنانا ہو' سنا ہی دیتے ہو' اتنا احساس نہیں کہ اس کی مشقت میں اس کی مدد کرو' کبھی بچوں کو سنبھال لو' تاکہ وہ سکون سے دوسرا کام کرلے' اس کی ہمت ہے کہ سارے کام وقت پر ہو جاتے ہیں' تمہیں اور مجھے وقت پر ناشتا کھانا مل جاتا ہے' گھر صاف' بچے صحت مند' اسی کی کوشش ہے' تھک جاتی ہے بچی۔"

"بس آپ کو موقع ملنا چاہیے' اس کی حمایت کا' سب عورتیں یہی کرتی ہیں' اس کا کیا کمال ہے۔"

"کمال ہی ہے کہ اکیلی عورت' جس کو شوہر کا ذرا سا تعاون بھی نصیب نہ ہو' وہ کس ہمت سے ہر قدم پر کامیاب ہوتی ہے' بیٹا جی شوہر کی حمایت محبت تعاون ہو تو یہ کمال نہیں' بڑی طاقت ہوتی ہے مرد کی محبت' تم مگر۔۔۔ اس احساس سے عاری ہو' مدد کرنا تو دور کی بات تعریف تک نہیں کرتے' اعتراض کروا لو بس' بہت ہی خود غرض ہو۔"

"تو۔۔۔ نہ کرتی مجھ سے شادی' میں بہت برا ہوں' کرلیتی اپنے امیر کزن سے' وہاں نہ کام کرنا پڑتا' نہ مشقت' نہ محنت' بس تعریفیں۔"

احمر پر غصہ سوار ہونے ہی کو تھا کہ اماں نے زور کا تھپڑ رسید کیا' غصہ انہیں بھی آگیا۔

"خبردار' بکواس کی تو' ایک پاک دامن' حیا دار عورت جس کو سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں بیاہ کر لایا' اس سے اس طرح سلوک ہوتا ہے' کم بخت' اس کی آہ نہ لے' برا انجام ہوگا' مجھے بھی شرمندہ کرتا ہے احمر' خدا کا خوف کر۔"

اماں سے وہ ڈرتا تھا' چپ ہو گیا' مگر وہ ہما سے تو نہیں ڈرتا تھا' ہما نے بہت نرمی اور سنجیدگی سے اس کو سمجھایا کہ وہ یہاں بہت خوش ہے' اس نے اپنے میکے میں جو زندگی گزاری ہے' یہاں بھی اسی طرح کا ماحول ہے' اس کے میکے میں نہ ہی خالہ کے گھر نوکر چاکر تھے۔

"میں اس زندگی کی عادی ہوں' اور پھر یہ میرا گھر ہے' اپنے گھر میں گھر والی ملکہ ہوتی ہے' گھر اس کی راجدھانی ہوتا ہے' میرا اور تمہارا یہ گھر ہی ہماری سلطنت ہے احمر! پلیز دل سے سارے شک نکال دو' بچوں کو ہمارے پیار کی ضرورت ہے' ہم دونوں کی سرپرستی کی۔"

احمر پر بھلا کیا اثر ہوتا' وہ اسے بھی بناوٹ ہی سمجھا' جب آدمی ضد پر آجائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے' بات جھگڑے تک پہنچ گئی تو ہما نے ساس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بہت مہنگی پڑی' نہ جانے اس سے کیوں غلطی ہو جایا کرتی تھی۔ لاکھ احتیاط کے باوجود زبان کھولنا جرم بن گیا۔

"میری ماں کو میرے خلاف ورغلاتی ہو۔"

کمرہ بند کر کے وہ اس کو اس جرم کی سزا دینے میں مصروف ہو گیا' تھپڑ گھونسے' جھنجوڑنا' ہما کی چیخیں نکل گئیں۔ بچے گھبرا کر رونے لگے تو بیٹے کو بھی تھپڑ مار کر چیخا۔

"چپ ہو جا' نہیں تو مار ڈالوں گا۔" ہما کی جان نکلنے لگی۔

باہر اماں دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھیں۔ ادھر احمر پر جنون طاری تھا' آخر خود ہی تھک کر دروازہ کھولا اور اماں کو نظر انداز کر کے باہر نکل گیا۔ حواس باختہ اماں اندر آئیں تو دیکھا' ہما رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی' ان کی مار سے بری طرح کراہ رہی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں چوٹ لگی تھی' اماں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

غم سے پانی پانی' منہ چھپا کر بیٹھ گئی' روتی رہی۔

"آخر آج کس بات پر دورہ پڑ گیا؟" اماں غصے میں بھی تھیں اور شرمندہ بھی۔ (دورے کے لیے کسی بات

کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔)

"بہانہ تو یہ ہی کیا کہ اماں کو ورغلاتی ہو' مگر۔۔۔ در اصل بات کچھ اور تھی' آفس میں کسی سے سن لیا تھا کہ اشفاق سر کے لیے ان کی بہنیں لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔ کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے' ہما سے کہہ رہا تھا اب بھی پچھتا رہی ہوگی کہ وہاں ہوتیں تو عیش کرتیں' انہیں شاید تمہاری ہی تلاش ہے۔ میں نے جل کر کہہ دیا' یہاں بھی عیش ہی کر رہی ہوں' زبان کھولنے کی سزا مل گئی۔"

"تو بیٹا' تم نہ بولتیں' ابھی تک چپ تھیں تو چپ ہی رہتیں' روز کی طرح۔" اماں بھی آخر اس کی ماں تھیں۔ پھر وہ اس کی حالت دیکھ کر رو رہی تھیں۔

"اماں! آخر کب تک چپ رہوں' نہ بولوں تو جھگڑا' بولوں تو لڑائی' کس عذاب میں ڈال دیا ہے مجھے۔" ہما رونے لگی' اماں اسے سہلانے لگیں۔

کئی دن اماں نے اسے دودھ میں ہلدی گھول کر پلایا' طاقت کی' درد کی گولیاں کھلائیں' اس کا جسم درد سے پھوڑا بن گیا تھا۔ احمر حسب سابق پر سکون ہو چکا تھا۔ اسے تو اپنے اندر کا جن نکالنا ہوتا تھا۔ احساس کس چڑیا کا نام ہے' وہ بھول چکا تھا۔

ہما اب اس سے خوف زدہ رہنے لگی تھی' ایک بار مرد کا ہاتھ اٹھ جائے تو پھر وہ نڈر ہو جاتا ہے اور اب وہ بہت بولنے لگا تھا' کبھی کہتا۔

"اماں! آپ کی بہو گھر سے جانے کے لیے پر تول رہی ہے۔ بھئی یہاں ہے ہی کیا' جو اسے روک سکے' نہ دولت' نہ سیر تفریح کے مواقع' میرا تو کوئی کزن بھی اس کے کزن جتنا امیر نہیں۔"

وہ' رہ رہ کر طنز کرتا' کچوکے لگاتا' اماں سر تھام کر رہ جاتیں۔

"دو بچے ہیں اس کا سرمایہ' احمر ہوش میں آؤ' فضول بکواس نہ کرو' کہاں جائے گی وہ' سب کچھ تو اس گھر پر قربان کر دیا ہے' نہ رنگ روپ رہا' نہ صحت' ارے پاگل' قدر کر اس کی۔"

"آج کل کی لڑکیوں میں وفا نہیں ہے اماں! انہیں خالی خولی قدر دانی نہیں' زر و جواہر بھی چاہئیں' کہاں سے لا کر دوں دولت کے انبار' سونا چاندی' جو میری قدر کرے۔"

"اسے تمہاری محبت کی ضرورت ہے صرف محبت اور اعتبار' بیٹا ذرا سی محبت دو' وہ تمہیں وفا کے موتیوں کے ہار پہنائے گی' وہ ایک وفا شعار بیوی ہی نہیں ماں بھی ہے۔ بے وفا ہوتی تو کب کی سب کچھ چھوڑ کر چلی جاتی' تم سے ملا ہی کیا ہے اسے' طعنے اور مار۔"

"واہ جی' یہ تو لوٹے بدلے کا سودا ہوا' پہلے میں محبت کروں گا تو یہ وفا کرے گی' ورنہ۔۔۔ چلی جائے گی۔" احمر کا ذہن اس کے چلے جانے کے خدشے میں الجھ گیا۔

"کہاں چلی جائے گی' اس کا تو میکہ بھی نہیں' اب تو ہم ہی اس کے سب کچھ ہیں۔"

"ہم ہی اس کے سب کچھ ہیں۔" احمر نے دہرایا۔

"وہ بھی تو ہماری بن کر دکھائے' تب جانوں۔"

اماں نے کس کس طرح سمجھایا' مگر ادھر تو رگ ٹیڑھی ہوئی' وہ سیدھی نہ ہو سکی' ذہن میں جو بات جم گئی تھی وہ کیسے نکلتی۔

"ہاں بھئی' پھر کب جا رہی ہو اپنے سرمایہ دار کزن کے گھر۔"

ہما سر تھام کر رہ جاتی۔ "اماں' یہ سائیکو کیس ہے' خدا کے لیے کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کریں' کسی اچھے ڈاکٹر کو حال بتا کر اس سے پوچھیں' ہو سکتا ہے وہ کچھ علاج بتائے۔"

اماں کس سے مشورہ کرتیں' بیٹے کے سامنے اس کے علاج کا ذکر کر کے جنون کو آواز دینا' مگر دبی زبان سے اتنا کہا۔

"احمر' خود کو سنبھالو بیٹا' اپنی بد گمانی اور غصے پر قابو پاؤ' کہیں کچھ نقصان نہ ہو جائے' سنا ہے غصے میں پھرنا۔۔۔ ٹھیک نہیں ہوتا' علاج ہوتا ہے اس کا۔"

پھر تو وہ ہنگامہ ہوا کہ۔۔۔ اماں کانوں میں انگلیاں ڈال

http://www.pakfunplace.com

کرچیخ اٹھیں احمر کی چیخ چنگھاڑ کی زد میں ہما آگئی تھی۔

اسی دوران احمر کی چھوٹی بہن بہنوئی آگئے۔ ان کے سامنے بھی احمر ہما پر برستا رہا ہما کو سب کے سامنے اپنی ذلت کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ جانے کا سوچنے لگی مگر جائے تو کہاں اس نے کبھی خود کو بے آسرا یا مجبور نہ سمجھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد بھی خود پر ——— بے بسی یا لاچارگی کا احساس طاری نہ ہونے دیا۔ ہاں... مگر اب وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ ان حالات میں ماں باپ کی سرپرستی اس کی طاقت ہوتی شادی کے بعد اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ مگر اب اسے ہر چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ محبت مروت تحفظ خوشی اطمینان یا امید کچھ میسر تھا نہ یقینی شادی کیا عارضی سہارا ہوتی ہے؟ آخر کس طرح اپنا اعتبار بحال کرے۔ احمر تو بدگمانی دور کرنے کو تیار نہ تھا مگر آج اسے اپنا ہر جذبہ احساس مروت آگ کے شعلوں میں گھرا نظر آرہا تھا۔

اس نے بیگ میں چند جوڑے کپڑے رکھ لیے کہیں بھی جانے کے لیے۔ وہ دیکھتا رہا اور تمسخر اڑاتا رہا اماں ہی آگے آکر معافیاں مانگتی رہیں قسمیں دیں وعدے کیے محبت اور خوشامد کرکے اسے روکا ورنہ۔ (کہاں جاتی؟)

وہ کوئی جذباتی الھڑ لڑکی نہیں تھی خوش مزاجی لاابالی پن بے نیازی اس کی فطرت میں تھی مگر اب نہیں۔ بہت سمجھ داری سے حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ہمت حوصلے کے ساتھ مگر احمر نے اسے اندیشوں کا راستہ دکھا دیا تھا۔ وہ اب خوف زدہ تھی۔ احمر اتنا تو سمجھتا تھا کہ دو بچوں کی زنجیر اسے کسی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روکے گی یہ سچ تھا مگر برداشت کب تک آزماتی آج ہما کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے کسی بھی طرح قائل نہیں کر سکے گی اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکے گی کیونکہ اس کی ضد بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی زبان کھلتی جارہی تھی۔ اب تو اماں بھی اسے چپ نہیں کرا سکیں۔

بہن نے اس کی حمایت میں کچھ کہا تو اسے گھر سے نکلنے کا حکم سنا دیا۔ وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ دوسروں کے سامنے بھی اس کے کردار پر چھینٹے اڑاتا رہا بہنوئی دل میں کیا کہتا ہوگا ہما کا دل چاہا وہ ابھی مر جائے مگر وہ بھی آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی اوپر سے اس کے طنز۔

"ہاں بھئی کیا ہوا کیا پروگرام ہے اب اماں کے روکنے کا بہانہ بھی خوب ہے چلو حوصلہ تو بڑھ گیا اب کس دن بیگ تیار کرو گی؟ آخر ارادہ کر لیا تھا پورا تو کر لیتیں یہاں کی تکلیفوں سے نجات مل جائے گی۔ کھانا پکانا برتن دھونا صفائی کرنا اور صاحب آئے گئے کی خاطر تواضع اف کاموں کی زنجیر لمبی ہے اور وہاں... واہ مزے بھئی عیش تو کزن کے گھر میں ہے۔"

کاموں کی زنجیر میں اپنی نازبرداری بچوں کی نگہبانی کا نام ہی نہ لیا۔

"اماں تم لکھ کر رکھ لو کسی بھی دن نکل بھاگے گی بہو آپ کی۔"

اماں بھی اب اس کی بکواس سے پریشان ہو گئی تھیں۔ بچپن میں ضدی تھا۔ مگر بڑے ہونے پر غصیلا بھی ہو گیا جب تو اکلوتے بیٹے کے لاڈ اٹھائے جاتے رہے اس کی ضدیں پوری کی جاتی رہیں باپ کی وفات کے بعد ذمے داریوں کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا تو بپھر جاتا مگر اب تو حد سے آگے تک پہنچ گیا تھا۔

ہما کو بچوں کی فکر تھی کبھی بھی انہیں نقصان پہنچا سکتا تھا مگر شاید کافی بچوں کی خاطر اس نے سہہ لیا پھر سے نارمل ہو گیا۔ بظاہر اماں کے بچانے یا وظیفوں کی برکت تھی یا شاید ہما کے جانے کی دھمکی سے ڈر گیا لیکن جب نفع نقصان کی پروا ہی نہ ہو غصہ عروج پر جنون پاگل پن کی حد تک ہما بھی عجب مزاج لائی تھی بہت جلد بہل جاتی تھی طوفانی لہروں سے بچ نکلنے کے بعد۔ پھر پرامید ہو جاتی اور نئی توقع کے ساتھ حوصلہ بلند ہو جاتا۔

اور اس بار تو کئی ماہ بہت اچھے گزرے شاید وہ کچھ لاپروا ہو گئی احتیاط کا دامن چھوٹ گیا خوشیوں کا اعتبار

http://www.pakurduplace.com

جاتا رہا' وہ سمجھ رہی تھی اماں کی دعائیں اور وظیفے احمر کو راہ راست پر لے آئے ہیں۔ اس نے بھی خدمت اور فرماں برداری کی انتہا کر دی تھی اور احمر نے بھی۔ انتہا کر دی' بہا لے گیا ساری امیدیں' جلا دیں ساری خوشیاں' "آتش فشاں پھٹ گیا' لاوا اگل رہا تھا اور کئی زندگیاں اس لاوے کی نذر ہو گئیں۔ اسی لاوے میں جھلستی جلتی ہوئی۔ خطرے کے آخری نشان تک پہنچ کر اسی منزل پر پہنچ گئی' جہاں سے چلی تھی' خالہ کے گھر تک۔ کئی ماہ کے بعد۔

پچھلے تین ماہ وہ ذکیہ آپا کے گھر رہنے پر مجبور تھی کہ اس اندھیری رات گھر سے نکل کر وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتی تھی' کچھ سوچنے کا موقع تھا ہی کہاں' فیصلہ ہو چکا تھا' تقدیر کا فیصلہ اور رات کا ڈر رہا نہ تنہائی کا خوف' پہلے سے تیار بیگ اسی طرح چھوڑ کر' عزت اور انا کی خاطر' خودداری کی طاقت پر جب گھر سے نکلنے لگی' احمر نے کہا۔

"یہ پرس یہیں چھوڑ دو' اس کے اندر کی رقم بھی میری ہے اور میری کسی چیز پر اب تمہارا حق نہیں۔"

ہما کا خون کھول گیا۔ پرس کے اندر سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر پرس احمر کے منہ پر مارا جو واقعی اس کے چہرے سے ٹکرا کر گرا۔ گالیوں کا فوارہ اچھلا۔ وہ باہر آئی تو اماں سفید چہرے کے ساتھ برآمدے میں لاچار بیٹھی تھیں' وہ رک گئی۔

"خالی ہاتھ جا رہی ہوں۔" اس نے سپاٹ آواز میں اماں سے کہا۔ "کل کوئی یہ الزام نہ دھرے کہ گھر کے زر و جواہر چرا کر لے گئی۔" دم بخود اماں کو چھوڑ کر گھر سے باہر آ گئی' نہ بچے یاد آئے' نہ گھر' رکشا مل گیا۔

اسے گلبرگ ذکیہ آپا کا پتا بتا کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی تو وہاں گئی نہ تھی' صرف دو یا تین مرتبہ' مگر زہرا اکثر ذکر کرتی تھی' گیٹ پہچان کر رکشا رکوایا' گارڈ سے اسے کرایہ ادا کرنے کا کہہ کر اندر آ گئی' قدم سست ہو گئے' کیا کہوں گی' اس طرح رات کے دس بجے اکیلی [illegible] سوچنے کا وقت نہ تھا۔

اندر دروازے پر ذکیہ آپا حیران کھڑی تھیں۔ گارڈ نے فون کر کے بتا دیا تھا' وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے وقت تک تو ہوش میں تھی' بس۔ پھر یورش افکار و جذبات' لاوے کی حدت کا احساس' بے خبر ہو گئی۔

ذکیہ آپا کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گھبراہٹ میں زہرا کو فون کر دیا' وہ فوراً" آگئی' کچھ نہ کچھ اطلاع تو زہرا انہیں دے چکی تھی' مگر انہوں نے اس کے گھریلو معاملات میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔ زہرا کو بھی روک دیا تھا۔ لیکن آج اتنی رات کو اکیلی ہما کا خالی ہاتھ آنا' کسی بڑے حادثے کی خبر دے رہا تھا اور یہ حادثہ شاید پہلے ہی ہو جاتا' لیکن ہما کے ضبط تحمل اور برداشت نے اسے دور تک کھینچا' اب شاید قدرت اس پر مہربان ہوئی تھی۔ احمر کی اماں سب سے بڑی حامی تھیں' انہیں بیٹا قصوروار نظر آ رہا تھا۔ مگر کچھ نہ کر سکیں۔

رات تک ہما کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ اب بچوں کا خیال آیا' بچی بہت چھوٹی تھی' نہ جانے اماں انہیں کیسے سنبھال سکیں گی۔ ہائے' یہ کیا کیا میں نے' ساتھ ہی لے آتی مگر۔ جو شخص پرس کو اپنی ملکیت کے دعوے کے ساتھ لے سکتا ہے' بچوں کو بھلا کیوں آنے دیتا' یہ وقت' جو آج ایک عذاب بن کر اس پر نازل ہوا تھا۔ بچوں کی آمد سے پہلے آ گیا ہوتا تو اتنی اذیت تو نہ ہوتی۔

وہ زہرا کو اپنی بپتا سنا رہی تھی' خشک آنکھوں اور سوکھے گلے سے۔ بات تو خاص نہ تھی [illegible] اپنی نظر میں' مگر شاید احمر کے لیے وہ [illegible] بن گئی وہ نہیں سمجھ سکی کہ بعض اوقات [illegible] کے ماحول میں بھی' کسی ذرا سی بات [illegible] اس قدر مشتعل ہو سکتا ہے کہ اس وقت [illegible] کو اصل وجہ بتاتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔

[illegible] اس کا وہ غیظ و غضب' ہما کے پٹتے ہوئے لب [illegible] سے تمتمایا چہرہ لمحے کے ہزارویں حصے میں اذیت سے نیلا پڑ گیا۔ اچھل کر احمر نے اس کا بازو پوری قوت سے موڑا' چیخ نکل گئی' کس طرح اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کر کے وہ ساس کی حمایت حاصل کرنے ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ وہاں بھی پہنچ گیا۔ اماں کی چیخ پکار کے باوجود اپنے طاقتور ہاتھوں سے اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی۔ بال لگتا تھا جڑ سے اکھڑنے والے ہیں۔ دانت پیس پیس کر آگ اگلتے لہجے میں اس کا وہ شرمناک سوال' وہ جواب میں اذیت کے باوجود نہیں نہیں کوئی نہیں کے سوا کچھ نہ کہہ سکی' اماں الگ۔ "چھوڑ' چھوڑ دے' پاگل ہو گیا ہے' کیا جان سے مارے گا۔ احمر ہوش کر۔" بول رہی تھیں' چیخ رہی تھیں' پھر اماں نے چیخ کر کہا تھا۔

"سچ مچ پاگل ہے یہ' آج مجھے یقین ہوا ہے' اس کو پاگل خانے میں ہونا چاہیے تھا۔"

ان کی زبان سے سچائی کا اظہار پہلی بار ہوا تھا۔ یا وہ ہما کی حالت' چہرے پر [illegible] کا ابھرنا' آنکھیں جیسے وحشت سے [illegible] ہو گئی تھیں۔ اماں کی بات سنتے ہی احمر نے [illegible] چھوڑ دیا۔ چھوڑ دیا کیا بالکل چھوڑ دیا' تین لفظ [illegible] کتنی دیر لگتی ہے۔ مگر۔ وہ الفاظ کہتے ہوئے وہ بالکل صحیح دماغ لگ رہا تھا۔ غصہ جنون کی کیفیت باقی نہ تھی۔ اماں سر تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔ ہما خوف سے زرد ہو گئی۔ بے یقینی اور حیرت آنکھوں میں منجمد ہو گئیں۔

فیصلہ سنا کر احمر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اماں سے ہما کی صورت دیکھی گئی نہ آنسو۔ کچھ کہنے کی بولنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے فیصلہ قبول کر لیا تھا اور جب وہ کمرے میں الماری سے اپنی چادر اور پرس نکال رہی تھی' وہ اسے گہری نظر سے لبوں پر طنز اور کڑواہٹ کی مسکراہٹ لیے گھور رہا تھا' گویا کہہ رہا ہو' یہ تھی تمہاری اوقات' پھر اس نے پرس احمر کو کھینچ مارا۔

اماں باہر بیٹھی رو رہی تھیں' اسے خالی ہاتھ جاتا دیکھ کر بھی کچھ نہ بولیں' تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ان کے بیٹے نے ان کو ذلیل کر دیا تھا۔ ہما اکیلی رات کے وقت خالی ہاتھ گھر سے جا رہی تھی' وہ تو دن میں بھی کبھی تنہا نہیں نکلی تھی پھر۔

☆ ☆ ☆

چند دن بعد ذکیہ آپا ان سے ملنے گئیں' انہیں یاد دلائے۔

"جب وہ آپ کے گھر آئی تھی' پچاس جوڑے کپڑے' چار [illegible] طلائی زیور اور بے شمار مختلف اشیا' آپ [illegible] خالی ہاتھ تن کے کپڑوں میں گھر سے نکال [illegible] کیسی عزت افزائی ہوئی اس کی۔"

وہ بے چاری خود نیم جان ہو رہی تھیں۔ بلبلا کیں' ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

"بی بی! شرمندہ نہ کرو' جو چند چیزیں میرے پاس ہیں' وہ آپ لے لیں' زیور میں نے لاکر سے نکلوا لیا ہے' لے جائیے اور اس کے بچے بھی آپ لے جائیں ورنہ۔ اس کی ذہنی کیفیت سے کچھ بعید نہیں اور میں۔ اس قابل نہیں کہ انہیں پال سکوں۔"

ذکیہ آپا بچوں کو لے آئیں۔ اس کے لیے یہ سب سے بڑی خوشی تھی' خالہ آ گئیں' تین ماہ گزار کر وہ پھر خالہ کے ساتھ آ گئی۔ غم زدہ اور پریشان' ہر دم یہی خوف کہ وہ کسی دن آ کر بچے چھین کر لے جائے گا۔ اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔ ذہنی کیفیت بھی عجیب ہو گئی۔ ہر چیز جیسے نظر سے اوجھل تھی۔ کھانا کھانے یا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے بھی خالہ اسے یاد دلاتیں۔ بس وہ بچوں کو اپنے آپ سے لپٹائے بیٹھی رہتی' اسریٰ آ جاتی تو اس کو بہلانے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرتی' ہنسانے کی کوشش کرتی' باہر لے جاتی' تو وہ وحشی ہرنی کی مانند گھبرائی رہتی۔ ہر دم یہ خوف کہ احمر آئے گا اور بچے لے جائے گا۔

اس کی کیفیت خالہ نے ذکیہ آپا کو بتا دی۔ وہ اکثر فون کر کے اس کا حال پوچھا کرتی تھیں۔ انہوں نے اشفاق کو مجبور کیا اور پھر انہوں نے احمر کی دماغی کیفیت کی بنیاد پر عدالت سے بچوں کو ماں کے سپرد کرنے کی درخواست کی۔ عدالت نے احمر کا دماغی ٹیسٹ کروایا۔ نفسیاتی ڈاکٹر نے اس کے لیے علاج تجویز کیا۔

عدالت میں خود احمر کی ماں کے بیان کے بعد آخر کار بچے قانونی طور پر ماں کے سپرد کیے جانے کے آرڈر دے دیے۔ یہ ایسا احسان تھا جس کے لیے ہما اللہ کے بعد اشفاق کی شکر گزار تھی۔ خالہ اکیلی تھیں' ہما کے

http://www.pakfunplace.com

آنے سے ان کے گھر کی رونق بحال ہو گئی۔

افسر سعودی عرب میں تھے۔ اسریٰ اختر کو مجبور کر کے واپس لے آئی تھی۔ اختر کے ماں باپ بھی بڑھاپے میں تنہائی کے شکار تھے۔ وہ اسریٰ سے بہت خوش تھے۔ ان کے گھر بھی بیٹے بہو پوتوں کی رونق ہو گئی تھی۔ خالہ نے تنہائی سے گھبرا کر گھر کے ایک پورشن کو کرائے پر دے دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہما بھی نارمل ہو گئی۔ اب اسے دیگر مسائل، بچوں کے اور اپنے اخراجات کی فکر ہوئی۔ اس نے جاب کرنے کا ارادہ کیا تو افسر نے منع کر دیا۔

"تم اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرو، بس یہ ہی تمہاری جاب ہے، انہیں احمر نہیں، انسان بنانے کی کوشش کرنا۔"

زندگی کے بھی کیا رنگ ہیں، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، چڑھتی دھوپ میں روح تک جھلس گئی اور ڈھلتی چھاؤں اس کے تحفظ کی ضامن بن گئی۔

ذکیہ آپا ایک بار پھر ان کے گھر آئیں۔ دوسری بار اس کار شتہ مانگنے، اشفاق کی بیٹی ان کے ہمراہ تھی۔ وہ ہما کو عجیب کھوجتی نظروں سے دیکھا کرتی، ہما کو گھبراہٹ ہوتی، وہ اس دن کہہ بیٹھی۔

"آپ میری ماما ہیں؟"

ہما چونک گئی، یہ کیسا سوال ہے۔ "سچ... میں پہچان گئی ہوں، آپ ہی تو میری ماما ہیں۔"

ذکیہ آپا نے زمانے کے سرد گرم کا احوال ہما کو سمجھایا۔ بچے ان کی پرورش، اعلا تعلیم، کس طرح ممکن ہے، کوئی سرپرست ہو، دو بچوں کی موجودگی دوسری شادی میں رخنے ڈالے گی اور بچے رل جائیں گے۔ اب تو باپ بھی نہیں لے سکتا۔ اس کا تو دماغ ابھی تک درست نہیں ہوا۔ ماں سے آئے دن کے جھگڑے، کچھ صحیح ہو جائے تو ملوانے میں حرج بھی نہیں۔ ابھی علاج چل رہا ہے، مگر گھر کی ویرانی، اپنے عمل پر پچھتاوا، سب مل کر اسے اور بھی پاگل کر دیتے ہیں۔ کوئی سچا ہمدرد ایسا تو ہو، جو بچوں کو دو بھر نہ سمجھے، اپنا بچوں کو صحت مند ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، سوچ لو

اشفاق سے زیادہ بہتر، کوئی دوسرا نہیں ملے گا، اشفاق کی بچی کو بھی ایسی ہی ماں چاہیے، جو اولاد کا درد ان کی ضروریات، احساسات کو سمجھ سکے اور بھئی افشی نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ تمہارے بچوں کو قبول کر لیا ہے، دیکھو کس طرح انہیں بہلاتی ہے، کھیلتی ہے، ابھی دو دن میں ہی اسے بچوں سے محبت ہو گئی ہے، مجھ سے کہہ رہی تھی ماں کو گھر لے کر چلیں، ہما نے ان کی ہر بات سے اتفاق کیا، خالہ بھی ان کی ہمنوا بن گئیں۔

"مجھے تو پہلے ہی احمر پسند نہیں تھا۔ مگر میری کسی نے سنی نہیں۔" اور یوں، احمر کی پیشن گوئی کے عین مطابق، وہ کزن کے گھر میں مستورن کر داخل ہو گئی۔

٭ ٭ ٭

اب اسے صرف اپنی نہیں، بچوں کی بھی فکر تھی۔ دنیا والے کچھ بھی کہتے وہ تو اس کی شادی نہ کرنے کے فیصلے کے بعد کچھ نہ کچھ کہتے، ساری عمر کہتے ہی رہتے۔ نکتہ چینی، اعتراض، الزامات، اسے ایک مضبوط سہارا، ایک محفوظ سائبان درکار تھا جو اشفاق کے سوا شاید نہ ملتا، اشفاق کی بھی مجبوری تھی۔ ایک کے بعد دوسری شادی، بچی کو ماں نہ دے سکی۔ کوئی ہمدرد شریف خاندانی عورت ہی ان کی ضرورت تھی۔ بچوں کی ماں ہو، اپنے بچوں کی خاطر گھر بسائے، ان کی بچی کو محبت دے اور یہ بہتر فیصلہ ذکیہ آپا کی کوشش سے تکمیل تک پہنچا۔

ہما کا ڈر اور اندیشہ بھی غلط نکلا۔ اشفاق بے حد نرم دل، نرم گفتار، خوش مزاج انسان تھے۔ انہیں ہما سے ہمدردی تھی۔ کم عمری میں اس نے سنگین حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر تحقیق کے بعد انہوں نے اس کی طرف سے عدالت کا رخ کیا تھا۔ احمر کے بارے میں اس کی ماں نے زیادہ معلومات پہنچائی تھیں۔ ان ہی کی مدد اور تعاون سے بچے ہما کو ملے تھے۔

ہما احمر کی ماں کے علاوہ اشفاق کی ممنون احسان تھی۔ بہرحال کوشش تو اشفاق نے کی تھی۔ اس گھر

میں محبت تھی۔ اتفاق اور تحفظ، اشفاق ہما سے کافی بڑے تھے، اسی لیے وہ اسے کسی بچی کی طرح سمجھتے تھے اور بڑا مشفقانہ برتاؤ تھا اس کے ساتھ۔ وہ اکثر اس کو آرام کی تاکید کرتے۔

"لیٹ جاؤ، سو جاؤ، آرام کرو۔" نوکروں کی وجہ سے اس کو کچھ کرنا نہ پڑتا۔ بچے بھی افشی کے ساتھ بہلے رہتے۔ نوکر ان کے سب کام کرتے۔ ہما کو ذہنی، اعصابی، جسمانی آرام ملا، فکریں دور ہو گئیں۔

دونوں بچے اسکول جانے لگے۔ بڑی آپا بھی ہما کا خیال رکھتی تھیں۔ زہرا اپنے میاں کے ساتھ آ جاتی، گھر میں گہما گہمی ہو جاتی، کسی نے بھی احمر کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ یوں لگتا جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتی رہی ہے۔ اشفاق جب افشی کو کہیں لے کر جاتے، ہما کے بچے بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ ان کے لیے افشی نے بھی اپنے کھلونے ڈھیر کر دیے، اشفاق بھی بہت سے کھلونے لے آئے۔

افشی، ہما کے ساتھ ساتھ لگی رہتی، غرض ہر جانب سکھ تھا اور راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ اس گھر سے، ان لوگوں سے اسے اتنا کچھ مل گیا کہ اب وہ پرانے فیصلے پر نادم ہو جاتی۔ کاش خالہ کی بات مان لی ہوتی۔ اگر ذرا سی عمر ہی تو زیادہ تھی، باقی محبت اور اعتبار، قدر اور رواداری، اشفاق نے کہیں کمی نہ کی۔ جب وہ ان کے ساتھ ان کی قیمتی آرام دہ گاڑی میں کہیں جاتی، احمر کی طنزیہ باتیں یاد آ کر اسے بے چین کر دیتیں۔

ایسے ہی ہونا تھا... تو پہلے کیوں نہیں، کاش کوئی پچھلا زمانہ واپس لا سکتا۔ تو وقت احمر کو مسترد کر کے اشفاق کی بن جاتی، لیکن ذہن میں ایک سوال کلبلاتا، ہمت نہ ہوئی کہ زبان تک لائے۔

٭ ٭ ٭

کافی عرصے کے بعد، جب اس کے قدم خاصے مضبوط ہو گئے۔ اس نے اشفاق کو ایک پیارا سا بیٹا بھی دے دیا۔ اشفاق کی محبت اس کو حاصل ہو گئی تھی۔

ماہنامہ کرن

ستمبر 2011 کے شمارے کی ایک جھلک

- عید کے موقع پر اداکاروں سے "عید سروے"
- اداکار "بابر خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "غزالہ جاوید" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- پروڈیوسر "علی سعید" کی باتیں،
- "قارئین کی عدالت میں" اداکار "نبیل" سے سوالات،
- "مجھ سے ملیے" کے سلسلے میں "فوزیہ یاسمین" کے بارے میں دلچسپ باتیں،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "من کا ملے تو اچھا" ایلا کرن کا مکمل ناول،
- "او رے پیا" نایاب جیلانی کا طویل ناول،
- "شہر اتنے جوانی" فرحانہ ناز ملک کا مکمل ناول،
- "تاحال ہے چاند رات" اقرأ صغیر کا مکمل ناولٹ،
- "متاع جاں" کشش احمد کا مکمل ناولٹ،
- "روداد قفس" کے سلسلے کی دوسری تحریر "جرم محبت" روشنی بخاری کے قلم سے،
- شازیہ جمال ناز، نفیسہ ہاشمی، عنبر احمد، صباحت یاسمین، ماہ نور نصیر احمد اور صدیقی کے افسانے اور مستقل دلچسپ سلسلے،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

"عید الفطر اور آپ"

کرن کے اس شمارے کے ساتھ مفت پیش کیا جا رہا ہے کرن سے اپنا ساتھ رکھیے۔

http://www.pakfunplace.com

اس کے ذہن سے سوال نکل کر زبان پر آہی گیا۔

"سنیے' ایک بات۔۔۔ پوچھنی ہے' آپ۔۔۔ برا نہ مانیں تو۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ پوچھو' تم تو کچھ سوال کرتی ہی نہیں' بس جی ہاں' جی۔۔۔ جی کرتی ہو۔" اشفاق بڑے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔ ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ وہ ان سے بے تکلف ہو کر باتیں کرے۔ اس کے ذہن پر جو غبار ہے وہ کسی طرح صاف ہو۔ پچھلی زندگی اگر بالکل بھول نہیں سکتی' تو کم از کم اس کی یاد سے لاپروا اور بے نیاز ہو جائے۔ اکثر انہوں نے نوٹ کیا تھا وہ یک لخت گم صم اور اداس ہو جاتی تھی۔ یقیناً" کوئی تکلیف وہ بات یاد آئی ہو گی۔ انہوں نے کئی بار اس سے کہا۔

"میرا تمہارا اعتبار کا رشتہ ہے' تم اپنی ہر بات مجھ کو بتا سکتی ہو' اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اندر کے رازوں میں کسی اپنے کو شریک کرے۔ تم تو میری شریک زندگی ہو' میرے بچوں کی ماں اور میری خالہ کی بیٹی تو ہو ہی' اس لحاظ سے میری تم سے دوستی بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ اس کے رویے سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ اس نے ان کی بیٹی کو بڑی محبت اور خلوص سے اپنایا تھا۔ گھر کے معاملات میں ذمے داری سے دخل دیتی تھی۔ نوکروں کی عزت کرتی تھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھی کام میں۔ بڑی آپا کی تو پوری ذمے داری سنبھالی ہوئی تھی۔

"وہ آپ کی پہلی بیگم تو سنا ہے کہ۔۔۔ شاید زندہ ہیں' یعنی کہ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ زندہ ہوں۔" وہ ہکلا گئی۔

"تو۔۔۔ پھر۔۔۔ اگر وہ آگئیں تو۔۔۔ کیا ہو گا؟"

یہ سوال بھی دراصل اشفاق کے دیے اعتماد کا حصہ تھا۔ وہ اب بہادر ہو گئی تھی۔ پرانی کئی عادتیں' لاابالی پن ہنستے ہوئے بات کرنا پھر سے لوٹ رہی تھیں۔

"اگر آگئیں؟ کیا مطلب۔۔۔ آچکی ہیں۔" اشفاق کا اطمینان اور بے فکر لہجہ' وہ ہونق چہرے بڑی آپا کی طرف مڑی وہ مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں بھئی۔۔۔ آگئی ہیں اور کیا سننا چاہتی ہو۔"

"ہائے اللہ۔۔۔ پھر۔۔۔ میرا کیا ہو گا۔" وہ روہانسی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ (پھر وہی دربدری' بے چارگی۔)

"ابھی بتاتا ہوں' کیا ہو گا؟ مل لو ان سے' آؤ' تمہیں ملوا دیتا ہوں لو ہو بھئی' آؤ۔" اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے کر چلے۔ وہ یک لخت خوف زدہ ہو گئی۔ (اب۔۔۔ یہ مجھے ماریں گے؟ بے وقوفی کا سوال کرنے پر۔) وہ گھبرا گئی' مگر اشفاق کے چہرے پر کوئی تندی تیزی نہ تھی۔ مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں لب بھینچے ہوئے تھے۔ کچھ اطمینان ہوا۔

"آپ مردوں کی بس یہ ہی تو عادت۔۔۔" کہتے کہتے فوراً" رک گئی۔ (مردوں کا کیا بھروسہ؟) وقت پر عقل آگئی۔ جملہ پورا کیا ہوتا۔۔۔ تو وہ نفس نہیں رہی تھی' بالکل بھول گئی تھی کہ یہ احمر۔۔۔ وہ ہی احمر ہے' تند خو' بدمزاج' غصیلا' جنونی۔۔۔ مگر اس وقت تو۔۔۔ بے حد خوش مزاج اور محبت سے لبریز شوہر تھا۔ کس قدر خوش تھی وہ۔ (میری اور اماں کی نماز میں دعائیں' اماں کے وظیفے احمر کو بدل چکے ہیں۔) اور اسی خوشی کی ترنگ میں اس کے کسی مطالبے پر اس نے ہنستے ہنستے کہہ دیا تھا۔

"آپ مردوں کی یہ ہی تو عادت ہوتی ہے' انگلی پکڑے پہنچا پکڑتے ہیں۔"

اور بس۔۔۔ پھر۔۔۔ قیامت آگئی۔ بستر سے اچھل کر نیچے اترا' غضب ناک ہو کر اس پر حملہ آور ہوا۔ بس لمحے کی دیر تھی۔ سارا منظر یک لخت تبدیل ہو گیا' اس کا چہرہ کھنچ گیا' رنگ بھبھوکا' آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ آواز میں کسی جنگلی درندے کی غراہٹ سے پوچھ رہا تھا۔

"بتا۔۔۔ بتا۔۔۔ تو مردوں کو جانتی ہے تو' کس کس مرد کی عادتیں جانتی ہیں بول۔۔۔ کون تجھ سے اتنا قریب تھا۔۔۔"

وہ پے در پے سوال کر رہا تھا' ہما کی جان نکلی جا رہی تھی۔ کسی طرح اس کے چنگل سے آزاد ہو کر بھاگی اماں کے پاس کی حمایت لینے۔ وہ وہاں بھی قلانچیں بھرتا آگیا تھا۔ اور ماں کی چیخ پکار کی پروا کیے بغیر اس کی چوٹی سخت مضبوطی سے اپنے چنگل میں جکڑ لی۔ اس کے بالوں کی

جڑیں اکھڑنے کے قریب تھیں۔ اذیت سے چھوٹیلا پڑنے لگا۔ اماں' بیٹے کو دھوکے رسید کر رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں مگر وہ اس کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور شرم و حیا کے منافی وہ سوال' اس کی پاک دامنی پر حملہ' "بتا مجھ سے زیادہ اور کون کون۔۔۔"

وہ نیم مردہ ہو کر لڑکھڑا رہی تھی۔ تب اماں کے نوچنے کھسوٹنے پر اس نے اس کو چھوڑا' چھوڑ دیا بالکل' زندگی سے خارج' تین لفظ کہنے میں مرد کو بڑی مہارت ہوتی ہے نا' اماں سر پکڑ کر رہ گئیں۔ پھر بیٹے کے تعاقب میں باہر نکلیں مگر۔۔۔ وہ بڑے سکون سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں جا کر حسب معمول اسی طرح لیٹ چکا تھا۔ جیسے کوئی نئی بات ہوئی ہو' بالکل نارمل۔

تمام گزرے واقعات اس کے ذہن میں کسی فلمی سین کی طرح چلنے لگے۔ اس رات وہ یک بیک خوف زدہ اور بے بسی کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر۔۔۔ پھر فوراً" آزادی کے انجانے احساس نے نہ جانے کتنی طاقت بحال کر دی کہ۔۔۔ نہ رات کا اندھیرا۔۔۔ نہ تنہا گھر سے نکلنے کا خوف رہا۔

اب۔۔۔ وہ بہت طاقت حاصل کر چکی تھی۔ اور اشفاق اسے کھینچے لے جا رہے تھے۔ (پتا نہیں یہ کتنی زور سے ماریں گے؟) (خدشہ) سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ مار سے بچنے کے لیے ایک کمزور مدافعت کے طور پر۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ کیا وہ اسے قد آدم آئینے کے سامنے لے جا کر کہہ رہے تھے۔

"لو بھئی۔۔۔ ان سے ملو' یہ ہیں میری بیگم ہما سلطانہ۔۔۔ زندہ سلامت ماشاء اللہ۔" شرارت لہجے میں تھی۔ "پسند آئیں؟"

آئینے میں خود کو دیکھ کر کھسیانی ہو کر اس نے بڑی آپا کو دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنس رہی تھیں۔

"یہ ہی ہیں میری بیگم' پہلی بھی۔۔۔ آخری بھی۔۔۔ ماشاء اللہ ہما سلطانہ صاحب۔"

"مگر۔۔۔ آپ۔۔۔ تو۔" وہ ہکلا گئی۔ پھر یک بیک کتنے لوگ کمرے میں آگئے۔ زہرا' اس کا شوہر' ذکیہ آپا' ان کے بچے' افشی اور اظفر اور رعنا' ہما کے بچے' سب کو بڑی آپا اس معاملے سے آگاہ کر رہی تھیں۔ سب ایک ساتھ تالیاں بجانے لگے۔ ہنسنے لگے۔ زہرا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اچھا۔۔۔ تو اس لیے ذکیہ آپا اسی کو اپنی بھابھی بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ آج تک کسی نے بتایا ہی نہیں۔"

جب وہ خفگی سے اپنا منہ سجائے پھلائے کمرے سے جانے لگی تو سب ہنس رہے تھے۔ غصہ اور کھسیانا پن' کمرے کے دروازے پر کتنے ہی بازو اس کو اپنے حصار میں لے چکے تھے۔ اشفاق کی گرفت سب سے زیادہ نرم گرم اور مضبوط تھی۔ ان ہی کا قہقہہ سب میں بلند تھا۔ سب نے اسے خوب بے وقوف بنایا تھا۔ اشفاق کی پہلی بیگم ہما سلطانہ تھیں۔ اب وہ کھسیانی ہو کر ہنسنے کا حق تو رکھتی تھی۔ کبھی معلوم ہی نہیں کیا۔ نام کی مناسبت۔ واہ' اچھا لطیفہ تھا' مگر اب وہ خوش مطمئن تھی۔ اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ تھا۔ افشی کو اس نے پورے خلوص اور محبت سے اپنی بیٹی بنایا تھا' بڑی بچی۔

افشی خوش تھی کہ اسے اس کی اصل ماں مل گئی تھی۔ ہما سلطانہ' جو زمانے کے سرد گرم تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی تھی۔ وہ اللہ کی شکر گزار تھی جس نے اس کو آزمائش کے بعد اس کے صبر کا بہت بڑا اجر دیا تھا۔ اشفاق کی محبت' گھر کا سکون' تحفظ' اشفاق کی ممنون تھی۔ جو اس کی مجبوریوں کو اپنی محبت بنا کر بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ وہ پہلی اور آخری بیوی ہی نہیں' آخری محبت بھی تھی۔

http://www.paktunplace.com

رابعہ افتخار

جب چاند اُتر آئے

وہ پہلی بار پاکستان آرہا تھا۔ گھر کے سب ہی افراد کو اس سے ملنے کا اسے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ خصوصاً ساری لڑکیاں تو اس کی آمد کی شدت سے منتظر تھیں۔ گھر بھر میں رنگ و روغن کا کام جاری تھا۔ صفائیاں کی جارہی تھیں۔ نئے نئے کپڑے سلوائے جارہے تھے۔ گروسری کا سامان، بیکری کا سامان وافر مقدار میں آرہا تھا۔

"روحیلہ خالہ کا بیٹا شاہکار اکیلا ہی آرہا ہے ناں یا ساتھ باتھیوں کی فوج لے کر آرہا ہے۔"

نائمہ نے صائمہ کے کان میں سرگوشی کی جو دادی اماں نے بآسانی سن لی۔

"کتنی مرتبہ کہا ہے کہ خالہ نہیں "تائی" ہے وہ تمہاری... اور دوسری بات یہ ہے کہ خبردار کسی نے شاہکار کے بارے میں کوئی غلط قسم کی بات کی۔ میرا اکلوتا پوتا پہلی مرتبہ پاکستان آرہا ہے۔"

دادی اماں اس کے واری صدقے جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

"ویسے موصوف آکب رہے ہیں؟" حلیمہ اپنی ننھی منی کرن کو سنبھالتی سب کے پاس آبیٹھی۔

"کل رات دس بجے پہنچ جائے گا ان شاء اللہ۔"

دادی جان نے اس کے لیے سلوا کر رکھے ہوئے جدید انداز کے شلوار کرتوں کو ایک مرتبہ پھر گننا شروع کیا۔

"کتنی بار گنیں گی دادی! پورے بارہ جوڑے ہیں۔" کچن سے باہر نکلتی عکس ماہ نے دادی کو مسکراتے ہوئے جوڑوں کی تعداد بتائی تو وہ اسے گھور کر رہ گئیں۔

"ابھی تو اس کے لیے جوتیاں بھی منگوانی ہیں۔"

"کھلائیں گی کیا؟" نائمہ کی زبان پھسلی تھی۔

"چپ بدتمیز... ذرا تمیز نہیں ہے ان لڑکیوں کو نہ عقل نہ شعور۔" دادی کا غصہ دیدنی تھا۔

"رمضان کا مہینہ آنے والا ہے، پھر عید بھی آئے گی گرمی کا موسم ہے، جتنی چیزیں ہوں کم ہیں۔ ابھی تو اس کے کمرے کا اے سی بھی ٹھیک کروانا ہے اور پردے، بیڈ کی چادریں۔"

بڑی بہو سے کہا بھی تھا کہ حلیمہ کو ساتھ لے کر بازار کا چکر لگا آؤ، لیکن ان کا تو بی پی ہی کنٹرول نہیں ہورہا شاہکار کے لیے شاپنگ دیکھ کر... دے دیتی مجھے پوتا تو اس کے بھی ایسے ہی ناز نخرے اٹھاتی میں۔"

دادی نے واقعی بی پی ہائی کرنے والی باتیں شروع کردی تھیں۔

"جیسے جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے ناں اسی طرح دادی کی جان شاہکار میں..." صائمہ بڑبڑائی۔

اس مرتبہ دادی کا دھیان شاپنگ کی دوسری لسٹ کی طرف تھا۔ عکس ماہ نے ان کو لسٹ میں چند نئی چیزوں کا اضافہ کرتے دیکھا تو سر جھٹک کر رہ گئی۔

"کیا ضرورت ہیں ناں دادی وہ بھلا دادی کی یہ سب چیزیں پسند کرے گا، وہ تو اپنے ساتھ امپورٹڈ کپڑے جوتے لے کر آئے گا۔" وہ سوچتے سوچتے مسکرا دی۔

شب برات سے دو دن پہلے اس کی آمد ہوگئی، وہ اسے لینے گلاب کے پھولوں کا ہار لیے کھڑی تھیں۔

"میرا شاہکار آرہا ہے۔" ان کی زبان بار بار اسی ایک جملے کا ورد کررہی تھی، اور پھر واقعی ان کا "شاہکار" آگیا۔ ان کے ہاتھ ڈھے گئے۔

"ہائے گرینی! ہاؤ آر یو (آپ کیسی ہیں؟)"

وہ بالوں کی اونچی سی پونی بنائے، ایک کان میں بالی ڈالے، شرٹ کے کھلے بٹنوں کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ہی تھا "شاہکار علی خان" جس کے لیے انہوں نے مہنگی اور اعلاترین شاپنگ کی تھی۔

"ہائے گرلز!" اب وہ سب لڑکیوں کی طرف متوجہ تھا۔ دادی کی نظر اس کی ٹانگوں پر گھٹنوں تک جاکر ٹھہر گئی۔ گھٹنوں سے نیچے اس کی پتلون غائب تھی۔ نہ جانے یہ کس طرح کی پتلون ہے، چوہوں نے کتری ہے یا پھر دھل دھل کر چھوٹی ہوگئی ہے۔

"شاہکار پتر!" دادی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

"شاہکار... ہاؤ فنی گرینی، کال می "شا" او نلی شا۔"

اس کی باتیں ان کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔

"چلو لڑکیو... چلو۔" وہ واپسی کے لیے مڑ گئیں۔

"چلو لڑکیو!" وہ ہنستے ہوئے بولا اور دادی کے پیچھے

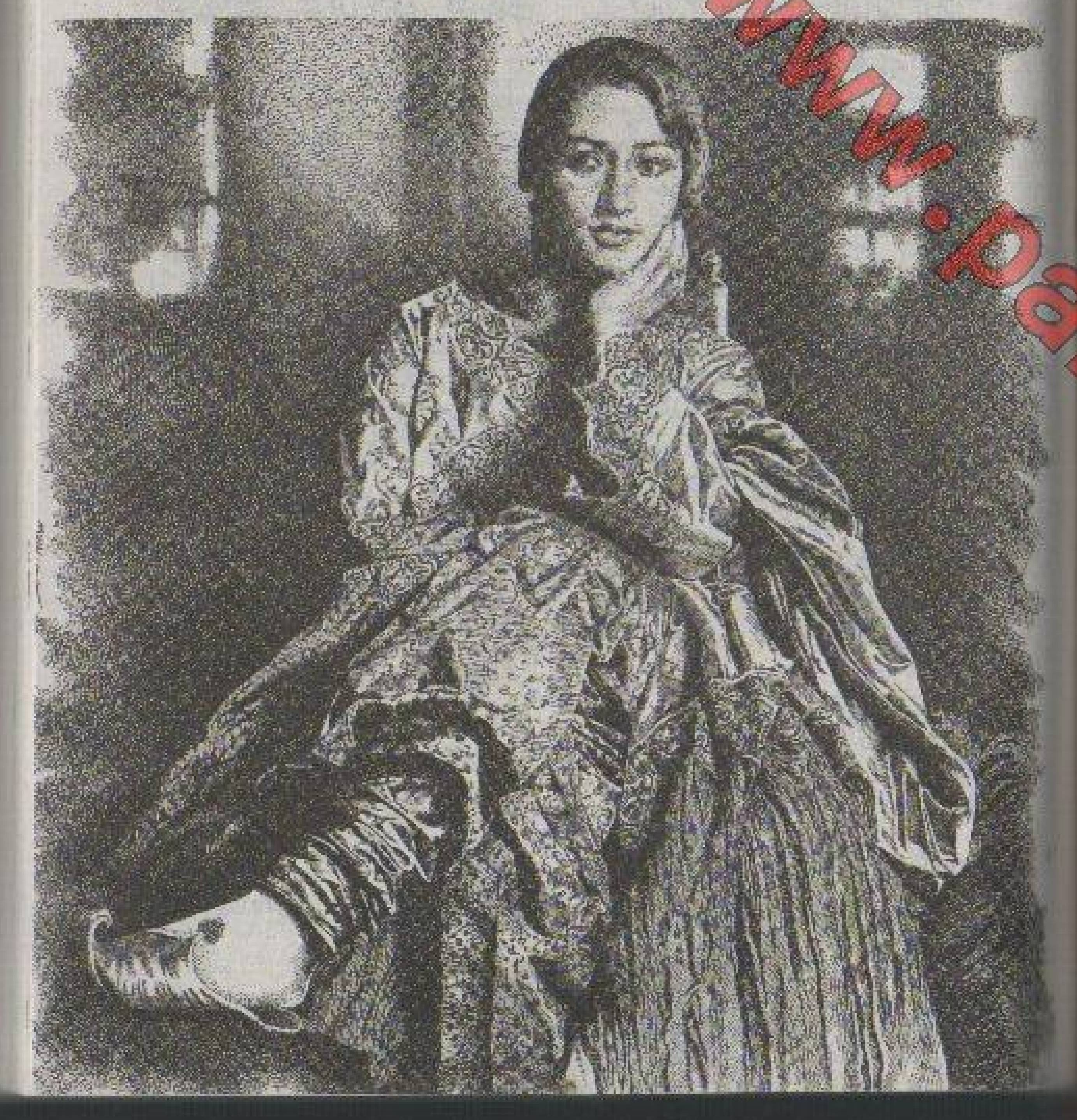

http://www.pakfunplace.com

چل دیا۔
"ویسے یہ شاہکار صاحب ہماری کوئی "لندن پلٹ باجی" لگ رہا ہے۔" نائمہ نے عکس ماہ کو سرگوشی کی، اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔
اتنی دیر میں ہنسی بن کر شاہکار نے گردن گھما کر دیکھا، وہ کتنی معصوم سی تھی۔ سانولے سلونے چہرے پر ہنستے ہوئے ڈمپل پڑ رہا تھا۔
"یہ یقیناً "عکس ماہ" ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔
"لو جی! گھر آ گیا۔" سارا راستہ سب خاموش ہی رہے، شاہکار کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے بیٹھا سر دھنتا رہا۔
"اوئے شاہکار... گھر آ گیا۔" دادی نے اس کا شانہ ہلایا۔
"واٹ... واٹ آر یو سے انگ۔" وہ انجان تھا۔
"گھر آ گیا ہے شاہکار پتر۔" ساری لڑکیاں یک زبان ہو کر بولی تھیں۔ دادی نے ان سب کو گھورا اور گاڑی سے باہر نکل گئیں۔
"اوہ... میں نے سنا نہیں، گھر آ گیا۔" وہ بھی دادی کی پیروی میں باہر نکل گیا۔
"یہ کیا چیز آ گئی ہے انگلینڈ سے ہمارے گھر، کون کہتا ہے کہ مائیکل جیکسن کا انتقال ہو گیا، اس کی روح یقیناً "شاہکار علی خان" میں حلول کر گئی ہے، جب ہی تو ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔"
نائمہ کا تبصرہ شروع ہو چکا تھا، سب لڑکیاں تائیدی انداز میں سر ہلا رہی تھیں۔
دادی کے تو جیسے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ شاہکار کے آنے سے پہلے وہ جتنی پُرجوش تھیں، اب اتنی ہی غش ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ لڑکیاں ان کی طرف دیکھتیں تو وہ شرمندگی سے اپنا چہرہ ادھر ادھر کر لیتیں، مبادا کہ نظریں ملیں اور انہیں طنز کرنے کا بہانہ مل جائے۔
"ہائے گرینی! کیا ہو رہا ہے؟" وہ ہاف پتلون، بغیر آستینوں کی شرٹ میں ملبوس دادی کے پاس آ بیٹھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، دادی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔
"ہائے لڑکے! کچھ شرم حیا کیا کرو۔ جوان جہان بہنوں والا گھر ہے اور تم ایسے فرنگیوں والے لباس پہن کر گھومتے ہو۔ وہ جو میں نے تمہارے کمرے میں کپڑے رکھوائے ہیں، کتنے اچھے ہیں، وہ پہنا کرو۔"
دادی نے اسے سمجھانا چاہا۔ اس نے ناک سکیڑ کر دادی کی سمت دیکھا۔
"وہ... او گاڈ... دادی وہ شلوار قمیص میں پہنوں گا... میں؟" اس نے اتنی حیرت سے دادی کی سمت دیکھا جیسے دادی اسے ساڑھی باندھنے کو کہہ رہی ہوں۔
"تو کیا میں وہ درجنوں کپڑے الماریوں میں ٹھونسنے کے لیے لائی تھی؟" دادی کو اچھا خاصا غصہ آ گیا تھا۔
"آپ کو پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا دادی! کہ میں کس طرح کے کپڑے پہنوں گا، خیر وہ سب کپڑے آپ ان سب کے دولہوں کے لیے رکھ دیں۔" اس کا جواب سن کر دادی کے ماتھے پر مزید بل پڑ گئے۔
"ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اسی بہانے فیشن بدلنے سے پہلے پہلے ہماری شادیاں تو ہو جائیں گی نا۔" نائمہ کی خوشی دیدنی تھی۔
"ارے ہاں... یہ شاہکار تو ہمارا ہمدرد نکلا بھئی۔" صائمہ بھی خوشی سے چیخ اٹھی۔ دادی نے گھور کر سب کو دیکھا۔
"تم سب کے ماں باپ تو آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ میری آنکھیں تو کھلی ہیں نا، ابھی اس بارے میں تو سمجھی تھی کہ شاہکار کی تربیت ولایت نے بہت اچھی کی ہو گی، لیکن... ارے کوئی ہے جو میرے خاندان کے اکلوتے سپوت کو سنوارے۔" دادی کڑھنے لگیں۔
بے ساختہ ہی عکس ماہ نے ان کی یہ بات بہت غور سے سنی تھی۔ اسی لمحے اس کی نظر شاہکار پر پڑی، وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں عکس ماہ کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے عجیب سے رنگ دکھائی دیے۔ اس کا دل ایک انوکھے انداز سے دھڑکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے کے بعد سب ایک بار پھر چھت پر موجود تھے۔ ساری چھت موم بتیوں کی روشنی سے چمک رہی تھی، وہ بھی نائمہ، صائمہ اور حلیمہ کے ساتھ موم بتیاں جلانے میں مصروف تھی، جب شاہکار کے موبائل کی بیپ بجنے لگی اور وہ ان سب سے ہٹ کر ایک طرف کو ہو گیا۔
"مجھے یاد ہے ماما کہ آپ نے مجھے یہاں لڑکی پسند کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ نائمہ اور صائمہ تو بچیاں ہیں میرے سامنے اور حلیمہ آل ریڈی شادی شدہ ہے۔ رہ گئی عکس ماہ..." اس نے بات کرتے کرتے گردن گھما کر دیکھا، وہ اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں سانولا سلونا چہرہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔
"ہاں تو ماما... عکس ماہ سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے بہت سکون سے کہا۔
"اس سے پہلے ہی میں اسے اپنا بنانا چاہتا ہوں، لیکن پتا نہیں ماما وہ مجھے اپنا بنانا چاہے گی کہ نہیں؟" شاہکار بہت آہستگی سے بولا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد صائمہ اور نائمہ نیچے چلی گئی تھیں۔ حلیمہ بھی کرن کو لیے نیچے اتر گئی، وہ بھی ان سب کو جاتا دیکھ کر نیچے کی طرف اترنے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی، جب شاہکار اس کے سامنے آ رکا۔
"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"
"کیا؟" اسے حیرت ہوئی۔ بھلا شاہکار کو اس سے کیا بات کرنا تھی۔
"عکس ماہ! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" وہ بہت اسٹریٹ فارورڈ تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کر کوئی تمہید نہیں باندھی تھی۔ "محبت ہو گئی ہے تم سے۔"
"کیا؟" اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس وقت بھی اسی فضول سے حلیے میں تھا، ہاف پتلون پر بغیر آستینوں کی قمیص پہنے۔ کان کی بالی اب غائب تھی۔ اس کی جگہ ننھا منا سا ٹاپس چمک رہا تھا۔ عکس ماہ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔
"ارے کوئی ہے جو میرے خاندان کے اکلوتے سپوت کو سنوارے۔" دادی کا جملہ اس کی سماعت میں بازگشت کرنے لگا۔
"لیکن آپ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔" اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔ شاہکار کے ماتھے پر بل نمودار ہو گئے۔
"کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟ ابراڈ میں لڑکیاں مرتی تھیں مجھ پر۔" اسے اپنی توہین محسوس ہوئی تھی۔
"کمی تم میں نہیں، تمہارے حلیے میں ہے۔ مجھے تمہارا یہ حلیہ قطعی پسند نہیں۔" وہ الفاظ جو دادی نہ کہہ سکی تھیں اس نے کہہ دیے۔ شاہکار کے چہرے پر خفگی اور غصے کا عنصر نمایاں تھا لیکن وہ خاموش رہا۔
"تو کیا چاہتی ہو تم، میرا حلیہ کیسا ہو؟" وہ جاننا چاہ رہا تھا۔ اس کے لیے عکس ماہ کے دل میں کیا ہے۔
"تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو پھر اپنا حلیہ بھی میری مرضی کا بنانا ہو گا۔ اگر محبت کرتے ہو تو اتنا چھوٹا سا کام کر ہی لو گے تم۔" وہ شاید اس کی محبت کا امتحان لینے جا رہی تھی۔
"تم کہو... آئی ایم لسننگ۔"
"تمہیں اپنے یہ بال کٹوانے ہوں گے۔ ہاتھوں سے یہ لڑکیوں کی طرح ڈھیروں ڈھیر انگوٹھیاں اور بریسلیٹ بھی اتارنے ہوں گے۔ اس ہاف پتلون کی جگہ فل پتلون شرٹ یا پھر شلوار قمیص پہننا ہو گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنا ہوں گی، وہ بھی مسجد جا کر۔ رمضان شریف کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، سارے روزے رکھنے ہوں گے۔ منظور ہے تو مجھے یہ محبت دل و جان سے قبول ہے۔" وہ بڑے دھڑلے سے وہ سب کچھ شاہکار سے کہہ گئی جو دادی کے دل میں تھا۔
"مشکل... مشکل ہے... اور محبت... اس کا کیا ہے تم نہیں اور سہی کوئی اور نہیں اور سہی۔ اب میں ایک لڑکی کی خاطر اپنا لائف اسٹائل تو چینج نہیں کر سکتا نا۔ جب میں نے اپنی ماں کی نہیں مانی تو تمہاری

http://www.pakfunplace.com

کیا مانوں گا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے کہتا وہاں سے ہٹ گیا۔

"اف دنیا کی سب سے چھوٹی پریم کہانی۔" کسی فلم میں سنا ڈائیلاگ دماغ میں گونجا اور وہ بھی سر جھٹک کر سیڑھیاں اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا تھا' وہ اپنی امی اور تائی امی کے ساتھ کچن میں سحری اور افطاری کی مختلف اشیاء بنانے میں مصروف تھی۔ تائمہ اور صائمہ کو کچن کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں کوئی میگزین کھولے بیٹھی تھیں۔ حلیمہ اپنے گھر واپس جا چکی تھی۔ دادی جان کا شاہکار ہیڈ فون چڑھائے کارپٹ پر لیٹا سر دھن رہا تھا' ساتھ ہی ساتھ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھی بھرے جا رہے تھے۔

"کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ لیٹے ہوئے کچھ نہیں کھانا چاہیے' لیکن اس لڑکے کی سمجھ میں کبھی کوئی بات نہیں آئی۔ اب دیکھو کل سے رمضان شریف شروع ہے' لیکن اس کے کھانے پینے پر کوئی اثر ہی نہیں۔" دادی کی بڑبڑاہٹ عروج پر تھی۔

کچن سے باہر کا منظر دیکھتی عکس ماہ کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ شاہکار کی آنکھوں میں اپنے لیے جو رنگ دیکھ رہی تھی' وہ کتنے کچے نکلے تھے۔ شاہکار نے جس محبت کا دعویٰ کیا تھا وہ کتنی بودی محبت تھی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ محبت۔ محبت ہوتی ہے' اس کا دل سے نکالنا اذیت ناک ہوتا ہے' جان لیوا ہوتا ہے' لیکن شاہکار کی محبت نہ جانے کیسی تھی' جس نے اسے اتنا مطمئن اور پرسکون رکھا ہوا تھا۔ خود عکس ماہ کا برا حال ہو رہا تھا' اس کے دل میں شاہکار کی محبت اچانک ہی پھوٹی تھی اور اس کا دل اس محبت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ایک لمحے کو شاہکار کی نظریں اس سے ٹکرائی تھیں' اس کی آنکھوں کی [illegible] شاہکار نے دیکھ لی تھی' اسی لیے نظریں پھیر گیا تھا۔ بھلا اس جیسے لڑکے محبت کر سکتے ہیں' ٹائم پاس کرتے ہیں' اس کا حلیہ ہی اسے فلرٹی ظاہر کرتا تھا۔" اپنی اس سوچ کو اس نے سحری کے وقت شاہکار کے گوش گزار کر دیا' جب وہ اسے سحری کے لیے بلانے گئی۔

"یہ تم منہ لٹکائے کیوں گھوم رہی ہو؟ کہیں تمہیں بھی تو مجھ سے محبت نہیں ہو گئی؟" شاہکار کے "بھی" پر تو اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

"میرے پاس ان فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ تمہاری اصلیت میں اچھی طرح جانتی ہوں' تم جیسے لڑکے ٹائم پاس کر سکتے ہیں' محبت نہیں کر سکتے' ارے تمہارا کردار کیا ہو گا یہ تو تمہاری ظاہری حالت سے پتا چل جاتا ہے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے واپس پلٹ گئی اور شاہکار اس کی پشت پر لہراتی چوٹی کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔

پہلا روزہ سب نے ہی رکھا تھا سوائے شاہکار کے۔ وہ سارا دن منہ چلاتا رہا' نہ اس نے کوئی نماز پڑھی اور نہ ہی روزہ رکھا۔ دادی کا غصہ دیدنی تھا۔

"اتنے بڑے ہو گئے تم اور کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ جان بوجھ کر روزہ چھوڑنا کتنا بڑا گناہ ہے۔"

"ماں نے بتایا تھا دادی۔ یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے' پلیز آپ مت بولیں۔" وہ انہیں ٹالنے کے انداز میں بولا۔ وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

افطاری کے وقت سب ہی افراد موجود تھے' شاہکار بھی وہیں موجود تھا۔ افطاری سے پہلے دادی جان نے رمضان کے مہینے کے [illegible] کے لیے دعا کی تو عکس ماہ نے شاہکار کے سدھر جانے کے لیے دعا [illegible] وہ اس خاندان کا اکلوتا لڑکا تھا' اس کی [illegible] سب کے لیے ناپسندیدہ تھیں' لیکن [illegible] کا تصور کر کے کوئی بھی اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔

"دادی یقیناً" شاہکار کے لیے دعا کر رہی ہوں گی۔ بے چاری دادی' ایک انڈا وہ بھی بے حد گندا۔" تائمہ نے سرگوشیانہ انداز میں کہا تو عکس ماہ خاموش ہی رہی' وہ تو خود شاہکار کے لیے دعا گو تھی۔

افطاری کے بعد سب نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا' رات ہوئی تو ابو اور تایا تراویح کے لیے گئے' وہ اپنے بیڈ روم میں گھس گیا۔

☼ ☼ ☼

دادی نے ہی روحیلہ خالہ کا فون سنا تھا اور یہ اطلاع دی تھی کہ عید کے تین دن بعد شاہکار واپس جا رہا ہے۔

"روحیلہ نے اسے یہاں شادی کے لیے بھیجا تھا۔ اسے یہاں کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔" دادی افسردگی سے بولیں۔ پکوڑوں سے [illegible] بناتی عکس ماہ نے نظریں اٹھا کر [illegible] شاہکار کو دیکھا' وہ بھی اسی کی سمت دیکھ رہا تھا' اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے نگاہیں پھیر لیں۔

دادی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں' اسے واقعی کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بات جو اس نے عکس ماہ سے کی تھی' وہ بھی ایک خواب تھا۔ شاید شاہکار کو وہاں موجود سب لڑکیوں میں سے وہ کچھ بہتر لگی ہو' لیکن محبت۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کسی سے محبت کریں اور اتنی جلدی اس محبت سے دستبردار ہو جائیں' یہ دستبرداری کا کام دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور وہ بھی محبت کو چھوڑنا ہو تو یہ مرحلہ جان لیوا ہوتا ہے' لیکن شاہکار پر تو کوئی اثر ہی نہیں تھا' البتہ اس لمحے جب اس نے شاہکار کی چوری پکڑی تھی' اسے محسوس ہوا جیسے وہ اب بھی اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ رکھتا ہے۔

شاید وہ اپنی محبت کو پہچان نہیں پایا تھا۔

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ گزر چکا تھا۔ ان ہی دنوں حلیمہ عکس ماہ کے لیے اپنے دیور کا رشتہ لے کر آئی۔ گھر میں سب ہی افراد نے اس رشتے کو پسند کیا تھا۔ دادی نے پھر بھی سوچنے کے لیے وقت مانگ لیا۔

"بھئی عکس ماہ سے تو پوچھیں' وہ کیا کہتی ہے۔" اس سارے معاملے میں وہ پہلی بار بولا تھا۔

ماہنامہ
حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور
ستمبر 2011 کا شمارہ عید نمبر شائع ہو گیا ہے
ستمبر 2011 کے شمارے کی ایک جھلک
☆ "بکھری یادوں کی خوشبو" قارئین سے عید سروے،
☆ اداکار "توقیر ناصر" سے ملاقات،
☆ "کوئی جا کے اُسے کہہ دو" سارہ جبین کا مکمل ناول،
☆ "تم سنگ عید مناؤں پیا" ساجدہ تاج کا مکمل ناول،
☆ "سانول" تحسین اختر کا ناولٹ،
☆ "محبتوں میں حساب کیسا" محمہ تبسم کا ناولٹ،
☆ "عید خوشیاں اور تم" شازیہ مصطفیٰ کا ناولٹ،
☆ اس کے علاوہ تحسین اختر، فرحت شوکت، نازیہ ضیاء، عارا ڈار اور سباس گل کے افسانے،
☆ "میرے ساحر سے کہو" اُم مریم کا سلسلے وار ناول،
☆ "وہ ستارہ صبحِ اُمید کا" فوزیہ غزل کا سلسلے وار ناول،
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ، انٹرویو، شوبز کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں
ستمبر 2011ء کا شمارہ
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

اس نے شاہکار کی سمت دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"وہ کیا کہے گی بھلا؟ اگر بڑے راضی ہیں' بہتر سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" حلیمہ نے رائے دی۔

"یعنی جس کو زندگی گزارنی ہے' اس کی کوئی مرضی ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے عکس ماہ کو اس کے بات کرنے کا انداز ہی پسند نہ آئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے لباس' اس کے حلیے میں ہی کوئی ناپسندیدگی والی بات ہو۔" وہ جو بات کر رہا تھا وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے' وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ماہ کو وہ بہت پسند آئے گا۔" حلیمہ کسی صورت اس رشتے کو ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتی تھیں۔

"بعض دفعہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہوتا ہے' حقیقت وہ نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکا تمہیں اپنے حلیے سے بہت اچھا دکھائی دے رہا ہو' لیکن اس کا کردار اچھا نہ ہو' خیر تم سب بہتر سمجھ سکتے ہو۔" وہ ذو معنی بات کر رہا تھا۔

عکس ماہ نے اس کی آنکھوں میں ایک سچے جذبے کے عکس دیکھے تھے۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ دادی نے ابھی تک ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیا' بقول ان کے ہر بار استخارے میں کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا' گھر میں سب ہی افراد عید الفطر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بس ایک وہ تھی جس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

دادی نے شاہکار کے لیے بھی کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے کچھ نہیں پہنے گا۔ لڑکے والوں نے فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ دادی کے کہنے پر کچن میں گھسی افطاری کا سامان تیار کر رہی تھی۔ وہی بڑے' فروٹ چاٹ' قیمہ بھرے رول' شامی کباب اور اس کے علاوہ کھانے کی تیاری الگ تھی۔ وہ نہ جانے کس کام سے کچن میں آیا تھا' اسے اتنے کام میں الجھا دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"اگر تم کہو تو میں کچھ ہیلپ کروا دوں تمہاری۔" اس نے کبابوں کے قیمے والے برتن کو اپنے آگے کھسکایا۔

"نہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم بہت دنوں سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کر رہیں۔ شاید تم اپنے رشتے سے خوش نہیں ہو۔" وہ اس کے منع کرنے کے باوجود کباب بنانے لگا۔

"نہ تو میں تم سے ناراض ہوں اور نہ ہی مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے۔ وہم ہے تمہارا۔" اس نے شاہکار سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دی۔

"تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں ماہی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور جس سے محبت ہو جائے اس کے دل کا حال زبان سے نہیں' آنکھوں سے سمجھا جاتا ہے۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔ عکس ماہ نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا۔

"محبت... یہ کیسی محبت ہے شاہکار' کہیں تمہارے تمہاری ذات میں کچھ تبدیلی چاہی تمہیں برا لگ گیا۔ میں نے تمہاری محبت کو اپنایا... میری بھی اسی محبت میں ایک فرمائش کی تھی... کتنے ہی دنوں سے جو بات کہنا چاہ رہی تھی' وہ اس کی زبان سے پھسل گئی۔ شاہکار کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

"میں نے کہنے کو تو تم سے کہہ دیا تھا کہ تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی' لیکن نہیں عکس ماہ... تم نہیں تو کوئی بھی نہیں... اور یہ بات میرے دل نے اسی رات جان لی تھی جب میں نے تم سے یہ الفاظ کہے تھے۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔

"پھر میری بات پر یوں برا کیوں مانا تھا؟ تمہیں اچھا نہیں لگا تھا نا؟" وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں برا لگا تھا' مگر تمہارا یوں کہنا برا نہیں لگا' بلکہ اتنی جلدی کہنا برا لگا۔ تم نے تو میرے اعتراف محبت کرتے ہی... خیر تھوڑا انتظار کرو۔" وہ آہستگی سے مسکرایا۔

"لیکن وہ لوگ' جو آج آرہے ہیں۔" اس کا دل ڈر کے مارے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں' وہاں ہاں نہیں ہو سکتی' دادی ہر بار استخارہ کرتی ہیں اور جواب کچھ نہیں ملتا۔ بس تم چاند نظر آنے کا انتظار کرو' تمہاری محبت تمہاری ہو کر رہے گی۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے باہر نکل گیا۔ عکس ماہ کے دل سے جیسے کوئی بوجھ سا سرکا تھا۔

پھر وہی ہوا' ان لوگوں کو دادی نے انکار کر دیا۔ وہ مطمئن نہیں تھیں۔

"چاند نظر آگیا۔ عکس ماہ چاند نظر آگیا۔"

وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ شاہکار کی واپسی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور ابھی تک اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی پھوپھو حلیمہ تائی نے دادی سے یا اس کی امی سے کوئی بات کی تھی۔

"چاند نظر آگیا۔" نائمہ نے چھت سے دوبارہ آواز دی۔ وہ سوچوں کے بھنور سے نکلی تو آسمان پر نظریں دوڑانے لگی۔

"چاند مبارک ہو ماہی!" عقب سے شاہکار کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سفید شلوار قمیص میں ملبوس' کٹے ہوئے بالوں کو سلیقے سے سجائے' وہ بھرپور مردانہ وجاہت کا نمونہ لگ رہا تھا' شاہکار علی خان۔ عکس ماہ اسے یک ٹک دیکھے گئی۔

"ارے کوئی ہے' جو میرے خاندان کے اکلوتے سپوت کو سنوارے۔" دادی کے الفاظ کان میں گونجے اور وہ جو پہلی مرتبہ اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھی' شرما کر سر جھکا گئی۔

"جو کام دادی اور مام بھی نہ کر سکیں' وہ تمہاری محبت نے کر دکھایا ہے ماہی! اپنا حلیہ بدلنے کے بارے میں تو میں نے اسی رات سوچ لیا تھا جب تم نے کہا تھا' لیکن بس اس چاند کے نظر آنے کا منتظر تھا۔ کہو تمہیں کون سا چاند اچھا لگا؟" وہ بات کے آخر میں شوخی سے بولا۔

"جس کا میں عکس ہوں' وہ اچھا لگا۔" وہ بھی بہت سوچ سمجھ کر بولی تھی' شاہکار اس کی بات سمجھ کر مسکرا دیا۔

"اندر ہمارے نکاح کی تیاری ہو رہی ہے۔ جلدی چلو' مام اور ڈیڈ بھی پہنچنے والے ہوں گے اور دادی تو میرا حلیہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ابھی ان کے ہوش میں آنے کے شکرانے کے نفل بھی پڑھنے ہیں۔" وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا اور عکس ماہ حیرت اور خوشی سے اپنے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

"وعدہ کرو اگلے سال سارے روزے رکھو گے۔"

"رکھوں گا... نماز بھی پڑھوں گا' جو تم کہو گی وہ کروں گا' کیونکہ میں جانتا ہوں تم میرا اچھا ہی سوچو گی' میرا عکس جو ٹھہریں۔" وہ مسکرا دیا۔ اندر سے ان کے نام کی پکار اٹھی تو وہ اندر کی طرف بھاگی۔

"چاند رات مبارک ہو عکس ماہ۔" وہ بلند آواز سے بولا تھا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور اندر بھاگ گئی۔

آسمان پر عید کا چاند یہ منظر دیکھ کر مسکرانے لگا۔

http://www.paktunplace.com

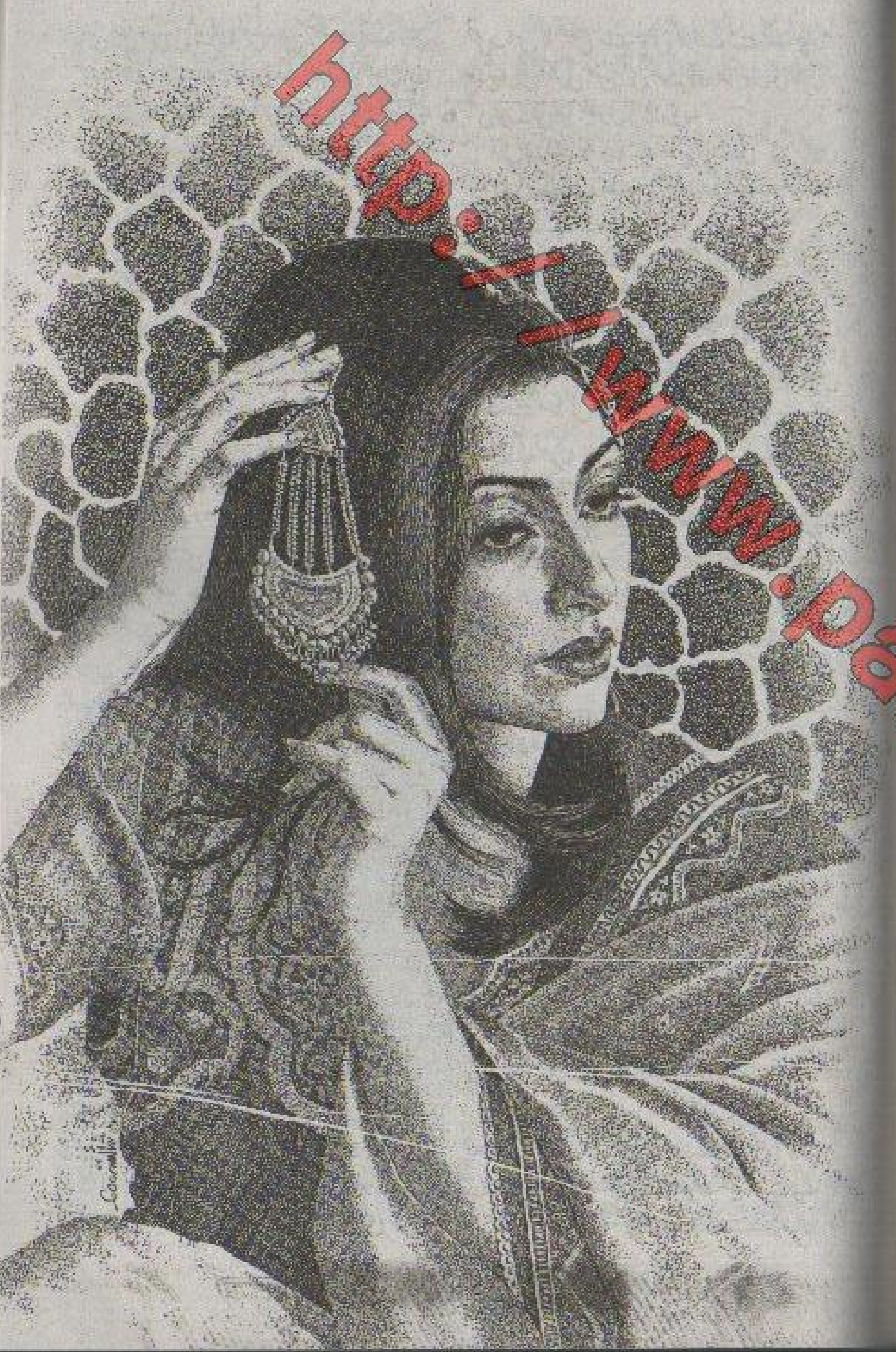

نایاب جیلانی

سنہری دھوپ کا موسم

اتنا بڑا بنگلہ نما یہ مکان آرٹسٹک ذہن رکھنے والے آرکیٹیکچر۔۔۔ اور محنت کش معماروں کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بہت وسیع، سرسبز و شاداب گھاس سے سجا لان نما صحن۔۔۔ جس کی تینوں بیرونی دیواروں کے ساتھ شاہ بلوط، زیتون، جوت، برگد کے درخت، ناریل، شہتوت اور صندل کے گھنے اونچے درخت شان سے کھڑے تھے۔

لوہے کے پھاٹک کے سامنے بنی بنفشی، پتھریلی روش کے اردگرد موتیا، گیندا، گل لالہ، گل بنفشہ کو کنار، گل خیر، گل داؤدی کے پودے ایک قطار میں ترتیب سے لگائے گئے تھے۔ گول برآمدے کے بائیں جانب باغیچے کے عین وسط میں اخروٹ کی لکڑی کا منقش جھولا تھا۔ موتیا کے پھولوں سے لدے پودے کے دائیں جانب لوہے کی ارغوانی پینٹ شدہ دو کرسیاں آمنے سامنے رکھی تھیں۔

بھاری مخملی پردے کو دو انگلیوں سے پکڑے وہ تھکی تھکی نظروں سے نیم تاریکی میں درختوں کے جھنڈ کو بغور دیکھتے ہوئے آخری سرسری سی نظر سے لان کا جائزہ لینے کے لیے قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہوئی تو اس کا دل لمحہ بھر کے لیے دھک سے رہ گیا۔

منقش جھولا اس وقت جگمگ کرتی اس بے تحاشا دودھ جیسی سفید عورت کے وجود سے جگمگا اٹھا تھا۔ کم از کم رخشندہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں ایسا حسن اور اس قدر تازگی و تابناکی نہیں دیکھی تھی۔ سفید

مکمل ناول

http://www.pakfunplace.com

لباس میں اس کی گلابی مائل سفید رنگت چمک رہی تھی۔ سفید موتیا کے پھولوں کے گجرے ہاتھوں اور کانوں میں پہن رکھے تھے۔ اس کے بال بے تحاشا لمبے اور چمکیلے تھے اور اس نے بڑی نزاکت سے انہیں اکٹھا کر کے دائیں شانے پر منتقل کیا تھا۔

"نجانے کون ہے حیام کی کوئی کزن یا پھر۔۔۔" وہ سر جھٹک کر اس حسین عورت کے سحر سے خود کو آزاد کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اس کی نظریں بے ساختہ بھٹک کر منقش جھولے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ رخشہ نے پردے کو پکڑے پکڑے سر گھما کر دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اس کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ چار بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے، دور کہیں موذن فجر کی اذان سے پہلے درود پاک کا ورد کرنے لگا تھا۔

رات بیت چکی تھی۔ کچھ ساعتوں بعد صبح کی سپیدی نے نمودار ہو جانا تھا۔ رخشہ نے پوری رات اس کھڑکی میں کھڑے سوچتے گزار دی تھی۔ درختوں، پھولوں، بودوں اور اس ستائیس اٹھائیس سالہ عورت کو دیکھتے اور سوچتے وہ لمحہ بھر کو بھول چکی تھی کہ وہ اس وقت کہاں کھڑی ہے؟

اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ پیروں میں گویا ورم آگیا تھا اور سر بھی درد سے پھٹنے لگا تھا۔ آنکھیں الگ جل رہی تھیں۔ بھاری لہنگا سنبھال کر بمشکل سج سج چلتے ہوئے سامنے لگے آئینے کو دیکھ کر وہ کچھ پل کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔

خلاف معمول اس بار سنگھار اور بھاری زیورات نے اسے بہت سی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچی چنبیلی جیسی رنگت میں کھلی گلابیاں بھی میک اپ کی مرہون منت تھیں۔ چھوٹی سی ناک میں لونگ چمک رہی تھی اور ہلکی بھوری آنکھیں خوشنما خوابوں کے بوجھ سے گلابی تھیں۔

وہ بہت حسین نہیں تھی۔ قبول صورت درمیانے قد اور صاف رنگت والی معمولی سی لڑکی تھی۔ اس کا تعلق سفید پوش گھرانے سے تھا۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی مگر نہ تو وہ بھائیوں کی لاڈلی تھی اور نہ ہی بھابیوں کی دلاری۔

اماں اور ابا نے اسے بے تحاشا محبت دی تھی مگر ان کی زندگی کے بعد رخشہ پر بھی زندگی کے دروازے تنگ ہوتے چلے گئے تھے۔

یہ اس کی خوش نصیبی ہی تھی جو اس نے جیسے تیسے ہی سہی اکنامکس میں ماسٹرز کر لیا تھا۔ حالانکہ اس کی بھابیوں نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ وہ نہ ہی پڑھ سکے۔ اس کوشش کے نتیجے میں انہوں نے بہت سے مسائل کے پہاڑ بھی کھڑے کرنا چاہے تھے مگر بھیا کی مہربانی سے وہ اپنی اس واحد خواہش کو پورا کر چکی تھی۔

وہ چاروں بھابھیوں کی مشترکہ ہیلپر (مددگار) تھی۔ مہذب لفظوں میں ہیلپر کہنا ہی مناسب ہے۔ ورنہ دوسرے الفاظ میں میڈ (خادمہ) بھی کہا جا سکتا ہے۔ بیک وقت اسے سب کی خدمت کے لیے خود کو تیار رکھنا پڑتا تھا۔ کسی بھی وقت اوپر، نیچے، دائیں، بائیں کسی طرف سے بلاوا آسکتا تھا۔

رخشہ کے ابا واپڈا میں ملازم تھے۔ انہوں نے بیٹوں کی تعلیم پر خوب توجہ دی تھی۔ اس کے چاروں بھائی تعلیم یافتہ تھے اور اچھے اداروں سے منسلک تھے۔ وہ اچھے خاصے خوشحال تھے مگر اس ... اماں نے سرکاری ہسپتال میں ... آنکھیں موندی تھیں۔

سب سے بڑے راحیل بھائی تھے۔ پھر عقیل، شرجیل اور ... بھائی تھے۔ رخشہ کا نمبر آخری تھا اور اس کے بھائیوں نے اپنی بیویوں اور بچوں کی ترتیب میں بھی اسے آخری نمبر پر رکھا ہوا تھا۔

اس کی زندگی عام لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی۔ پورا دن کاموں کے گرد گھومتے ہوئے رات کی آغوش میں سو جاتا تھا مگر رخشہ کی رات بارہ، ایک بجے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ یعنی اسے سونے کے لیے بارہ

بجے کے بعد نوشابہ بھابھی کی طرف سے اجازت ملتی تھی۔ چونکہ وہ گھر کی پہلی اور بڑی بہو تھیں۔ سو انہوں نے از خود اپنے "بڑے پن" کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ گھر پر اپنا راج چاہتی تھیں سوان کی چھوٹی بہن ریحانہ بھی جو کہ خیر سے چھوٹے بھائی کی زوجہ محترمہ تھیں، اپنی آپا کی ہم خیال تھیں۔ آسیہ بھابھی کو یہ دونوں کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھیں۔ ناعمہ بھابھی، بڑی بھابھی کی خالہ زاد بہن تھیں سو ان تینوں کے مزاج میں قطعاً فرق نہیں تھا۔

اکثر چاروں کی آپس میں ٹھن جانا معمول کی بات تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک کر دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد پھر سے معمول کی طرح راز و نیاز ہونے لگتے تھے۔ اکثر موضوع گفتگو کوئی نند ہوتی۔ جس کی شادی چاروں بھابھیوں کے لیے مسئلہ کشمیر بنی ہوئی تھی۔ اپنی بائیس سالہ کانچ سی نند انہیں بیالیس سالہ ادھیڑ عورت دکھنے لگی تھی۔ جس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ان کی اولین آرزو تھی۔

بڑی بھابھی رخشہ کو جلد از جلد اس لیے ٹھکانے لگانا چاہتی تھیں۔

کیونکہ ان کی لائبہ رخشہ سے صرف ایک سال چھوٹی تھی اور قد کاٹھ میں وہ اپنی نازک سی پھوپھی سے دو تین سال بڑی دکھائی دیتی تھی۔ انہیں رخشہ کو بھگتا کر اپنی لاڈلی کے لیے بھی سوچنا تھا سو اسی لیے وہ وقتاً فوقتاً نوراں آپا کی خدمات حاصل کرتی رہتی تھیں۔

"رخشی! آپا کے لیے گاجر کا حلوہ اور دودھ پتی بنا کر لے آؤ۔" نوراں آپا کو دیکھتے ہی نوشابہ پرجوش ہو جاتی تھیں۔

"نہ میں نہیں چائے پی کر کلیجہ ساڑتی۔ دودھ میں بوتل ڈال کر لانا رخشہ!" آپا بے تکلفی سے ہانک لگاتی تھیں۔

"آج تو تمہارا دل خوش ہو جائے گا" نوشابہ لوہ جگ اور گلاس ٹرے میں سجائے اندر داخل ہوئی تو نوراں آپا کھلی کھلی مسکراہٹ سجائے کہہ رہی تھیں۔

"اکلوتا لڑکا ہے۔ پھوپھی نے ہی پالا پوسا ہے۔ وہ ہی بھتیجے کے لیے کوئی بہو ہی سادی شریف اور اچھے گھرانے کی ڈھونڈ رہی ہے۔ میں نے رخشہ کا نام لے دیا۔ ... بھی اعلا اور صورت بھی بے مثال۔ تم راحیل ... کرلو۔ وہ دھوم دھام اور شور و غوغا نہیں چاہتیں۔ بس سادگی سے نکاح کریں گے۔ دو چار لوگ آئیں گے۔ ویسے بھی توقیر بیگم (حیام کی پھوپھی) بہت مذہبی خاتون ہیں۔ پردے کی پابند۔ شرعی طریقے سے سنت کے مطابق نکاح کریں گے۔ جہیز وغیرہ کی انہیں طلب نہیں۔" نوراں آپا باقی تفصیلات اسی جوش و خروش سے نوشابہ کے گوش گزار کر رہی تھیں۔

"راحیل کی طرف سے ہاں ہی سمجھو آپا! وہ جلد از

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول
دل کے موسم
مریم عزیز
قیمت 250 روپے
ننگے پاؤں
نگہت سیما
قیمت 250 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37، اردو بازار، کراچی

http://www.pakfunplace.com

جلد رخشندہ کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں۔" بھابھی پر اس کی شادی کردینے کی دھن سوار تھی۔ ان کی اپنی اولاد بھی جوان ہو چکی تھی۔ سو اس جلد بازی میں انھوں نے سرسری سی چھان پھٹک کے بعد متفقہ طور پر ہاں کردی۔

اور باقی کے معاملات بہت تیزی سے نبٹتے چلے گئے تھے جس کے نتیجے میں آج وہ اس پراسرار گھر کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ یہ گھر اور اس کے مکین بے حد پراسرار تھے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے جو وہ ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہی تھی۔ یہ خوف اس وقت شدت اختیار کر گیا تھا جب اس نے لاؤنج میں کھلنے والی کھڑکی سے ایک عجیب، بے حد عجیب منظر دیکھا۔

داخلی دروازے کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک پچیس سال کا خوبرو نوجوان باہر نکلا۔ اس نے پیچھے مڑ کر کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں آنکھیں موندے چلا جا رہا تھا۔ رخشندہ کا دل گویا سکڑ کر سمٹنے لگا۔ ایک خوف کی برقی لہر نے اس کے پورے وجود کو جھٹکے لگانے شروع کر دیے تھے۔ اس کا عروسی لباس لمحہ بھر میں پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ پورے وجود پر گویا لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

اس کے کمرے کی ایک کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی اور دوسری لاؤنج میں۔ وہ اس وقت لاؤنج میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہاتھ میں دبوچے کھڑی تھی اور اس کی نظروں نے پھر سے ایک عجیب اور انوکھا منظر دیکھا۔

وہ نوجوان آنکھیں موندے چلتا ہوا لان کی طرف جانے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا گویا وہ نیند کی حالت میں چل رہا ہے۔ اسی پل تنگ سی گیلری کے جالی دار دروازے کو کھول کر وہ حسین و جمیل عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ عورت بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس نوجوان تک پہنچ گئی تھی۔

وہ عورت لالہ رخسار تھی۔ لالہ نے اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر جانے سے روک لیا تھا۔ اس نوجوان کی آنکھیں بند تھیں۔ اب وہ ایک ہارے ہوئے مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ لالہ اس کا ہاتھ پکڑے ایک اور کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا گویا وہ عورت ایک کیف آگیں، ایک سرور بھری خواب کی کیفیت میں ہے۔ اس کا چہرہ جوش و جذبات سے دہک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا وہ اپنے ساتھ ایک قیمتی خزانے کو لے کر جا رہی تھی اور وہ خوبرو نوجوان ایک معمول کی طرح اس عورت کے ساتھ آنکھیں موندے چل رہا تھا۔ لالہ پراسرار انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ نوجوان بھلا کون تھا؟

"حیام واثق..." اس کا دل گویا وحشت کے عالم میں چلا اٹھا۔ اور وہ بھاری عروسی لباس کی پروا کیے بغیر ٹھنڈے ٹھار فرش پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

اس گھر میں داخل ہونے کے بعد یہ پہلی قیامت تھی۔ جو اس کے دل پر اچانک بپا ہوئی۔

اس گھر سے لے کر اس گھر تک اس نے عذاب ہی عذاب تو دیکھے تھے۔ خوابوں کا ذائقہ تو چکھا ہی نہیں تھا۔ مگر اس لمحے گویا ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ اس کا وجود اور اس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ عزت، وقار، اناسب کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ اس کے دل میں صف ماتم بچھی تھی۔ اس کا شوہر شب عروسی کا ایک ایک پل اور لمحہ کسی اور کی جھولی میں ڈال رہا تھا۔ ٹھنڈے فرش سے لپٹ کر تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے اس کی آنکھیں خون بہا رہی تھیں۔

اور وہ درد کی آخری منزل کو چھوتے ہوئے اپنے دل کے پہلے گھاؤ کو یاد کر رہی تھی جب اس کے بابل کے آنگن سے پیاری اماں کا جنازہ اٹھا تھا۔

☆

کئی راتوں کی جاگی ہوئی آنکھیں نجانے کس پل خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ اماں کی بیماری سے لے کر وفات تک کا عرصہ وہ ننگے پاؤں ہی تو چلتی رہی تھی اور جاگ جاگ کر تھکی تھکی آنکھوں میں چھالے پھوٹ پڑے تھے۔

مہمانوں سے بھرا گھر آہستہ آہستہ خالی ہو گیا تھا۔ سب لوگ گھڑی دو گھڑی افسوس کے چار لفظ بول کر اپنے اپنے آشیانے کی طرف لوٹ گئے تھے۔ جانے والوں کو بالآخر لوٹنا ہی تھا۔

عجیب سی دھاڑ نما آواز پر اس کی بند آنکھیں ایک دم کھل گئیں۔ کچھ دیر تو اس کے حواس ہی قابو میں نہیں آئے تھے۔

پھر رخشندہ نے پھرتی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے لائبہ کھڑی تھی۔ ناک چڑھائے۔

"کب سے دروازہ بجائے جا رہی ہوں۔ اتنی گہری نیند میں سوئی تھیں کیا۔" لائبہ نے ہنوز بگڑے لہجے میں جتا کر کہا۔ یہ رخشندہ کی سب سے بڑی بھتیجی تھی۔ عمر میں اس سے کچھ ہی چھوٹی۔ پر اسے کبھی پھوپھو کہنے کی زحمت گوارا انہیں کی تھی۔

"بس آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

"زرگون صاحب تشریف لائے ہیں۔ ماما کہہ رہی ہیں۔ ڈنر کو رونق بخشیے۔" لائبہ کا انداز تحکم بھرا تھا۔ وہ چونک گئی۔

اونچی لمبی سنہری رنگت اور نیلی آنکھوں والی لائبہ کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔

"بھابھی سے مینو کا بھی پوچھ آتیں؟" رخشندہ نے سلیپروں میں اڑسے اور باہر نکل آئی۔

"چکن کے علاوہ کچھ بھی بنالو۔ دادو کے دسویں تک چکن ہی پکتا رہا ہے۔ اب تو مرغی کے نام سے بھی چڑ ہو گئی ہے۔ مٹن، چائنیز رائس، اٹالین سیلڈ اور کھیر چاندی کے ورق سے سجی۔" لائبہ نے پوروں پر گننا شروع کیا تو رخشندہ کھیر پر پریشان ہو گئی۔ باقی سب تو ٹھیک تھا مگر کھیر کے لیے تو ڈھائی، تین گھنٹے سے بھی زیادہ وقت چاہیے تھا۔ مینو سن کر ہی اس پر تھکن سوار ہو گئی تھی۔

"کھیر کے بجائے ٹرائفل بنالیتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہائے کیوں؟ غنی کو ٹرائفل نہیں کھیر پسند ہے؟" اس کی توقع کے عین مطابق لائبہ چیخ پڑی۔

"وہ اماں کا افسوس کرنے آیا ہے یا پھر دعوت اڑانے۔" رخشندہ کو بھی ایک دم سے غصہ آگیا۔ اب تین چار ڈشز کے ساتھ میٹھے میں سب سے وقت طلب کام یعنی کھیر بنانا آسان تھوڑی تھا۔ مگر آرڈر پاس کرنے والے ان باتوں کی طرف دھیان کہاں دیتے تھے۔

"افسوس اپنی جگہ، آپ کیا اس نے بھوکا مرنا ہے۔ ویسے بھی پردیس سے آیا ہے۔ جہاز سے اتر کر سیدھا ادھر ہی گیا تھا۔"

لائبہ ہمیشہ کی طرح برامان گئی۔ رخشندہ نے بمشکل ضبط سے کام لے کر کچن کا رخ کیا تھا۔ بھابھی کے میکے والوں کی تعزیت اور افسوس کا حال تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔ سوائے کھانے پینے کے کوئی دوسرا کام انہیں آتا ہی کہاں تھا۔ دسویں تک ان لوگوں نے ادھر ہی ڈیرا لگائے رکھا تھا۔ سارا دن شربت، دودھ سوڈا اور بوتلیں ہی چلتی رہتی تھیں اور رخشندہ تن تنہا مہمانوں کی اس فوج کو بھگتاتے ہوئے تھک چکی تھی۔ اس نے شکر کیا تھا کہ گھر مہمانوں سے خالی ہوا ہے اور اب غنی صاحب کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔

غنی کی میزبانی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بلا کا نخریلا اور موڈی تھا۔ ابھی اسے فرنچ آملیٹ چاہیے ہوتا اور کچھ دیر بعد وہ فرائی انڈے کی فرمائش کر دیتا۔ چائے کے بعد ملک شیک مانگ لیتا اور کبھی آئسکریم کھا کر اسے کافی کی طلب ہونے لگتی تھی۔

اس وقت بھی رخشندہ کلاک کی طرف دیکھنے کے بعد کام میں جت گئی تھی۔ باقی سب تو ہو گیا تھا۔ کوکر میں گوشت بھی گل گیا۔ چاول بھی تیاری کے قریب قریب پہنچ گئے تھے۔ سیلڈ بھی فریج میں رکھ دیا تھا۔ البتہ کھیر ابھی چولہے پر رکھی تھی۔

وقت تنگ تھا۔ دو بجے تک میز پر کھانا ہر صورت لگانا ہوتا تھا اور ابھی روٹی بھی نہیں بنائی تھی سو وہ کچھ سوچ کر آنچ دھیمی کیے آسیہ بھابھی کے پورشن میں چلی آئی تھی۔ کچھ سال پہلے برابر کے دو پلاٹ مزید خرید کر بھائیوں نے اپنے اپنے پورشن الگ کر لیے تھے۔

رخشندہ بڑی بھابھی کے ساتھ ہی رہتی تھی تاہم ضرورت کے وقت اسے چاروں طرف سے پکار لیا جاتا

http://www.pakfunplace.com

تھا۔

ان کی ملازمہ۔ کشور کو تندور سے روٹی لانے کو کہا اور بھاگتی ہوئی اپنے پورشن میں آگئی۔ وہ کچن میں پہنچی تو لائبہ کو موجود دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کہاں گئی تھیں؟" لائبہ بھلا تفتیش کیے بغیر رہ سکتی تھی۔

"بھابھی کی طرف۔" وہ مختصر بتا کر کھیر میں کفگیر چلانے لگی۔ اللہ کا شکر تھا۔ کھیر لگنے سے بچ گئی تھی۔

"مٹن تو بہت اچھا بن گیا ہے۔" وہ علاوتاً دو تین بوٹیاں چکھ کر بیٹھی تھی۔ "ویسے یہ کھیر اتنی جلدی ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ نکال کر فریزر میں رکھ دینا۔ رات کو کھائیں گے۔"

"بتانے کا شکریہ۔" رخشہ کلس کر بولی۔

"ویسے چاچی کی طرف کیا کرنے گئی تھیں؟"

"تم ایک کام کروگی؟" رخشہ اس کا سوال نظر انداز کرکے تحمل سے بولی۔

"میں نے ٹیبل پر برتن نہیں لگانے۔" وہ فوراً بدک کر پیچھے ہٹی۔

"نہیں یہ میں خود کرلوں گی۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا۔

"تو پھر؟"

"تم ذرا دیر کو کچن سے باہر چلی جاؤ۔"

"جاتی ہوں۔" لائبہ کو غصہ آگیا۔ "مما کہہ رہی ہیں کھانا جلدی سے لگادیں۔۔۔۔ کب سے کچن میں گھسی ہیں اور ابھی تک میز خالی پڑی ہے۔" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ سجا کر باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ رخشہ کا میٹر گھوم کر رہ گیا۔

"کچن میں گھس کر آرام فرما رہی ہوں۔ اسی لیے ابھی تک میز خالی پڑی ہے۔" وہ سلگتے ہوئے شو کیس سے برتن نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔ اسی پل کشور بھی آگئی۔

"یہ لو باجی! پوری آٹھ روٹیاں ہیں۔"

"شکریہ کشور! تمہیں نیند سے جگایا ہے۔" اس کی آنکھوں میں واضح تشکر تھا۔

"کوئی بات نہیں باجی! شکریہ کیسا۔" رخشہ میز پر کھانا لگا کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ غنی جو زور و شور سے کسی بحث میں الجھا ہوا تھا اسے اندر آتا دیکھ کر ایک دم چپ ہوگیا۔

"اس گھر میں مہمانوں سے ملنے کا کوئی رواج نہیں۔" اس کا خاموش رہنا صرف چند سیکنڈز پر محیط ہوتا تھا اور جب وہ بولنے لگتا تھا تو پھر اسے کوئی چپ کروانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"رخشہ سو رہی تھی۔ اسے خبر نہیں ہوئی تھی کہ تم آئے ہو۔" نوشابہ نے مسکرا کر جھوٹ بولا تھا اور پھر مزید اسے بولنے کا موقع فراہم کیے بغیر جلدی سے اٹھ گئیں۔

"غنی! پہلے کھانا کھالو۔"

"آپ تو کہہ رہی تھیں' رخشہ سو رہی ہے۔ پھر یہ کھانا کس جن نے فٹافٹ بنادیا۔" وہ بھی تو غنی تھا۔ بال کی کھال اتارنے والا۔ رخشہ سلاد کی پلیٹ اٹھائے کھانے والے کمرے میں داخل ہوئی تو غنی کی آواز سن کر پل بھر کے لیے اس کے قدم رک گئے تھے۔

"کیا لائبہ نے کوکنگ کی کلاسز لینا شروع کردی ہیں۔" ایسے تاک کر وار کرتا تھا کہ اگلے بندے کو بولنے کی یا کچھ وضاحت دینے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔

"ایسی امید تو نہیں نظر آتی۔" اسے جلا بھنا کر مارنے کی عادت تھی۔ آخر کو پھوپھی کا لاڈلا اکلوتا بھتیجا تھا۔

"اب لائبہ کو کچن میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ ابھی کل اس نے [illegible] دستر خوان لگائے تھے۔" نوشابہ نے [illegible] کی کوشش کی تھی۔

"[illegible] نہیں پڑنے والا۔" وہ دائیں بائیں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لائبہ انڈا ابال لے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" رخشہ کے سامنے نوشابہ جزبز ہوکر رہ گئی تھیں۔ "تم کھانا تو کھاؤ۔" وہ ابھی تک میز پر دونوں ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ سو

نوشابہ نے اسے کھانے کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"میں اتنا ہیوی لنچ نہیں کروں گا۔ ابھی دو گھنٹے ہوئے ہیں جہاز سے اترے ہوئے۔ معدہ چونکہ میرا اپنا ہے۔ سو میں اس پر ظلم نہیں کرسکتا۔"

وہ کبھی لگی لپٹی رکھنے کا قائل ہرگز نہیں تھا۔ ہر بات فٹ سے منہ پر مار دیتا۔ چاہے اگلے بندے کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرتی۔ اسے جھوٹ اور منافقت سے نفرت تھی اور خوشامد سے سخت ترین چڑ۔

"اچھا یہ چاول تو لو۔ ہلکے سے ہیں۔" نوشابہ نے لگاوٹ سے کہا۔

"مجھے ایپل جوس بنادیں اور بس۔" ہمیشہ والے نخرے شروع ہوچکے تھے۔ رخشہ کو شدید غصہ آگیا۔

"جاؤ لائبہ! غنی کے لیے جوس نکال کرلے آؤ۔" نوشابہ نے [illegible] کی طرف متوجہ لائبہ کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔ وہ جھٹ سے اٹھ گئی۔ رخشہ بھی لائبہ کے پیچھے ہی کھسکنے لگی تھی جب غنی نے گردن موڑ کر مخاطب کیا۔

"تم کہاں جارہی ہو؟ کھانا تو کھالو۔ کیا پکا پکا کر ہی بھوک کا خاتمہ ہوگیا ہے؟" وہ غنی تھا بلا کا بے تکلف۔ بغیر جھجکے ہر بات صاف صاف کہہ دینے والا۔ جہاں رخشہ گھبرا کر پلٹی تھی۔ وہیں نوشابہ کچھ سنبھل کر بولیں۔

"رخشی! کھانا کھالو نا۔۔۔۔ پھر سو جانا' بے چاری تھک کر ٹوٹ چکی ہے۔ اماں کی وفات کا صدمہ ہی ایسا بھاری تھا۔" انہوں نے آواز میں حتی المقدور رقت بھرلی تھی مگر غنی پر کم ہی ان لہجوں کا اثر ہوتا تھا۔

"ظاہر ہے جس کی ماں تھی۔ صدمہ بھی تو اسی کے لیے ہوگا۔" وہ تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈال کر چکھ رہا تھا مگر سارا دھیان اس کا رخشہ کی طرف تھا۔

"رخشی! کھاؤ نا۔۔۔۔ بہت اچھا کھانا بناتی ہو۔ کبھی اپنے پکائے کھانوں کی لذت خود بھی محسوس کرلیا کرو۔"

"تم بھی تو کھاؤ۔ ابھی آدھے گھنٹے بعد تمہیں زوروں کی بھوک لگ جائے گی۔" نوشابہ بھی اس کی پھوپھی تھیں۔ بھتیجے کی رگ رگ سے واقف۔ وہ جانتی تھیں۔ ٹھیک گھنٹے بعد اس نے بھوک بھوک چلانا شروع کردینا تھا۔

"میری پیاری پھوپھو کس قدر میری مزاج آشنا ہیں۔" وہ مسکرایا تھا۔ جگر جگر کرتی آنکھیں رخشہ کے [illegible] ہوئے تھیں۔

"اچھا مسکہ نہ لگاؤ۔" نوشابہ نے لاڈ سے کہا۔ سچ تو یہ تھا اپنے اکلوتے بھائی کے اس اکلوتے بیٹے سے ان دونوں بہنوں کو بے تحاشا محبت تھی۔ ان کے سب سے بڑے بھائی عرصہ دراز سے آئرلینڈ میں مقیم تھے۔ غنی ان کا آئرش بیوی میں سے اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کے بھائی اور بھابھی بہت عرصہ ہوا وفات پاگئے تھے۔ اب میکے کے نام پر صرف غنی ہی بچا تھا۔ سال میں دو مرتبہ پاکستان کا چکر لگاتا تھا۔ سو وہ دونوں بہنیں خوشی کے مارے بے حال ہوجاتی تھیں۔ نوشابہ کی خواہش تھی کہ غنی پاکستان میں شفٹ ہوجائے۔ مگر فی الحال اس کا پاکستان میں ہمیشہ کے لیے قیام کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اکثر وہ سیاحت کے لیے دوستوں کے ہمراہ پاکستان آتا تھا۔ مگر جب بھی آتا۔ اپنی پھپھیوں سے ضرور ملتا تھا۔

"پھوپھو! لگتا ہے' آپ کی بیٹی سیب توڑنے باغ میں چلی گئی ہے۔"

"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں۔" اسی پل لائبہ اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں جگ اور گلاس پکڑ رکھے تھے۔

"ہائیں۔۔۔۔ تم جوس لے آئیں؟ مگر بلینڈر چلنے کی آواز تو نہیں آئی۔" غنی کے دل میں جو بات ہو' وہ بھلا کیسے دل کے اندر رہ سکتی تھی۔ یہی بات تو رخشہ بھی سوچ رہی تھی۔

"میں نے مارکیٹ سے منگوایا ہے۔ فی الحال ریڈی میڈ ملا ہے۔ بغیر نخرا کیے پی لو۔" لائبہ نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ ریڈی میڈ جوس تم خود ہی پیو۔۔۔۔ مجھے تو فریش جوس چاہیے۔" وہ بھی تو غنی تھا۔ ہمیشہ کا نخریلا۔ کھانے پینے کے معاملے میں تو نچ کرکے رکھ دیتا تھا۔

http://www.pakfunplace.com

"تو نہ پیو میں پی لیتی ہوں۔" وہ بھنا کر بولی تھی۔ دونوں کے درمیان تکرار شروع ہو چکی تھی۔ اسی لیے بیچ میں نوشابہ کو بولنا پڑا۔

"فریج میں سیب تو رکھے ہوئے تھے۔ تم بھی ہاتھ ہلا لیا کرو۔" انھوں نے لائبہ کو ڈپٹ کر کہا۔

"رہنے دیں پھوپھو! لائبہ کی ننھی سی جان کو دقت (مشکل) میں کیوں ڈالتی ہیں۔ اپنی رخشندہ ہے نا.... مفت میں روٹیاں توڑتی ہے۔ کوئی کام ہی کر دیا کرے۔" اس کی چمکتی آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھی لگی تھی۔ ادھر نوشابہ بھی اس کے لہجے میں شرارت کو سمجھے بغیر تائیدی انداز میں بولیں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم' جاؤ رخشندہ! تازہ جوس نکال کر لاؤ۔"

"جی...." وہ جو خود ہی یہاں سے اٹھنا چاہتی تھی' اجازت ملتے ہی گویا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھی۔

لائبہ اور غنی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ نوشابہ اپنی نیند کا کوٹہ پورا کرنے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ اس نے جوس نکال کر فل سائز مگ میں ڈال کر فریج میں رکھا تھا۔ اب وہ میز پر سے برتن اٹھا کر سنک میں رکھ رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ برتن دھو کر ہی کچن میں سے نکلے گی۔ پھر چھ بجے تک چائے کے برتن بھی اکٹھے ہو جانے تھے۔ سو وہ جلدی جلدی برتن دھو رہی تھی۔ جب اپنے بالکل پیچھے غنی کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

"لوگ خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔" وہ اچک کر کچن سلیب پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ رخشندہ نے بغیر مڑے ایک دفعہ پھر برتنوں کو صابن لگانا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب غنی اسے بولنے پر مجبور کرنے کے لیے الٹی سیدھی ہانکتا رہے گا۔

"کچن میں کیا لینے کے لیے آئے ہو؟" وہ تلملا کر بولی۔

"تمہیں دیکھنے۔" غنی نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

"اب دیکھ لیا ہے تو پھر جاؤ۔"

"دیکھا کہاں ہے۔ رخ موڑے کھڑی ہو۔ ذرا درشن تو کروا دو۔" لہجے میں مصنوعی التجا بھری گئی تھی۔

"غنی! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس نے پلیٹ غصے سے سنک میں پٹخی۔

"اب آئی ہو' اپنے اصل رنگ میں۔" وہ گویا سرشار ہو گیا۔ "ویسے میں اتنی آسانی سے دفع نہیں ہونے والا۔"

"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ سچ بتاؤ' کتنے دن کا قیام ہے؟" وہ آنکھیں سکیڑے پوچھنے لگی۔

"دن نہیں' مہینے' پورے دو مہینے شرف میزبانی بخشوں گا۔" غنی کھکھلایا۔

"ہمیشہ کی طرح بلائے جان بن کر آئے ہو؟" اس نے گویا دانت کچکچا ڈالے۔

"تم تو یہی کہو گی۔ کبھی ذرا میری پیاری پھوپھو اور پیاری لائبہ سے ذرا پوچھنا۔ وہ تو کہیں گی۔ میں ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں۔" وہ دلار سے بولا۔

"پیاری لائبہ کا بھی تمہارے کاموں سے متفق ہونا تو نہیں لگتا۔ ورنہ کان سے پکڑ کر تمہیں باہر نکال دے۔" رخشندہ نے ہاتھ دوپٹے سے خشک کیے اور فریج کھول کر جوس کا گلاس نکال کر غنی کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ یوں کہ تھوڑا سا جوس چھلک کر اس کے کپڑوں پر بھی گر گیا۔

"ہر وقت مرچیں کیوں چبائے رکھتی ہو۔ میری تو حسرت ہے۔ تم دن میں صرف ایک آدھ بار مسکرا دیا کرو۔" اس نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ جوس چڑھا لیا۔

"اگر تمہیں میرے صدمے سے گزرنا پڑتا تو پھر پوچھتی۔" رخشندہ آنکھوں میں اتری نمی کو چھپا گئی تھی۔ ماں باپ کے جانے کا دکھ پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

"مجھے پھوپھو نے بتایا تھا۔ آنٹی کی ڈیتھ کے متعلق — سو میں نے سوچا ایک چکر پاکستان کا لگا آؤں۔ مگر ادھر تو لوگوں کو فوراً "روٹیاں گننے کی پڑ گئی ہے۔" وہ پھر بھی جتانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"تم بھی صبر شکر کر کے کھا لیا کرو۔ نخرے مت دکھایا کرو۔" رخشندہ نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف

کر کے خفگی سے کہا۔

"تمہارا غصہ بھی مجھ غریب پر نکلتا ہے۔" وہ بسورا۔

"پیاری لائبہ کا بھی کبھی دماغ چاٹ لیا کرو۔" وہ بھنائی۔ "اب دو مہینے میرے سر پر سوار رہو گے۔"

"تمہیں' بیچ کے دنوں میں اپنے یاروں کو بھی شرف میزبانی بخشوں گا۔ تم غم نہ کھاؤ۔" غنی اسے تسلی دے رہا تھا۔

"اب پھوٹو' یہاں سے۔" اس کا ضبط جواب دے گیا۔ "باتوں میں لگائے رکھتے ہو۔"

"اچھا ایک کپ چائے بنا دو۔" وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

"جس قسم کی چائے پیتے ہو۔ وہ میں نہیں بنا سکتی۔" اس نے ہاتھ [illegible] کر کہا۔

"جس [illegible] کی ہو ویسی بنا دو۔"

"میں تو جوشاندہ پیتی ہوں۔" اس نے زچ ہو کر [illegible]

"مجھے بھی جوشاندہ بنا دو۔" وہ اطمینان سے پیر جھلا رہا تھا۔ رخشندہ نے پلٹ کر برنر آن کیا۔ چولہے پر پانی رکھا اور پھر کچن کیبنٹ سے پیکٹ نکال کر جوشاندہ گھولنے لگی۔ ایک کپ میں گرما گرم جوشاندہ ڈال کر سلیب پر اس کے قریب پٹخ کر بولی۔

"اب پی کر دکھاؤ۔"

"آدھا تم پیو گی آدھا میں.... یہ تو پکڑو۔" وہ زبردستی رخشندہ کے ہاتھ میں کپ پکڑا رہا تھا۔ "پہلے تم پیو گی۔ تاکہ تمہارا جھوٹا پی کر میں امر ہو جاؤں۔"

"بکواس نہیں کرو۔ بنوایا کیوں ہے؟" رخشندہ اس کی ان ہی عادتوں سے خار کھاتی تھی۔ "اب آرام سے پی لو۔ ورنہ تمہارے اوپر گرا دوں گی۔" اس کا انداز صاف دھمکانے والا تھا۔

"پہلے تم پیو...." وہ بھی اپنی ضد پر اڑ چکا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ شروع سے ہی ایسا تھا اور اسی طرح سے دماغ چاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ یوں کہ بندہ اپنا ہی سر پھاڑنے پر مجبور ہو جاتا۔

رخشندہ کے ساتھ اس کی بے تکلفی بھی ہنوز تھی۔ بہت بچپن سے جب انکل زندہ تھے۔ تب سے ہی وہ ان کے گھر پوری چھٹیاں گزار جاتا تھا۔ تین تین ماہ پھپھو کے گھر [illegible] آ جاتا تھا۔ اور ایسے ہی لاڈ وہ زبردستی رخشندہ سے بھی اٹھوا لیتا تھا۔ اور وہ کچھ تو [illegible] بھی کے خیال سے غنی کے نخروں کو برداشت کر جاتی تھی۔

وہ گرما گرم کپ اس کے منہ سے لگا چکا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ جکڑنے کے بعد وہ کچھ جوشاندہ اس کے حلق میں انڈیل کر اب اطمینان سے کپ منہ سے لگا کے پی رہا تھا۔ جبکہ وہ جلے ہونٹوں پر ہاتھ رکھے کفگیر اٹھا رہی تھی۔ اور چونکہ غنی الرٹ کھڑا تھا سو کپ سلیب پر پٹخ کر باہر کی طرف بھاگ گیا۔ جبکہ رخشندہ کفگیر اٹھائے اس کے پیچھے تھی۔

"اب آئی ہو نا' اپنی اصلی حالت میں۔ مجھ سے تمہاری یہ سنجیدگی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔" وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک ماہر سائیکاٹرسٹ ہے۔

☼ ☼ ☼

بہت بچپن میں غنی' لائبہ اور وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ لائبہ اس کے بغیر سانس بھی نہیں لیتی تھی۔ کھانا' پینا حتیٰ کہ سونا تک اکٹھے ہوتا تھا۔ اکثر لوگ ان دونوں کو جڑواں بہنیں سمجھتے تھے۔ لائبہ کچھ اس طرح سے رخشندہ کے ساتھ اٹیچ تھی۔ اور یہی حال غنی کا بھی تھا۔ وہ ہر چھٹیوں میں پاکستان آتا تھا اور اپنی پھوپھو کے گھر ساری چھٹیاں گزار جاتا تھا۔ اس کی لائبہ سے بھی زیادہ رخشندہ کے ساتھ بنتی تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ اس کے بے تحاشا ستانے' چڑانے پر لائبہ واک آؤٹ کر جایا کرتی تھی تاہم رخشندہ کا غنی کے ساتھ دوبدو مقابلہ ہوتا تھا۔ وہ ہرگز بھی ہار تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اور غنی کو اس کی یہی عادت بہت اچھی لگتی تھی۔

بچپن میں ایک ساتھ لڑتے' جھگڑتے شرارتیں

کرتے، وقت کے پنچھی نے شعور کی منزلوں کے حوالے کیا کیا، رخشہ خود بخود سنجیدگی کی چادر اوڑھ گئی تھی۔ لائبہ قلبی طور پر ہی نہیں ذہنی اور روحانی طور پر بھی اس سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ ایک تو اسے اپنے اکلوتے پن پر بھی بہت مان تھا۔ دوسرے وہ حسین بھی بہت تھی۔ سو اس کا رویہ رخشہ سے بہت بدل گیا تھا اور کچھ رخشہ کو اماں کی بیماری نے دنیا کی ہر رنگینی سے دور کر دیا تھا۔

کتابوں کے علاوہ اماں کی دیکھ بھال اور گھر کی ذمہ داریوں نے اسے خاصا خاموش طبع بنا دیا تھا۔ پھر بھائیوں کے روکھے رویوں نے اسے بہت حساس کر دیا تھا۔ ایسے میں غنی کی آمد ایک خوشگوار جھونکے کی مانند لگتی تھی۔ مگر یہ غنی بھی بلا کا کمینہ تھا۔ ابھی تک ستانے اور چڑانے سے باز نہیں آتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ زرگون غنی کی آمد کے ساتھ ہی چاروں پورشنز میں تھرتھلی مچ جاتی تھی۔ وہ بیک وقت رخشہ کے چاروں بھائیوں اور چاروں بھابھیوں کا چہیتا تھا اور گھر کے نونہال تو غنی کے دیوانے تھے۔ اور غنی کی آمد کے دن گن گن کر گزارتے تھے۔ کیونکہ غنی اپنے ساتھ لائے بھاری بھرکم بیگز اور سوٹ کیس میں ننھی پلٹون کی ضرورت کے متعلق ہر چیز لے کر آتا تھا۔

غنی کا قیام دو ماہ تک تھا۔ وہ اپنی حرکتوں سے رخشہ کو عاجز کر کے رکھ دیتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت صبح صبح محترم نے انڈوں کے حلوے اور قیمہ بھرے پراٹھوں کی فرمائش کر دی تھی۔ رخشہ کو اس کی فرمائش پوری کرنا برا نہیں لگتا تھا مگر جو کچھ وہ ان فرمائشی لوازمات کا حال کرتا تھا اس پر رخشہ کو حد درجہ تپ چڑھ جاتی تھی۔

"کیا ابھی تک پراٹھا نہیں بنا؟" وہ تیسری مرتبہ کچن میں جھانک کر بولا۔

"توبہ ہے غنی! تھوڑا صبر کرو ابھی بنا جاتا ہے۔" وہ احتیاط سے پراٹھا بنا رہی تھی۔

"تمہیں گیارہ بجے تک بھوکا رہنا پڑتا تو پھر میں پوچھتا تم سے۔" غنی مسلسل [illegible] جا رہا تھا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ؟" رخشہ نے احتیاط سے توے پر روٹی ڈالی۔ دراصل قیمہ بھرے پراٹھے بنانے اسے ابھی تک نہیں آئے تھے۔ عموماً روٹی توے پر پہنچتے ہی پھٹ جاتی تھی۔

"پوچھو؟" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"تم اپنی دوسری پھوپھو کے پورشن میں کب جاؤ گے؟"

"بڑے افسوس کا مقام ہے۔" وہ سنجیدہ ہو کر تاسف سے بولا۔ "مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟"

"مگر تم مہمان کہاں ہو۔"

"ہاں ہاں..... میں تو بلائے جان ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں پھوپھو کو 'لوگوں کو میرا قیام خاصا کھٹک رہا ہے۔'" وہ سچ مچ اسٹول سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا یوں کہ رخشہ فوراً گھبرا اٹھی۔

"غنی! انسان بنو، خبردار اگر بھابھی کو کچھ الٹا سیدھا بتایا۔"

"اب تو ضرور بتاؤں گا۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"جاؤ، جا کر بتاؤ۔ اپنا شوق پورا کر لو۔ پھر ناشتہ بھی کسی اور سے کروانا۔" رخشہ بھی دھمکی آمیز لہجے میں بولی تھی اور یہ تو ان کا معمول تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر تکرار، بحث و مباحثہ زبردستی کا [illegible]

"اللہ کی قسم، بہت ظالم ہو۔" وہ پھر سے اسٹول پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ "تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ناشتہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ورنہ بھابھی اور لائبہ کی کوکنگ سے تو اللہ بچائے۔"

"ابھی میں جا کر بتاتی ہوں بھابھی کو۔ غنی ان کی برائیاں کر رہا ہے۔"

"تو بتا دو۔ میں سچ بولنے میں جھجکتا نہیں ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"اچھا، دماغ مت چاٹو میرا۔ یہ پراٹھا پکڑو اور نکلو یہاں سے۔" اس نے پلیٹ زبردستی غنی کے ہاتھ میں تھمائی۔

"مجھے بھی گرمی میں جھلسنے کا شوق نہیں۔ تمہیں کمپنی دینے کے خیال سے بیٹھ گیا تھا۔"

"شکریہ جناب کا۔" وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"وعلیکم شکریہ۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹے بعد پھر سے کچن کو رونق بخشیں گے تب تک کے لیے اللہ حافظ۔" وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا تھا جبکہ رخشہ نے ہنستے ہوئے جلدی جلدی کچن میں بکھرا پھیلاوا سمیٹنا شروع کر دیا۔ بھابھی اور لائبہ تو ناشتہ کرنے کے بعد بازار چلی گئی تھیں۔ ادھر رخشہ کو دوپہر کے کھانے کی فکر لگ گئی تھی اور جب وہ کدو چھیلنے میں مصروف تھی تب بھابھی اور لائبہ بھی آگئیں۔

"تم ابھی تک [illegible]؟" بھابھی نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا۔ جب وہ گھر سے جا رہی تھیں تب وہ بھی کہیں نکلنے کو تیار تھا۔ مگر اس وقت غنی کو گھر میں دیکھ کر انہیں اچھا خاصا شاک لگا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر اس نے گھر میں ہی رہنا تھا تو پھر لائبہ کو بازار نہیں جانا چاہیے تھا۔ مگر اس بے صبری شاپنگ کی شیدائی لائبہ کی ضدی طبیعت کا بھلا کیا کرتیں۔ وہ ہر جگہ جانے کے لیے فوراً "تیار" ہو جاتی تھی کہ گھر میں رہ کر رخشہ کا ہاتھ نہ بٹانا پڑ جائے۔

غنی نے سنی ان سنی کر کے ہانک لگائی تھی۔

"رخشی! اسکوائش کا جگ تو بنا لاؤ۔ پھوپھو بے چاری گرمی میں ہلکان ہو کر آئی ہیں۔"

"خود اٹھ کر بنا لو..... پھوپھو کے ہمدرد کو تو دیکھو، ہونہہ۔" وہ گویا سنی ان سنی کر کے اپنے کام میں لگی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ خود چلا آیا۔

"چینی اور اسکوائش کی بوتل کہاں رکھی ہے۔ ہم خود ہی اپنی پھوپھو کی خدمت کر لیتے ہیں۔"

"یہ لو۔" اس نے لحاظ مروت ایک طرف رکھ کر ساری چیزیں میز پر سجا دیں۔ غنی نے فوراً اٹھ کر پورا جگ بھر کر بنایا تھا۔ ایک گلاس اسے بھی عنایت کیا گیا تھا۔ اس نے بھی جھجک ایک طرف رکھ کر پورا گلاس پی لیا۔ آج گرمی بھی بلا کی تھی۔ سورج گویا آگ برسا رہا تھا۔

"یہ اور پی لو۔" غنی نے ایک اور گلاس بھر کر اس کی سمت بڑھایا۔

"بس بس، مجھے کفران نعمت کرنا ضروری نہیں لگتا۔" جب وہ گلاس رکھنے کے لیے پلٹ کر سنک تک آئی تو حیران ہی رہ گئی۔ پھوپھو کے دلارے نے جگ کو منہ لگا رکھا تھا۔ دوسرے ہی پل جگ خالی ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"بھابھی کو کیا دو گے؟"

"وہ حافظ سوڈا واٹر سے یہ لمبے لمبے گلاس مینگو شیک کے پی کر آئی ہوں گی۔ اب اسکوائش پی کر منہ کا ذائقہ خراب کرنا ہے کیا۔" وہ مزے سے بولا تھا۔

رخشہ کو ہنسی آ گئی۔ چالاکیاں ساری زرگون غنی پر ہی تو ختم تھیں۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی اور وہ گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

بہت دن کی حبس اور گھٹن کے بعد گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ کل رات بے حد طوفانی بارش ہوئی تھی۔ درختوں کا سارا پھل ٹوٹ کر گر گیا تھا۔

صحن کی صفائی رخشہ کے ذمے تھی۔ حالانکہ صحن تو ان چاروں بھائیوں کا مشترکہ تھا۔ اس وقت بھی وہ لمبی سی جھاڑو پکڑے پھولوں اور پھلوں کے ڈھیر کو اکٹھا کر رہی تھی۔ پائپ بھی لگا رکھا تھا۔

صرف آدھے گھنٹے میں پورا صحن دھل دھلا کر چمک اٹھا تھا اور وہ بھی گویا تھک ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ وائپر جھاڑو اور پائپ کو ٹھکانے لگا کر وہ اک طائرانہ سی نگاہ صحن پر ڈالنے کے بعد اندر جانے ہی لگی تھی جب اوپری منزل کی ریلنگ سے ناعمہ بھابھی نے جھانک کر آواز لگائی۔

"رخشی! ذرا اوپر آنا۔"

"یا اللہ! خیر....." رخشہ نے تھکی تھکی نظر سے ریلنگ کی طرف دیکھا تھا۔ بھابھی صاحب اوپر آنے کا

حکم سنا کر واپس جا چکی تھیں۔ وہ اندر جانے کے بجائے بیرونی سیڑھیوں کی طرف آ گئی تھی۔ وہ گول زینہ عبور کرکے ٹھنڈے ٹھار لاؤنج میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہی بھابھی عروبہ کو کندھے سے لگا کے تھپک رہی تھیں۔

"کبھی اوپر کا چکر بھی لگا لیا کرو۔ یہ بھی تمہارے بھائی کا گھر ہے۔" ناعمہ اسے دیکھتے ساتھ ہی شکوے شکایات کے اوراق پلٹنے لگی تھیں۔

"بس بھابھی وقت ہی نہیں ملتا۔" وہ بھلا اس کے علاوہ کہتی بھی کیا۔

"بیٹھ جاؤ' کچھ دیر ہمارے پاس بھی۔"

"بھابھی! ابھی کپڑے بھی پریس کرنے ہیں۔" رخشندہ کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"لائبہ سے کہا کرو۔ اس طرح کے کام وہ کر لیا کرے۔ تم کچن بھی تو سنبھالتی ہو۔ بھابھی تو کب سے جان چھڑا چکی ہیں ہر کام سے۔" ناعمہ نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

"آپ کو کچھ کام تھا؟"

"وہ دراصل تمہارے بھائی کے کچھ کپڑے رکھے تھے۔ استری کر سکتی ہو تو کر دینا۔ عروبہ نے مجھے صبح سے اپنے ساتھ باندھے رکھا ہے۔ اب لائٹ آئی ہے مگر مجھے ابھی ہانڈی بھی چڑھانا ہے۔"

"کر دیتی ہوں۔" اس نے گہری طویل سانس کھینچ کر کہا۔ "ویسے کتنے سوٹ ہیں؟"

"صرف تین۔" وہ خوشی خوشی اٹھ کر کپڑے نکال لائیں۔ رخشندہ نے استری لگا کر ابھی کپڑے پریس کرنا شروع کیے ہی تھے جب بھابھی دو تین اپنے بھی سوٹ نکال لائیں۔

"رخشندہ! انہیں بھی بس ہلکا ہلکا پریس کر دو۔ زیادہ جما کر پریس کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے بھابھی!" وہ چپ چاپ سر جھکائے کپڑے استری کرتی رہی تھی۔ اس دوران بھابھی کچن میں چلی گئیں۔ شاید کھانا بنانے لگی تھیں۔ کپڑے پریس ہو چکے تو وہ تھکی ہاری نیچے لوٹ آئی۔

بھابھی بھی کچن سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اب ٹرے اٹھائے لاؤنج میں آ رہی تھیں جب اسے جاتے دیکھا تو چونک اٹھیں۔

"کھانا تو کھا لو رخشی!" انہوں نے زور کی ہانک لگائی تھی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ منع کر دے مگر پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی۔

"کیا پکایا ہے؟"

"چکن اور چٹنی۔" وہ فریج سے ٹھنڈی بوتل پانی کی بھی نکال لائیں۔ رخشندہ نے سر ہلا کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ ایک بات تو ٹھیک تھی کہ ناعمہ بھابھی کے ہاتھ میں ذائقہ کمال کا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ٹھنڈی ٹھار سپرائیٹ پی اور اللہ کا شکر ادا کرتی نیچے چلی آئی۔

جوں ہی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو گویا بھونچال آ گیا۔ بلکہ بھونچال تو پہلے سے ہی آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے' رخشندہ اتنی دیر سے غائب تھی اور بھابھی کو آج کچن میں جھانکنا پڑ گیا تھا۔ انہیں تو مسالہ جات ملنا بھی جان جوکھوں کا کام لگ رہا تھا۔ پورے گھنٹے میں تو دال' چاول کے کنکر چنے گئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل کچن میں کھڑے ہونا پڑا تھا۔ بھابھی کا مزاج برہم تھا ہی صاحبزادی کے تیور بھی خاصے خطرناک لگ رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا محترمہ بھی خاصی دیر کچن میں موجود رہی ہیں۔ یقیناً" بھابھی نے ان سے کچھ کام وغیرہ کروایا تھا۔

"اوپر والوں کی خدمت گزاری کرکے تشریف لے آئی ہیں۔" لائبہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر فوراً" اٹھ بیٹھی۔

"ہم تو خدمت کے لیے ہی تشریف لائے ہیں۔ آپ بیٹھی رہا کریں۔" رخشندہ نے بھی ادھار رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ویسے بھی شکم سیر تھا۔ طبیعت بحال تھی سو جوابی گولہ باری کے لیے وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔

"چاچی نے کیا کچھ خاطر داری کی ہے؟" لائبہ کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔

"تم خود ہی پوچھ آؤ۔"

"آپ ہی بتا دیں..... ذرا ہم بھی تو جانیں اوپر کون سی دعوت شیراز تیار ہوئی ہے کچھ دیر پہلے۔" لائبہ نے طنزیہ مسکان لبوں پر سجائے سجائے کہا۔

"دعوت شیراز کا آپ کے نزدیک نجانے کیا مفہوم ہے۔ ہم تو پیار بھرے اصرار اور عزت کی روٹی کو پرتکلف ڈنر سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں۔" رخشندہ نے اس کے طنز کو چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔

"ہائے' اس انکساری پر کون نہ مر جائے؟ اسی سادگی نے ہی تو لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔" لائبہ نے پھر سے طنزیہ انداز اپنایا۔

"ہم نے تو آج تک کسی کو اپنا گرویدہ نہیں دیکھا۔ بھلا اس سے بڑا مذاق کیا ہو گا۔" رخشندہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اسی پل غنی کمرے سے نکل آیا تھا۔

"دونوں محترمائیں کس بات پر بحث و مباحثے میں مصروف ہیں؟"

"لو ایک گرویدہ تو سامنے ہی ہیں۔" لائبہ نے مذاق اڑایا۔

"کون کس کا گرویدہ ہے؟" غنی نے پوچھا۔

"تم گرویدہ ہو' رخشندہ کے۔" لائبہ اطمینان سے بولی۔

"کیا بکواس ہے یہ۔" رخشندہ نے دانت پیس کر لائبہ کو گھورا تھا۔ جو مسلسل مسکراتے ہوئے پیر جھلا رہی تھی۔

غنی کی کوئی فون کال آ گئی تھی اور وہ اٹھ کر فون سننے چلا گیا تھا۔ غنی کے اٹھتے ہی اس نے منہ پھٹ سی لائبہ کو بری طرح سے گھورنا شروع کیا۔

"کون سی بکواس؟"

لائبہ کا موڈ بے انتہا خوشگوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ جلی بھنی بیٹھی تھی مگر اس وقت گویا مسکراہٹ اس کے لبوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اور وہ چپکے چپکے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر بھی انگلیاں چلا رہی تھی۔ یعنی خوشگوار موڈ کا اور ہونٹوں کی شگفتہ شگفتہ مسکان کا تعلق موبائل فون سے تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب لائبہ کچھ نہیں سنے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

لائبہ کا ان دنوں تمام وقت موبائل فون کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ہر وقت آنکھیں سیل کی اسکرین کے ساتھ چپکی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ اسے غنی کے ساتھ لڑنا جھگڑنا بھی بھول گیا تھا۔ غنی ویسے بھی ان دنوں اپنے کسی دوست کی شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے مظفر گڑھ گیا ہوا تھا۔ سو فی الحال رخشندہ بھی فری تھی۔ ورنہ تو سارا دن کچن کی نذر ہی ہو جاتا تھا۔

ان دنوں اسے ایک پرائیویٹ اسکول سے جاب کی آفر بھی آئی ہوئی تھی۔ اور یہ مسئلہ عقیل بھیا کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ حسب معمول بھیا نے اس کیس پر غور کیے بغیر جھٹ سے انکار کر دیا تھا اور رخشندہ ہمیشہ کی طرح دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ بھابھی نے بھی دبے دبے لفظوں میں اس کی جاب کے بارے میں حمایت کرنا چاہی تھی مگر وہ بھیا ہی کیا جو مان جاتے۔

گھر کے کام کاج نجانے کیوں مختصر ہوتے چلے گئے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ لائبہ بھی اب کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی۔ اسے کھانے پینے کا بھلا ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔ ہر وقت تو انگلیاں موبائل کے بٹن پر چلتی رہتی تھیں۔ بھابھی زیادہ تر بیرونی دوروں پر نکلی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ پھر سے ان کے سر پر رخشندہ کی شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ نوراں آپا کے ساتھ نجانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر آتی تھیں۔

پھر ایک دن نوراں آپا مٹھی بھر چینی نجانے کس بابے سے دم کروا کر لے آئی تھیں۔ بھابھی نے خوشی خوشی چینی کے ننھے سے شاپر کو مٹھی میں دبوچا۔

"یہ غنی کے لیے ہے نا۔" وہ دبی آواز میں نوراں آپا سے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں' رخشی کے لیے۔ جلد از جلد اس کی کہیں بات بن جائے۔ تمہارے سر کی بلا ٹل جائے۔ جانے

http://www.paktunplace.com

میں گھول کر پلا دینا۔"

"اور غنی کے لیے نہیں لائیں؟" نوشابہ نے بے قراری سے پوچھا۔

"لائی ہوں۔ یہ نمک ہے۔ سالن پر چھڑک دینا۔ ان شاء اللہ اس کا دھیان لائبہ میں ہی اٹکا رہے گا۔"

نوراں آپا نے ایک اور پڑیا بھابھی کی طرف بڑھا دی تھی۔ رخشندہ جالی دار دروازے سے سارا منظر دیکھ چکی تھی۔ اس کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا۔ بھلا بھابھی کن چکروں میں پڑ رہی تھیں۔ یہ جادو ٹونے، عمل ___ بھلا ان چیزوں سے کیا ہو سکتا تھا جب تک اللہ کی طرف سے راستے کشادہ اور دل نرم نہ ہو جاتے۔ اس چینی کو رخشندہ کے لیے منگوا کر وہ اس کے لیے اچھے رشتے کی امید باندھ رہی تھیں اور غنی کے دل کو لائبہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں نجانے کیوں بھٹکنے لگی تھیں۔

اگر لائبہ کے نصیب میں غنی کا ساتھ لکھا جا چکا تھا تو پھر اس نصیب کے لکھے کو بھلا کوئی مٹا سکتا تھا۔ یا رد و بدل کر سکتا تھا۔

رخشندہ کا ذہن بری طرح سے الجھ کر رہ گیا تھا۔

نوراں آپا آج پھر آئی ہوئی تھیں اور کچھ ہی دیر بعد بھابھی بھی ان کے ساتھ کہیں چلی گئیں۔ رخشندہ کو قوی امید تھی کہ پھر کسی بابے کے آستانے پر گئی ہوں گی۔ دراصل بھابھی کا پہلے بھی ان بابوں پر خاصا اعتقاد رہا تھا۔ لائبہ کی دفعہ بھی وہ نجانے کہاں کہاں سے تعویذ لیتی رہی تھیں۔ تاہم یہ کام بھیا سے چوری چھپے کیے جاتے تھے۔ بھابھی کے چلے جانے کے بعد وہ لائبہ کے کمرے میں آ گئی تھی۔ لائبہ حسب معمول فون پر مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے مزید دس منٹ بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

"آئیے جناب!" لائبہ کا موڈ بے حد شگفتہ تھا۔ اس نے جلنا کڑھنا ترک کر دیا تھا۔ آج کل تو وہ خوب چہک بھی رہی تھی۔

"کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"غنی سے۔"

"کب آئے گا؟"

"کیوں بھئی انتظار ہو رہا ہے؟" لائبہ شرارت سے چہکی۔

"ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ ابھی دو چار دن نہ ہی آئے تو بہتر ہے۔ میری تو پریڈ کروا کر رکھ دیتا ہے۔"

ان دنوں تو لائبہ نے سفارتی تعلقات بھی اس کے ساتھ بحال کر لیے تھے۔ کافی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔ ورنہ تو پچھلے چند سالوں سے وہ ضرورت کے تحت اس سے بات کرتی تھی۔ اپنی ہی دنیا میں مصروف رہتی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا۔" لائبہ بغیر برا مانے کھلکھلائی۔

اس کی بات بے بات کی کھلکھلاہٹوں نے رخشندہ کو چونکا تو دیا تھا اور وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کے خوشگوار موڈ کی ہر کڑی غنی کی طرف سے کسی "اقرار" سے جا ملتی تھی۔ اور یہ بات بھی چند دن بعد کھل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن صبح صبح لائبہ اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ شاید بہت سالوں بعد لائبہ نے اس کے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ ورنہ تو دروازے میں ہی کھڑے کھڑے سوال، جواب کرنے لگتی تھی۔ وہ اپنا [illegible] سمیٹ رہی تھی جب لائبہ دھپ دھپ کرتی آئی۔

"خیریت۔۔۔" وہ کھیس تہہ کر رہی تھی۔

"مجھے ثانیہ کے گھر جانا ہے۔ [illegible] ساتھ چلیں گی؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں التجا کر رہی تھی۔

"مگر کیوں؟ [illegible] ثانیہ کے گھر نہیں لے کر گئیں؟" اس کا [illegible] فطری تھا۔

"آج کچھ خاص بات ہے۔" وہ مسکرائی۔

"[illegible] پوچھا ہے؟"

"[illegible] پوچھ لیا ہے۔" وہ مطمئن تھی۔

"ٹھیک ہے۔" رخشندہ نے سر ہلا دیا۔

سر حفیظ کے پرائیویٹ اسکول کے سامنے پارک بنا ہوا تھا۔ یہ اسکول ان کے گھر سے کچھ ہی دور تھا۔ وہ ثانیہ کے گھر کے بجائے اسی پارک میں چلی آئی تھیں۔ سو راستہ بھر لائبہ سے پوچھتی رہی۔

"یہاں کیوں آ گئی ہو؟"

"صبر تو کرو۔" وہ موبائل پر مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد اس سے مخاطب ہوئی۔

"وہ آ رہا ہے۔"

"بھلا کون؟" خوف کے مارے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جبکہ لائبہ کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

"طلاب۔" اس کے گالوں پر گلاب کھل اٹھے تھے۔

"ہائے یہ کون ہے؟" وہ چیخ پڑی۔

"ثانیہ کا کزن ہے۔ [illegible] کیسا ہے۔" لائبہ کی آنکھوں میں بھی [illegible] ہوئی تھی۔

"اچھا تو [illegible] ہے۔" وہ گویا سب سمجھ گئی تھی۔ "ہائے [illegible] غنی کا کیا ہو گا۔" کچھ دیر بعد اسے یتیم و یسیر غنی کا خیال آیا تو بول اٹھی۔

"بے چارا یتیم یسیر غنی۔" اسے بے انتہا دکھ ہو رہا تھا۔ [illegible] بھابھی کے غنی اور لائبہ کے حوالے سے دیکھے گئے سپنے بھی ٹوٹنے کے قریب تھے۔

"بے چارا ابھی یتیم ہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "غنی کی مجھے فکر نہیں۔ اس کے لیے تم جو ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ خاک بھی نہیں سمجھی تھی۔ اسی پل طلاب بھی آ گیا تھا۔ اور گفتگو کا موضوع خود بخود بدل گیا۔ طلاب ان ہی کا ہم عمر تھا۔ مگر بلا کا معصوم اور شرمیلا۔ سچی بات تو یہ تھی۔ رخشندہ کو یہ سلجھا ہوا، تمیزدار، شریف لڑکا بہت پسند آیا تھا۔ بہت اچھی جاب سے بھی منسلک تھا۔ اپنا ذاتی گھر اور تنہائی کے علاوہ اس کا پاس کچھ نہیں تھا اور جو سب سے اہم بات تھی۔ وہ طلاب کی لائبہ کے لیے محبت تھی۔ وہ سچ مچ طلاب تھا یعنی لائبہ کی خواہش کرنے والا، امنگ اور آرزو کرنے والا۔

"تم اپنے کسی بڑے کو ہمارے گھر بھیجو۔"

"ثانیہ کی امی آئیں گی۔ وہ میری امی کی کزن ہیں۔ میں انہیں اپنی ماں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔"

اس نے نظر جھکائے جھکائے جواب دیا تھا۔ وہ صرف دس منٹ کے لیے آیا تھا اور پھر چلا بھی گیا۔ مگر یہ دس منٹ ان پر اس وقت قیامت بن کر ٹوٹے تھے جب ان کے سر پر اچانک بھیا پہنچ گئے۔ رخشندہ کے تو گویا حواس اڑ گئے تھے۔ انہوں نے اگرچہ طلاب کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر ایک نوجوان مرد کو پلٹتے ہوئے ان کے قریب کھڑا وہ دیکھ چکے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے گھر سے دور ایک سنسان پارک میں موجود تھیں۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ بھیا اپنے کسی دوست کی عیادت کرنے یہاں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

"بابا!" بھیا کے خونخوار تیور دیکھ کر لائبہ کی روح بھی فنا ہو گئی تھی۔ بھیا نے دو تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟" وہ پھنکار کر بولے۔

"بھیا! میں اسے لائی تھی۔" رخشندہ کے منہ سے اچانک نکلا۔ بالکل "غیر ارادتاً"۔ وہ بولنا کچھ اور چاہتی تھی اور منہ سے کچھ اور نکل گیا تھا اور جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے بالکل اسی طرح اس کے منہ سے یہ چند الفاظ نکل گئے تھے۔ یکایک بھیا کی آنکھوں نے پھر سے رنگ بدل لیا تھا اور رخشندہ کی زبان بھی گویا ایک معمول کی طرح خود بخود چلنے لگی۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ لائبہ اسے طلاب سے ملوائے گی تو وہ بہت طریقوں سے اسے سمجھاتی۔

"بھیا! یہ سر حفیظ کے اسکول میں جاب کرتا ہے۔ وہ ہی اسکول جہاں میں نے اپنی سی وی بھجوائی تھی۔ میری سی وی گرلز کیمپس کے مین آفس میں تھی جبکہ ہم لوگ غلطی سے ادھر آ گئے ہیں۔ میں اس سے اسی بارے میں پوچھ رہی تھی۔" اس کی زبان نے سلیقے سے ایک جواز تراش لیا تھا۔ وہ لائبہ کے لیے ڈھال بن گئی تھی اور یہ سب "غیر ارادتاً" ہوا تھا۔ ادھر لائبہ فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھے جا رہی تھی۔

بھیا کے تاثرات نارمل ہو گئے تھے۔ یعنی انہیں اس کے بیان پر یقین آ گیا تھا۔ وہ قیامت کے ٹل

http://www.pakfunplace.com

جانے پر شکر ادا کر رہی تھی اور ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ لائبہ کو سمجھانے کی کوشش کرے گی۔

اپنے بزرگوں کی عزت کا کانچ پارکوں اور بازاروں میں نہیں رولتے۔

محبت کرنا غلط نہیں ہوتا۔ اس کے حصول کے لیے غلط راہوں کا انتخاب غلط ہوتا ہے اور وہ سوچ رہی تھی کہ طلاب سے کہے گی۔ سیدھے اور صاف طریقے سے اپنا پرپوزل بھجوائے۔ مگر اس سے بھی پہلے ایک اور واقعہ رونما ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ غنی کے واپس چلے جانے کے بعد کی بات ہے۔ اسے وہ واقعہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ حادثہ تھا۔

وہ اور لائبہ گھر آ چکی تھیں۔ بھیا نے مزید کوئی باز پرس بھی نہیں کی تھی۔ یعنی انہیں رخشہ کی ہر بات کا یقین تھا۔ جہاں اسے اپنے بھائی کے اعتماد اور یقین پر بے تحاشا خوشی ہوئی تھی۔ وہیں اس کے مان اور اعتبار کی دھجیاں بکھر گئی تھیں اور رشتوں سے اس کا ایمان ہی اٹھ گیا تھا۔

اس رات وہ معمول کے مطابق نماز عشاء پڑھ کر لیٹی ہی تھی، جب چپکے سے دروازہ کھول کر لائبہ چلی آئی۔ اسے خبر تو تب ہوئی تھی۔ جب اس نے لائبہ کے بری طرح سے سسکنے کی آواز سنی تھی۔ وہ ایک دم بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور ہاتھ بڑھا کر اس نے سوئچ بورڈ کے بٹن اوپر، نیچے کیے تھے۔ کمرے میں روشنی ہوئی تو لائبہ کا اداس، ویران اور بھیگا چہرہ اس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اس کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔

"لائبہ! کیا ہوا ہے؟ بھیا نے کچھ کہہ دیا؟" اس کا دل بری طرح سے خوف کے حصار میں جکڑ گیا تھا۔

"بتاؤ تو سہی۔" لائبہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور اس کے آنسو رخشہ کو حواس باختہ کر گئے تھے۔

"لائبہ! کیا ہوا ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ۔" اس کے آنسو اسی روانی سے گرتے جا رہے تھے۔ رخشہ نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

"لائبہ! یہ کیا پاگل پن ہے۔" وہ چیخی تھی۔ مگر لائبہ ہنوز سر جھکائے رونے کے شغل میں مصروف رہی۔

"کچھ بتاؤ گی یا پھر بھابھی سے پوچھوں؟"

"کیا پوچھیں گی ان سے؟" وہ روتے ہوئے گویا پھٹ پڑی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے نرمی سے لائبہ کے آنسو صاف کرنا چاہے تھے۔ کس شدت سے وہ روئے جا رہی تھی اور یہ بھابھی نجانے کہاں تھیں۔ بھلا آج تک لائبہ کی آنکھ میں ایسے آنسو اترے تھے؟ اسے تو کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ کبھی کسی نے جھڑکا تک نہیں تھا۔

"یہ ندامت کے آنسو ہیں رخشی!" وہ پھر سے زار و قطار رونے لگی تھی۔

"اچھا ہوا ـــ تمہیں بھی احساس ہو گیا۔ دیکھو، آج تو بھیا کو ٹال دیا ہے مگر آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے ـــ یہ طریقہ غلط ہے۔ تم طلاب کو کہو ـــ" ابھی وہ کچھ اور بھی بولنا چاہ رہی تھی جب لائبہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں بتاتی ہوں۔ کیوں رو رہی ہوں؟" اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کچھ بتاؤ گی تو خبر ہو گی نا۔"

"پہلے مجھ سے وعدہ کرو، مجھے معاف کر دو گی۔" وہ رخشہ کے دونوں ہاتھ تھامے التجا کر رہی تھی۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" وہ زچ ہو گئی تھی۔ دراصل اس کی چھٹی حس نے بھی اسے کچھ انہونا، کچھ غیر معمولی پن کا احساس دلا دیا تھا۔

"میں نے جان بوجھ کر تمہیں طلاب سے ملوانے لے گئی تھی۔ اور پاپا کو بھی جان بوجھ کر ماما نے ادھر بھیجا تھا۔ میں بہت بری ہوں رخشی! میں نے طلاب کی محبت کو بھی استعمال کرنا چاہا تھا اور تمہیں بھی۔ سب کی نہیں، صرف غنی کی نظر میں گرانے کے لیے یہ سب کیا۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ماما نے مجھے

مجبور کر دیا تھا۔ ماما جانتی ہیں کہ میں طلاب میں انٹرسٹڈ ہوں۔ مگر ماما کا خیال ہے کہ طلاب، غنی کی طرح اسٹیبلش نہیں ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میری شادی غنی سے ہو۔ حالانکہ طلاب مجھ سے بہت مخلص ہے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے مگر میں نجانے کیوں ماما کی باتوں میں آ گئی تھی۔

دراصل بات یہ ہے، غنی نے جانے سے پہلے اپنا پرپوزل تمہارے لیے پاپا کے سامنے پیش کیا تھا۔ تب سے ہی ماما کو بہت غصہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تمہاری شادی غنی سے ہو۔

اور جب پاپا کے سامنے تم نے ساری بات خود پر لے لی تو مجھے اپنی گھٹیا حرکت اور ماما کی گھٹیا سوچ سے گھن آنے لگی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میری ڈھال بن جاؤ گی۔ حالانکہ تمام پلاننگ کرنے کے باوجود پاپا کو دیکھ کر میرے خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بھیا کو کیا کہنا ہے ـــ ماما کی سمجھائی گئی ساری بات نہ جانے کب کہاں گئے اور کس طرح میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اس خود غرضی، تنگ دلی اور گھٹیا پن، کمینگی کے لیے مجھے معاف کر دیں۔

طلاب بے چارے کو تو کچھ خبر نہیں۔ وہ میرے کہنے پر تم سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میں نے اسے اپنی پھوپھو سے ملوانا ہے۔

ماما نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہ بتاؤں مگر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں زیادہ دیر سچائی کو تم سے چھپا نہیں پائی۔"

وہ سسکتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی جبکہ رخشہ کا وجود گویا ساکت ہو گیا تھا۔ اسے بھابھی سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔ اپنی بیٹی کو اچھی زندگی دینے کے لیے وہ اس کی ذات کو اس بری طرح سے استعمال کریں گی۔ یہ تو رخشہ نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ نجانے خود غرضی کی کتنی شکلیں تھیں، کتنی صورتیں تھیں، کتنے چہرے تھے۔ ہر دفعہ چہرہ بدل بدل کر خود غرضی اپنی، بھیانک صورت دکھائی تھی۔ اس کا دل دکھ کے احساس تلے دب کر رہ گیا تھا مگر بند ہونٹوں سے ذرہ بھر شکوہ نہیں نکلا۔ وہ بھلا لائبہ سے کیا کہتی۔ جو پہلے ہی اپنے کیے پر بے حد نادم اور پشیمان تھی۔

دکھ اور صدمات کے بے شمار گھاؤ لیے وہ بھابھی کی طرف سے دیے جانے والے اس زخم کو بھی دل کے نہاں خانوں میں چھپا گئی تھی۔ اگر یہ بات بھابھی اور لائبہ کے درمیان تھی تو پھر بھلا وہ کیوں دوسری بھابھیوں کو بتا کر اپنی تشہیر کرواتی۔

فی الحال بھابھی خاموش تھیں اور یہ خاموشی صرف ایک ہفتے تک محدود رہی تھی۔ نوراں آپا اس کے لیے حیام واثق کا پرپوزل لائی تھیں۔ جو نوشابہ بھابھی کے گویا دل کو لگ گیا تھا۔ انہوں نے خاندان، برادری بھی نہیں دیکھی تھی اور اس کا رشتہ طے کر دیا۔ دراصل وہ غنی کے آنے سے پہلے پہلے رخشہ کو ٹھکانے لگا دینا چاہتی تھیں۔ سو انہوں نے جھٹ پٹ اسے رخصت کر دیا تھا اور غنی کو مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے بہت سے جواز بھی ڈھونڈ لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

شہری حدود کے اختتام اور گاؤں کی شروعات پر یہ قدیم طرز پر بنا حویلی نما بنگلہ دور سے ہی پراسرار دکھتا تھا۔ آبادی سے بہت دور خاندانی زمینوں پر اس کی تعمیر آج سے کم از کم اسی، پچاسی سال یا اس سے بھی پہلے کی گئی تھی۔ اس بنگلے تک آنے والی سڑک گھنے درختوں کے جھنڈ میں تقریباً" چھپی ہوئی تھی۔ دور سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ درختوں کے اس جنگل کے درمیان ـــ کوئی راستہ بھی موجود ہے۔

گاؤں کی طرف جانے والا راستہ اور تھا مگر عموماً" راہگیر اسی راستے کو استعمال کرتے تھے۔ اس طرف تو اکا دکا لوگوں کا آنا جانا تھا۔

اس بنگلے کے قریب سے توہم پرست افراد تو گزرتے بھی نہیں تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اس عمارت پر بھوتوں کا سایہ ہے۔

اور بہت دن گزر جانے کے بعد تو رخشہ کو گویا ان

http://www.pakfunplace.com

توہم پرست لوگوں کی باتوں کا یقین ہونے لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ اس گھر کے تینوں مکین انسانی شکل میں بھوت ہی تھے۔

اس گھر میں آمد کی پہلی رات کے بعد ایسے ایسے واقعات پیش آنے لگے تھے کہ رخشہ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ جاتی تھی اور وجود اس طرح سے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا گویا کسی نے اس پر جگ بھر کے پانی کا چھینٹا دیا ہو۔

پہلی رات کی وہ طلوع ہونے والی سحر بھی عجیب ترین تھی۔ اپنی پچھلی زندگی کو سوچتے سوچتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی تھی کہ صرف دس منٹ کی اس نے نیند لی ہوگی، جب اپنے بازوؤں اور چہرے پر اس نے انسانی انگلیوں کا لمس محسوس کیا تھا اور اس کی آنکھ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گئی تھی۔ فطری طور پر اچانک ایک خوف نے اس کے دل پر پنجہ مارا تھا۔ مگر اپنے اوپر جھکی اسی عورت کو دیکھ کر وہ سنبھلتے ہوئے اٹھ گئی۔ مگر اس عورت کے حسن نے گویا اس کے ذہن کو منجمد کر دیا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنے قریب سے کسی خوب صورت اور دل میں اتر جانے والے چہرے کو نہیں دیکھا تھا مگر اس عورت کے دلکش نقوش نے گویا اس کے دل پر ہیبت طاری کر دی تھی۔

ہوتا ہے نا، کسی بھی بہت بد صورت اور کریہہ چہرنیا چہرے کو دیکھ کر ایک دم دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے رخشہ کا دل بھی اس حسین عورت کی پراسرار مسکراہٹ اور چہرے کو دیکھ کر دہشت زدہ سا رہ گیا تھا۔ پہلے دن ہی اس عورت کے رعب حسن نے رخشہ کی زبان کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر اس عورت کی سحر طراز آنکھوں میں چمکتے پانیوں کی اداسی نے اس سے لفظ چھین لیے تھے۔

"بہت ہلکی نیند ہے تمہاری۔ [illegible] ٹوٹ گئی۔" بہت دیر بعد اس نے [illegible] تو صرف اتنا۔ کافی دیر پھر سے کمرے کی فضا پر بوجھل خاموشی چھائی رہی تھی۔ اس دوران اس عورت کی خود پر جمی نگاہیں وہ صاف محسوس کر رہی تھی۔ مگر دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھنا رخشہ کے لیے محال تھا۔

"رات کو سو گئی تھیں کیا؟ دودھ بھی نہیں پیا۔۔۔ اگر دودھ پی لیتیں تو میٹھی بہت میٹھی اور پرسکون نیند نے تمہیں اپنے حصار میں لے لینا تھا۔ میں نے یہ دودھ اسی لیے تو بھجوایا تھا۔" وہ شاید پھر سے مسکرائی تھی۔ نم نم سی مسکراہٹ۔ سرخ، رسیلے چیری جیسے ہونٹوں پر اپنا لمس چھوڑ گئی تھی۔

"مگر تم نے تو یہ دودھ پیا ہی نہیں۔ پھر نیند کہاں سے آنی تھی۔ جاگتی رہی ہو نا؟" اب وہ اس کی سرخ آنکھوں میں جھانک کر وثوق سے کہہ رہی تھی۔

"تمہاری مرضی۔۔۔ نہ پیو، مگر ایک دن تمہیں یہ دودھ پینا ہی پڑے گا۔ بھلا کب تک جاگو گی؟ ایک نہ ایک دن خود ہی نیند کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دودھ تک آجاؤ گی۔" اس نے سفید دودھ جیسی انگلیوں سے گلاس کے پیندے کو چھوا۔

"اس میں سرور ہے سرور۔" وہ آنکھ بھر کے [illegible] سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اور اس کی نظروں [illegible] رخشہ کو پھر سے الجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔

"یہ پی لو۔۔۔ دودھ نہیں، آب حیات ہے۔" وہ گویا اصرار کر رہی تھی۔ شاباش [illegible] ہے۔"

"مجھے نہیں پینا [illegible] ہے۔" سچ تو یہ ہے۔ دودھ کی اس [illegible] آگئی تھی۔

"کیا کہا؟ [illegible]۔" وہ گلاس پکڑے پکڑے چونک [illegible] اس کے لبوں پر پھر سے مسکراہٹ [illegible]

"[illegible] ہی رات میں جی متلانے لگا؟" اس کے لفظوں میں بلا کی معنی خیزی تھی۔

"جاگتی رہی ہوں۔ اسی لیے سر بھاری ہے۔" وہ اس کے لفظوں اور لہجے کی معنویت کا اثر زائل کرنے کی غرض سے بولی۔

"کیوں جاگی ہو؟ جبکہ حیام تو آیا بھی نہیں۔ سوئی

رہتیں، سونے میں ہی عافیت ہے۔ بندہ کتنے عذابوں سے بچ جاتا ہے۔" اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"تم کون ہو؟" بہت دیر بعد رخشنہ کو تعارف حاصل کرنے کا خیال آیا تھا۔ دراصل اس کے لہجے میں کچھ سحر ہی ایسا تھا کہ رخشنہ کے ذہن میں اترے سارے خیال کسی بہت پیچھے کے خانے میں چپ چاپ سو گئے تھے۔

"میں لالہ رخسار ہوں۔"

"پر رات کی لالہ سے بہت مختلف لگ رہی ہو۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی تھی۔ دراصل اس کا ذہن منقش جھولے پر مگن سی بیٹھی لالہ کو سوچنے لگا تھا۔

"اس وقت وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی۔ لمبا سا کھلا ڈھلا چغہ نما قمیص اور بڑا سا خیمہ نما دوپٹہ جس نے اس کے سر، بالوں کے علاوہ ماتھے تک کو چھپا رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا انتہائی سرخ و سفید چہرہ جگمگا رہا تھا۔

رات کو اس نے بال کھول رکھے تھے اور جو کپڑے اس نے پہن رکھے تھے۔ وہ بھی آج کل کے فیشن کے مطابق سلوائے گئے تھے۔ اور یوں لگتا تھا کہ اس نے میک اپ بھی کر رکھا ہے۔ مگر اس وقت جھکی جھکی پلکوں والی آنکھوں میں کجلے کی دھار بھی نہیں تھی۔ کلائیاں بھی سونی تھیں۔

رات کو وہ ایک بھرپور جوان عورت کے روپ میں دکھائی دی تھی۔ مگر اس وقت ایسی بند اور پراسرار کتاب تھی جس کا عنوان تک نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔

اس سے اگلی صبح رخشنہ کی اپنے شریک سفر سے ملاقات ہوئی تھی۔ بالکل روایتی سی ملاقات تھی۔ تقریباً" فجر کے قریب وہ اس کے کمرے میں آیا تھا گویا وہ اپنا ایک فرض ادا کرنے کمرے میں آیا تھا۔

وہ ایک گھنٹے تک کمرے میں رہا تھا۔ اس دوران اس نے رخشنہ سے بس گنی چنی باتیں کی تھیں۔ حالانکہ رخشنہ کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھر رہے تھے مگر حیام کے لیے دیے رویے کی وجہ سے وہ اس سے کچھ بھی پوچھ نہیں پائی تھی۔

حق اور فرض کی ادائیگی کے بعد اسے کوئی اور بات کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ حالانکہ رخشنہ اس کے منہ سے ایک لفظ معذرت سننے کے لیے منتظر بیٹھی تھی۔ جبکہ وہ جب تک بیڈ روم میں رہا تھا۔ بس منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھا رہا اور پھر ذرا سورج نے جھلک دکھائی تو وہ اپنے کپڑے اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہی کمرا جو شادی سے پہلے اس کی قیام گاہ تھا۔ رخشنہ نے کمرے کی کھڑکی میں سے اسے اسی کمرے میں جاتا دیکھا تھا۔ وہ حیام کے ہی نہیں، توقیر بیگم اور لالہ کے رویے پر بھی بری طرح سے الجھ رہی تھی۔

توقیر بیگم نے ناشتے سے کچھ پہلے رخشنہ کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ یہ کمرا بے حد سادگی سے آراستہ تھا۔ کمرے میں ایک پلنگ تھا۔ تین موڑھے تھے اور اس کے علاوہ عبادت کا سامان تھا۔ تین چار جائے نماز، تسبیح، وظائف کی کتابیں۔ اور ریک اور کھجور کی رنگ برنگی گٹھلیاں۔ یقیناً" گٹھلیوں کو خشک کر کے ان پر رنگ چڑھایا گیا تھا۔

ایک طرف ستو کی بوری رکھی تھی۔ وہ سارا دن ستو پیتی تھیں۔ ایک جار میں موٹی موٹی خوشبودار اور انتہائی عمدہ کھجوریں بھی رکھی تھیں۔

توقیر بیگم دن رات عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ کبھی اشراق پڑھ رہی ہیں۔ کبھی چاشت کے نوافل ادا کر رہی ہیں۔ کبھی ... نماز کا وقت ہو جاتا تھا۔ پھر تسبیحات ... کے بعد ظہر، پھر تلاوت قرآن کریم ... عصر، مغرب، عشاء اور اس کے بعد رات ... عبادات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ انہیں دنیا اور دنیاداری سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ ان کے دن رات صرف عبادت کے گرد گھومتے تھے۔

توقیر بیگم، حیام کی سگی پھوپھی تھیں اور شادی کے بعد بھی اسی گھر میں مقیم تھیں۔ حیام کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔

ایک زمانے میں حیام کے والد کی بے شمار زمینیں

ہوا کرتی تھیں۔ مگر عیش و عشرت میں اور کچھ سیاحت کے شوق میں انہوں نے اپنے حصے کی ساری جائیداد بیچ باچ دی تھی۔ اب جو کچھ حیام کے پاس تھا۔ سب توقیر بیگم کے حصے کا تھا۔ یہ بنگلہ بھی حیام کے دادا نے بنوایا تھا اور اپنی اکلوتی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔

حیام کی پرورش توقیر بیگم نے ہی کی تھی۔ ان کی بیٹی لالہ رخسار، حیام سے چار سال بڑی تھی۔ مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ اتنی حسین و جمیل بیٹی کے باوجود اپنے لاڈلے بھتیجے کے لیے باہر سے دلہن کیوں لائی تھیں؟

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اماں جی یعنی توقیر بیگم کسی وظیفے میں مشغول تھیں۔ ان کے بارے میں اس گھر کی واحد ملازمہ صدیقہ سے پتا چلا تھا کہ اوائل عمری سے ہی اماں جی نے اللہ سے لو لگا لی تھی۔ اور ان کا بیشتر وقت عبادت الٰہی میں گزرنے لگا تھا۔ رخشنہ بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ مگر اماں جی کا وظیفہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ حد درجہ اکتا گئی تھی۔ اور ان کے کمرے میں چھائی خاموشی اور عجیب سے سناٹے نے رخشنہ کو خاصا بے چین کر دیا تھا۔ پھر توقیر بیگم نے اپنا رخ اس کی طرف کیا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہی رخشنہ کا کلیجہ گویا حلق میں آ گیا تھا۔

جس قدر ان کی بیٹی حسین تھی۔ توقیر بیگم اتنی ہی بدصورت تھیں۔ بدصورت لفظ کہنا مناسب تو نہیں تھا تاہم انہیں کم صورت یا معمولی صورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ان کا پورا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ رنگت بہت سیاہ نہیں تھی مگر صاف بھی نہیں تھی۔ ہونٹ پتلے تھے مگر نچلے ہونٹ کا ایک کونا انتہائی سرخ اور پھولا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا پھوڑے کا ابھار ہو۔ تاہم غور سے دیکھنے پر وہ پھوڑا نہیں بلکہ کسی چیز کی ضرب سے پھولا اور ابھرا ہوا نشان لگتا تھا۔ شاید بچپن میں ان کے ہونٹ پر کسی چیز کی ضرب لگی تھی۔

آنکھیں بے تحاشا موٹی تھیں۔ گول گول ڈیلے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابلی ہوئی آنکھیں ہیں۔ آنکھوں کی سفیدی گدلی گدلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اوپر سے ان کے دیکھنے کا اسٹائل بھی ایسا تھا کہ رخشنہ سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی۔

"اسلام علیکم اماں جی!" اس نے خود ہی ہمت کر کے انہیں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔" انہوں نے جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے دعائیہ انداز میں سر ہلایا۔

"آپ نے بلایا تھا؟" اسے ہر طرف چھائی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی۔

"ہاں۔۔۔" انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی۔

"تمہیں یہاں پریشانی تو نہیں ہوئی؟ دل لگ گیا ہے؟"

"نہیں پریشانی کیسی؟" اسے کچھ تو بولنا ہی تھا اور بھلا وہ دل لگنے کا جواب کیا دیتی۔ جس کے ساتھ دل لگانا تھا۔ وہ صبح کا گیا رات بہت دیر سے لوٹتا تھا اور اس تک تو فجر کے بعد ہی آتا تھا اور کبھی کبھی تو آتا ہی نہیں تھا۔ ہفتے میں صرف ایک آدھ بار اسے خیال آ ہی جاتا تھا کہ ایک عورت کو وہ اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر اور اس کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے کر اپنے گھر میں لایا ہے۔

"نیا ماحول ہے۔ آہستہ آہستہ دل لگ ہی جائے گا۔ بس اس کو اپنا گھر سمجھو۔ سیاہ و سفید کی مالک ہو۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔ پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لیا کرنا۔ کپڑا، لتا سب ملے گا۔ کھانا، پینا سب کھلا پڑا ہے۔ بس خوش رہو، آباد رہو۔" انہوں نے نرمی سے کہا اور پھر تسبیح اٹھا کر اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حیام بہت کم گو واقع ہوا تھا۔ دفتر سے آ کر زمینوں پر نکل جاتا تھا۔ اور پھر اس کی واپسی گیارہ بارہ بجے تک ہوتی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ بقول صدیقہ کے اسے اپنی دفتری فائلوں کو دیکھنا ہوتا تھا۔

http://www.pakfunplace.com

اور رخشندہ کو تو حیام کے روز مرہ معاملات اور روٹین کی بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ نجانے کب وہ ناشتہ کرتا تھا اور کب وہ رات کا کھانا کھا لیتا تھا اور اس کے آنے جانے کا بھی اسے پتا نہیں چلتا تھا۔

بہت دن تک وہ خاموشی کے ساتھ اس روٹین سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مگر ایک دن جب صبح کے وقت وہ اس کے بیڈ روم میں آیا تو رخشندہ اس سے الجھ پڑی۔

"یہ کس قسم کی روٹین ہے آپ کی؟" حیام حسب سابق خاموش رہا تھا۔

"حیام! میری بات کا جواب دیں؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"میری ہمیشہ سے یہی روٹین ہے۔" اس نے بہت عجیب سے انداز میں کہا۔

"تو آپ اپنی اس روٹین کو چینج کریں۔"

"میں اپنے معمول کو نہیں بدل سکتا۔" اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"اور مجھے آپ کا رات بھر کمرے سے باہر رہنا بھی پسند نہیں۔ آپ کو اگر آفس ورک کرنا ہو تو اپنے بیڈ روم میں فائلیں لے آیا کریں۔"

"میری مرضی میں جہاں بھی بیٹھوں، سوؤں یا کام کروں۔ تم کون ہوتی ہو مجھ پر پابندی لگانے والی۔" حیام نے بے حد ناگواری سے کہا یوں کہ رخشندہ کے چہرے پر بھی ناگواری اتر آئی۔

"میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ پر پورا پورا حق رکھتی ہوں۔"

"بیوی ہو تو بیوی ہی بن کر رہو۔ مجھ پر حکم چلانے کی ضرورت نہیں۔" وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا۔

"میں حکم نہیں چلا رہی۔ درخواست پیش کر رہی ہوں۔ آپ کا رات بھر ایک دوسرے کمرے میں سونا بہت سے لوگوں کو چونکا دے گا اور میں نہیں چاہتی ہماری ازدواجی زندگی کے بارے میں کئی سوال لوگوں کے ذہن میں ابھر آئیں۔" رخشندہ نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا۔ کچھ دیر پھر سے خاموشی چھا گئی تھی۔

"یہاں پر کوئی دوسروں کی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا۔"

"مگر میں تو آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کر سکتی ہوں نا؟"

"نہیں..." حیام کا لہجہ از حد روکھا ہو گیا۔ "آج اگر تم نے بات کر ہی لی ہے تو میں بھی کچھ وضاحت کر دیتا ہوں۔ اس گھر میں اگر رہنا چاہتی ہو تو زیادہ سوالات سے پرہیز کرنا۔ جو چیز جہاں رکھی ہے۔ اسے وہیں رہنے دینا۔ اگر تبدیلیاں لانے کی کوشش کرو گی تو سراسر تمہارا اپنا نقصان ہو گا۔ اگر کچھ انوکھا یا الگ سا دیکھو تو نظرانداز کرنا۔ تجسس اور کھوج بھی تمہیں تباہی کی طرف لے جائیں گے۔" دوسرے لفظوں میں اسے خبردار کیا جا رہا تھا یا پھر دھمکایا جا رہا تھا۔ رخشندہ کی پیشانی پر ایک ناگوار سلوٹ ابھر آئی۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے گونگا، بہرہ اور اندھا بن کر رہنا ہو گا؟"

"یہی سمجھ لو... اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" اس کا انداز ہنوز خشک تھا۔ اس نے فائلیں بند کر دیں اور کمرے کی بتی بھی بجھا دی۔

☆ ☆ ☆

بہت حد تک وہ اس گھٹن زدہ روٹین سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ کمپرومائز تو بہرحال کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس گھر کے علاوہ نہ تو کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ ہی کوئی اور آسرا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کہ پیچھے جانے والے سارے راستے کھوٹے اور اجنبی ہو گئے تھے۔ جن لوگوں پر اسے کبھی مان رہا کرتا تھا وہ مان اور بھروسہ تو اسی لمحے ٹوٹ گیا تھا جب نوشابہ بھابھی نے اپنی بیٹی کو اچھی زندگی دینے کے لیے اس کی زندگی کو داؤ پر لگانا چاہا تھا۔

رخصتی سے چند گھڑی پہلے نوشابہ بھابھی نے کچھ باتیں اسے ذہن نشین کروا دی تھیں۔

"دیکھو رخشی! ہم نے تمہاری شادی کر دی ہے۔ یہاں تک ہمارا فرض تھا۔ سو ادا کر دیا۔ اب اگلے گھر میں سلیقے سے رہنا۔ اسے اپنا آخری ٹھکانہ سمجھنا۔ لڑکی کا اصل گھر شوہر کا ہی ہوتا ہے۔ وہیں اپنا مقام اور حیثیت بنانا۔ مختصر سی فیملی ہے۔ انہیں اپنا سمجھنا، وہ تمہیں اپنا بنا لیں گے مگر کچھ وقت تو بہرحال لگتا ہے۔ اپنی ادھر کی پریشانیاں ادھر مت لے کر آنا۔ اپنے بھیا کے حال پر رحم کرنا۔ اپنی بھی ہماری بچی ہے۔ اب اس کے لیے بھی کچھ سوچنا ہے۔" انہوں نے اسے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ واپسی کے راستے اس کے لیے بند ہو چکے ہیں اور یہ کہ اس کا ٹھکانا اب اسی گھر میں ہے۔

اس دن علی الصبح اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آج کی صبح حیام اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ تو وہ ہی آکر اسے جگاتا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر عموماً سو جاتی تھی کیونکہ کام تو کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری تھی۔ اور ادھر تو ویسے بھی ہاتھ ڈلوا کر نئی دلہن سے کام کروانے کا رواج بھی نہیں تھا۔

وہ نماز پڑھ کر سوتی تو پھر دس گیارہ بجے تک اٹھتی تھی۔ اگر بیچ کے دنوں میں حیام چند گھڑیوں کے لیے آجاتا تو پھر اس کی روٹین کچھ اور ہو جاتی تھی۔

اس دن دوبارہ سونے کی کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی۔ سو وہ کروٹیں بدلنے کا ارادہ ترک کر کے اٹھ گئی تھی۔

فریش ہونے کے بعد کمرے میں رہنے کے بجائے وہ باہر آگئی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ معمول کے مطابق خاموشی اور سناٹے ہی استقبال کریں گے۔ مگر ڈائننگ ہال سے آنے والی آوازوں اور دبی دبی ہنسی نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

پورے دو ماہ اور ستائیس دن بعد اس نے کسی ذی روح کی بے فکری ہنسی کی آواز سنی تھی۔ بھلا وہ ٹھٹکتی یا چونکتی کیوں نہ۔

"اس خاموش محل میں بھی بھلا کوئی ہنس سکتا ہے؟" وہ گویا چند پل کے لیے حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ ظاہر سی بات ہے۔ آج تک اس نے لالہ یا پھر حیام کو ہنستا تو دور کی بات کھل کر مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ توقیر بیگم کا تو چہرہ بھی ہر وقت سپاٹ ہی دکھتا تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی ڈائننگ ہال تک آگئی تھی۔ جوں ہی اس نے اندر قدم رکھا تھا۔ ہنسی کی آواز ایک دم تھم سی گئی۔ لالہ رخسار حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گویا وہ کہنا چاہتی تھی کہ "تم بھلا کیسے وقت سے پہلے اٹھ گئی ہو؟"

اسی طرح حیام بھی کچھ متحیر تھا۔ یعنی اسے بھی رخشندہ کے اتنی جلدی کمرے سے باہر آجانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ دفتر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا اور لالہ اس کے قریب جھکی نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ چہرے پر شفق اور گلال بکھرا تھا۔ جوں ہی وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تھی۔ لالہ کی مسکراہٹ سمٹ کر رہ گئی۔ حیام کے چہرے کے تاثرات بھی ایک دم سپاٹ ہو گئے تھے۔ ڈائننگ ہال میں گویا موت کا سناٹا پھیل گیا۔

"آپ لوگ خاموش کیوں ہو گئے؟" کچھ دیر پہلے کی تازگی اور خوشگواری کا تاثر ہلکا ہو گیا تھا۔ اسی لیے رخشندہ گھبرا کر بول اٹھی۔ اسے لالہ اور حیام کا ہنستا بولنا اچھا لگا تھا۔ اتنے دنوں بعد اس نے جمود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔

"تم جلدی اٹھ گئیں؟" لالہ نے بمشکل ایک دوسرے سے جڑے لبوں کو کھول کر بولنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اس کے نقوش عجیب ہو گئے تھے۔

"ہاں، بس آنکھ کھل گئی... آپ ابھی تک آفس نہیں گئے۔" وہ لالہ کو جواب دے کر حیام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"نہیں۔" جواب مختصر تھا اور وہ اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا چکا تھا۔

"میں ناشتہ کیے بغیر آفس نہیں جاتا۔" حیام نے شاید سوچا تھا کہ اس کا جواب حد درجہ روکھا ہے۔ کبھی اخبار ہٹائے بغیر اس نے ان چند جملوں کا بھی اضافہ کر لیا۔

http://www.pakfunplace.com

"میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔" رخشنہ محض اتنی سی توجہ پا کر ہی پھول کی طرح کھل اٹھی۔

"تم رہنے دو۔ حیام کے لیے ناشتہ میں لاتی ہوں۔" لالہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر جس بے ساختہ انداز میں اسے ٹوکا تھا۔ رخشنہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی کچھ چونک کر سنبھل گئی۔

"میں تم دونوں کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔" فی الفور اس نے لفظوں میں تبدیلی کی۔

"نہیں، آپ رہنے دیں ۔۔۔ میں اپنا اور حیام کا ناشتہ بنالوں گی۔ مجھے حیام کے لیے ناشتہ بنانا اچھا لگے گا۔" اس نے بغیر جھجکے لالہ کی آنکھوں میں براہ راست دیکھ کر کہا تھا یوں کہ ایک دم حیام نے اخبار سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں اخبار پر جما دیں۔ شاید وہ لالہ کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔ مگر جب لالہ کچھ نہ بولی تو اسے کہنا ہی پڑا۔

"لالہ کو خبر ہے۔ میں ناشتے میں کیا لیتا ہوں۔ تم کہاں تردد کرو گی۔"

"تردد کیسا؟ میرے لیے اس سے بڑی خوشی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے آپ کے لیے ناشتہ بنا کر خوشی محسوس ہو گی۔" اپنے گھر میں اسے کچن سے باہر نکلنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور یہاں اسے کچن میں جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ بات تو کچھ عجیب ہی تھی۔

"اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش نہیں ہوتے میری جان! تم یہاں اطمینان سے بیٹھو۔ میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں۔ پچھلے تیرہ چودہ سالوں سے حیام کے لیے ناشتہ بنا رہی ہوں۔ یہ کام میرے ذمے ہی رہنے دو۔ تم کیوں جان کھپاتی ہو ۔۔۔؟" وہ بڑے پیار بھرے لہجے میں نہایت حلاوت سے بول رہی تھی۔ بہت ہی میٹھا شہد آگیں انداز تھا۔

"کوئی بات نہیں، آج آپ دونوں میرے ہاتھ سے بنا ناشتہ کرلیں۔ مجھے یقین ہے حیام کو بہت پسند آئے گا۔" اس نے بھی بے تکلفی کی فضا قائم کرنے کے لیے خوش دلی سے کہہ دیا تھا تاہم لالہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔

"یہ ممکن نہیں۔ حیام میرے ہاتھ کے ذائقوں کا عادی ہے۔" اس نے بھی بظاہر بہت خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"پہلے کھا کر تو دیکھیں۔" رخشنہ نے لالہ کو چھیڑا۔

"بہت اعتماد ہے خود پر؟" لالہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وہ تو ہے۔"

"دھیان رکھنا۔ یقین، اعتماد، اعتبار اکثر ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔" وہ اسے خبردار کر رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہو گا۔" رخشنہ پریقین تھی۔

اسی پل حیام نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"مجھے لگتا ہے، آج خالی پیٹ ہی دفتر جانا پڑے گا۔" وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا جب لالہ نے سرعت سے حیام کے ہاتھ پر اپنا کنول جیسا ہاتھ رکھا۔

"غصہ کیوں کرتے ہو، بس میں ابھی ناشتہ لائی۔" دوسرے ہی پل وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی تھی اور صرف دس منٹ کے اندر اندر واپس بھی آ گئی۔

تلا ہوا پراٹھا، کلیجی، گردے اور دل کا بھنا ہوا سالن ۔۔۔ اور ساتھ میں گرما گرم چائے۔

"تمہارے لیے بھی پراٹھا ہی لاؤں؟" وہ بہترین سروس دینے کے لیے مستعد کھڑی تھی۔

"نہیں، بریڈ لوں گی۔" رخشنہ اس قدر مرغن ناشتہ کر کے طبیعت کو بھاری نہیں کرنا چاہتی تھی۔

حیام نے رغبت سے ناشتہ کیا تھا اور پھر شکر گزار نظر لالہ کی طرف ڈال کر ان دونوں کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا مگر رخشنہ کے حلق میں نوالہ اٹک کر رہ گیا۔ اس کی نظریں ڈائننگ روم کی کھلی کھڑکی سے باہر تک جا رہی تھیں۔

لالہ بھی باہر چلی گئی تھی اور پھر دوسرے دروازے سے حیام کے پیچھے پورچ تک چلی آئی۔ وہ اسے کوٹ پہنا رہی تھی جب رخشنہ کی نظر نے اس منظر کو دیکھا تھا۔ یہ لالہ کا معمول تھا مگر رخشنہ اس معمول سے ناواقف تھی۔ اسی لیے اسے یہ منظر بہت اجنبی اور

عجیب لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں اس لمحے بہت زور سے کانٹا چبھا تھا اور غیر ارادی طور پر آنکھوں کی شفاف سطح چھلکتی چلی گئی۔

✡ ✡ ✡

دوسری صبح وہ لالہ اور حیام کے اٹھنے سے پہلے ہی کچن میں چلی آئی تھی۔ آج وہ ہر صورت حیام کے لیے اپنا من پسند ناشتہ بنانا چاہتی تھی۔

خوش قسمتی سے اسے کچن خالی ملا تھا اور وہ اپنی پسند کا ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ رخشنہ جب تک میز پر ناشتہ سجا کر فارغ ہوئی تھی اتنی دیر میں لالہ بھی اٹھ کر آ گئی۔ اور اس کی آنکھیں تحیر کے عالم میں پھیلتی چلی گئی تھیں۔

"یہ سب کس نے کیا؟" لالہ کی آنکھوں میں واضح ناگواری در آئی تھی۔

"میں نے۔" رخشنہ نے خوشی خوشی بتایا۔

"کیوں؟" لالہ کا لہجہ ہی نہیں انداز بھی خاصا تلخ تھا۔

"حیام کے لیے۔"

"کیا بنایا ہے؟" لالہ نے آگے بڑھ کر ڈونگے کے ڈھکن اٹھانے شروع کیے۔ بھنے ہوئے چنے، حلوہ اور خستہ خستہ پوریاں۔

"یہ سب حیام کھائے گا؟" لالہ اب اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو ہونق سی کھڑی لالہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

"جی۔" اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ہونہہ! وہ یہ حلوہ پوریاں نہیں کھاتا۔" لالہ نے نخوت سے کہا۔

"مگر آج کھائیں گے۔" نجانے اس کے منہ سے کیسے پھسل گیا۔

"کبھی نہیں، وہ اس ناشتے کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔" لالہ کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

رخشنہ مزید تکرار کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ حیام آج ادھر ہی سو رہا تھا۔ وہ جھک کر حیام کو جگانے لگی۔ کچھ دیر بعد حیام اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو رخشنہ نے کہا۔

"ناشتہ کرلیں، ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"آرہا ہوں، تم جاؤ۔" وہ باہر نکل کر اپنے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ رخشنہ ڈائننگ ہال میں آ گئی۔

اس کا بنایا گیا ناشتہ اسی طرح سے سجا ہوا تھا مگر ساتھ ہی کچھ اور چیزوں کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ لالہ، پراٹھے انڈے اور دودھ رکھ گئی تھی۔ حیام کی آمد کے ساتھ وہ کسی مستعد ویٹر کی طرح اس کے دائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ رخشنہ ساری صورت حال سمجھ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر مختلف چیزیں حیام کے سامنے رکھنا شروع کر دیں۔

"یہ حلوہ، پوری اور چنے کس نے بنائے؟" حیام، لالہ سے پوچھ رہا تھا۔

"رخشنہ نے۔" لالہ ایک ادا سے مسکرا دی۔

"یہ اٹھالو۔" حیام نے ڈونگہ پیچھے کھسکا کر رخشنہ کو حق دق کر دیا۔

"مگر۔"

"کیا اگر مگر ۔۔۔ میں یہ سب نہیں کھاتا، آئندہ زحمت مت کرنا۔ میں لالہ کے ہاتھ سے بنے کھانوں کا عادی ہوں۔"

"مگر اب آپ کو کچھ اور ذائقوں کا بھی عادی ہونا پڑے گا۔" احساس توہین سے رخشنہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میری جان! غصہ نہیں کرتے۔ حیام کی بات پر غصہ نہیں کرو۔" لالہ پھر بڑے میٹھے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"تم ہمارے بیچ میں مت بولو۔" رخشنہ نے غصے سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ لالہ لب بھینچے خاموش ہو گئی تھی۔

"تم لالہ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟" حیام ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہمارے بیچ میں کیوں بولتی ہے۔" رخشنہ بغیر خوف زدہ ہوئے بلند آواز میں بولی۔

"یہ ہمارے بیچ ہمیشہ بولتی رہے گی۔" حیام چبا چبا کر

http://www.pakfunplace.com

گویا ہوا۔

"اور مجھے یہ ہرگز پسند نہیں۔"

"نہ ہو۔" حیام کا اطمینان قابل دید تھا۔

"حیام ....." وہ کانپ کر رہ گئی۔ "آپ اپنی بیوی پر ایک کزن کو فوقیت دے رہے ہیں؟" صدمے کی شدت سے رخشہ کی آواز پھٹ گئی۔

"جو مرضی سمجھ لو۔" حیام کو گویا پروا ہی نہیں تھی اور وہ غصے سے بھڑک رہی تھی۔

"سمجھ تو میں بہت کچھ رہی ہوں۔" رخشہ تلخ لہجے میں بولی۔

"اپنی زبان کو لگام دو۔" حیام آگ بگولا ہوا۔

"کیوں؟ سچ کڑوا لگتا ہے۔" بہت دنوں سے جمع شدہ بھڑاس کو گویا روزن مل گیا تھا۔

"بکواس بند کرو۔" حیام غصے کے عالم میں اس کی سمت بڑھا۔ تب ہی لالہ نے ہاتھ آگے کر کے اسے روک لیا۔

"جانے بھی دو حیام! غصہ کیوں کرتے ہو۔ بس کرو، رخشہ ابھی ناسمجھ ہے۔" لالہ کے لفظوں میں جادو تھا یا اس کے ہاتھ کے لمس میں..... حیام گویا ایک معمول کی طرح واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"ناشتہ کرو حیام! تمہیں دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔" لالہ کے کہنے کی دیر تھی۔ حیام خاموشی کے ساتھ ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ سر ہی نہیں اٹھایا۔ کچھ بولا ہی نہیں۔ یوں گویا وہ کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔ ایسی فرماں برداری..... اس قدر تابع داری، رخشہ کو لگ رہا تھا۔ کچھ دیر تک اور اگر اس ماحول میں موجود رہی تو پھر سے پھٹ پڑے گی۔ وہ پیر گھسیٹتی باہر نکل گئی تھی اور لالہ اس کے منظر سے ہٹ جانے پر فتح مندی سے مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

لائبہ کے مجبور کرنے پر بالآخر نوشابہ بھابھی کو طلاب کے لیے ہاں کرنا پڑی تھی۔ ویسے بھی طلاب میں کوئی کمی نہیں تھی جو اسے ریجیکٹ کیا جاتا۔

لائبہ کی شادی میں اس کی سسرالی فیملی میں سے حیام سمیت کسی نے بھی شرکت نہیں کی تھی اور یہی بات نوشابہ بھابھی کو بھی خاصی کھٹک رہی تھی۔

جس دن لائبہ، طلاب کے ساتھ کراچی گئی تھی۔ اسی دن رخشہ بھی اپنے گھر آ گئی۔ یہاں پر سب کچھ ویسا ہی تھا۔ گھٹا گھٹا سا خاموش ماحول۔ توقیر بیگم کا وہی عبادت کا انداز تھا۔ اور لالہ رخسار کا معمول بھی وہی۔

اسے دیکھ کر لالہ خیر سگالی کے طور پر مسکرا دی۔

"کر آئی ہو بھتیجی کی شادی؟"

"جی مگر ایک افسوس ہے۔"

"کیا؟" لالہ چونکی۔

"آپ شادی میں کیوں نہیں آئیں؟"

"حیام تو گیا تھا نا..... میرا جانا ضروری نہیں تھا۔ ویسے بھی پچھلا پورا ہفتہ میں عبادت میں مصروف رہی ہوں، چاند کی آخری تاریخوں میں ہم گھر سے باہر نہیں نکلتے بس رات دن عبادت کرتے ہیں۔" لالہ نے وضاحتی انداز میں کہا تھا۔ وہ اس وقت بھی لمبا سا چغہ پہنے ہوئے، ماتھے تک دوپٹہ لیے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھی۔ ایسی عبادت گزار عورتوں پر بھلا شک کیا جا سکتا ہے؟ مگر رخشہ اول روز سے لے کر اب تک دیکھ رہی تھی۔ اسے نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"حیام بھی کہاں آئے تھے۔" رخشہ نے افسردگی سے بتایا۔ "میں نے اتنی دفعہ کال کی تھی۔"

"اچھا....." لالہ نے حیرانی کی اداکاری کی۔

"مجھے تو اس نے کہا تھا کہ وہ شادی میں شرکت کرنے جا رہا ہے۔"

"تم حیام سے پوچھو نا!" وہ تسبیح کی طرف متوجہ تھی۔

"کیا؟" رخشہ نے پوچھا۔

"یہی کہ تمہاری بھتیجی کی شادی میں کیوں نہیں گیا۔"

"یہ بات بھی تم ہی پوچھ لینا۔ میرے پاس آتے ہی کہاں ہیں۔" رخشہ کا انداز صاف طنزیہ تھا۔

http://www.pakfunplace.com

رخشندہ کے لفظ لفظ میں تلخی کی بو رچی تھی۔ ایک بات تو روز روشن کی طرح — عیاں ہوتی جارہی تھی کہ حیام اور رخشندہ کے درمیان فاصلوں کی اصل وجہ "لالہ رخسار" کی ذات ہے اور وہ حیران تھی کہ بھلا ایسا کیوں ہے۔ اگر حیام اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو پھر بھلا اسے کس نے مجبور کیا تھا۔ وہ خود مختار تھا۔ انکار کر دیتا۔ وہ بہت سی الجھنوں کا شکار تھی اور ان الجھنوں کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

"یہی بات حیام کے سامنے کہنا۔" لالہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے توسط سے خود بخود یہ بات حیام تک پہنچ جائے گی۔" رخشندہ کے طنز نے لالہ کو بری طرح سے تلملا کر رکھ دیا۔

"تم اپنے لہجے اور لفظوں پر کنٹرول کیا کرو۔ ورنہ ایک دن نقصان اٹھاؤ گی۔"

"ہمیشہ سے نقصان میں رہنے والوں کو کسی خسارے کا ڈر نہیں رہتا۔"

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟" لالہ رخسار کے قندھاری رخسار غیض و غضب سے سرخ خون رنگ ہو گئے۔ "جس جگہ کھڑی ہونا' ایک جھٹکے سے اس منصب سے ہٹا سکتی ہوں تمہیں۔"

"بس اسی بات کا غرور ہے؟" رخشندہ اندر سے کانپ کر رہ گئی تھی تاہم اس نے لہجے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"پچھتاؤ گی تم؟"

"نجانے کس نے پچھتانا ہے۔" رخشندہ پھیکے انداز میں بولی۔ "وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی اور غرور تو بادشاہوں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔"

"تم مجھے سمجھاؤ گی اب۔" لالہ پھر سے تلخ ہوئی۔ حالانکہ اس کی تلخی گھڑی بھر کے لیے ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر وہی شہد آگیں لہجہ لوٹ آتا تھا۔

"نہیں' ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔" رخشندہ نے پھر سے طنزیہ لہجہ اپنایا۔ "ویسے ایک بات تم سے کہنا تھی۔"

"کیا؟" لالہ چونکی۔

"حیام کے اور میرے بیچ مت آیا کرو۔"

"تم پھر غلط لفظ استعمال کر رہی ہو۔" لالہ بھڑک اٹھی۔

"یہ غلط بات نہیں۔ تمہارا حیام کے ساتھ رویہ مجھے عذاب میں مبتلا کر رہا ہے۔" رخشندہ نے گویا تھک کر کہا۔

"ہم پر تو اس سے بھی بڑے بڑے عذاب اترے ہیں۔" لالہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔

"تو پھر مجھے اپنے عذابوں میں حصہ دار کیوں بنا لیا ہے؟" رخشندہ ایک دم آگ بگولہ ہو اٹھی۔

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ ورنہ تمہیں نہ خواب دیتی نہ عذاب۔" لالہ کی آنکھوں میں لالیاں اتر آئیں۔ "جاؤ' جا کر اپنا کام کرو۔ آرام کرو' یا جو چاہے کرو — مجھے تنہا چھوڑ دو۔" ایک دم لالہ کو نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے ہلتے ہوئے تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

رخشندہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ کچھ دن بعد کی بات تھی۔ اس دن حیام کا موڈ بہت خوشگوار تھا اور اس نے رخشندہ کو اچھے سے تیار ہونے کا کہا تھا مگر ساتھ تنبیہہ بھی کی [illegible] کمرے سے باہر مت آنا۔ [illegible] دنوں سے اس کا رویہ بہت اچھا [illegible] رخشندہ نے بھی گزرے بہت سا[illegible] کے شکوے شکایات کی فائلیں کھول [illegible]

رخشندہ [illegible] کی پہلی رات حیام کے اپنے کمرے [illegible] آنے کا شکوہ بھی بالآخر کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو چپ ہو گیا اور پھر اس نے خود ہی دھیمی آواز میں بتا دیا۔

"اس رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ گویا دماغ میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔ نیند تھی کہ راستے میں ہی میرے دماغ پر سوار ہو رہی تھی۔ گھر آکر میں اپنے کمرے میں سو گیا تھا۔ تمہارے پاس آ ہی نہیں پایا۔ اگر میری طبیعت ٹھیک بھی ہوتی تو تب بھی میں اس رات تمہارے پاس نہیں آسکتا تھا۔ یہ ہماری رسومات اور روایت میں شامل نہیں۔ بیوی کے کمرے میں سونا بھی اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔ بہت سال پہلے تو اس خاندان کے مردزنان خانے میں آتے ہی نہیں تھے۔ کبھی کبھار ضرورت کے تحت ہفتے میں ایک دو دن اندرونی حصے میں قیام کی اجازت تھی۔ تم ان چیزوں پر زیادہ غور مت کیا کرو۔ بس [illegible] رہا کرو اور پلیز لالہ کے ساتھ الجھنے کی کوشش [illegible]۔ لالہ اپنی ذات میں بہت تنہا ہے رخشندہ [illegible] تم اس کی ایک اچھی دوست بن جاؤ۔ تم [illegible] بھی ہو' تعلیم یافتہ ہو۔ بہت سی باریکیوں کو سمجھ سکتی ہو لالہ بری نہیں۔ تم اگر۔"

لالہ [illegible] کل چکا تھا۔ اسی لیے رخشندہ بیزار ہو گئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی لالہ کا ذکر چھیڑتے ہی اسے نیند بھی آجاتی تھی۔

حیام کا رویہ بھی ہمیشہ دھوپ چھاؤں جیسا ہوتا تھا۔ کبھی تو اتنا مہربان ہو جاتا۔ کبھی بلا کا لاتعلق اور اجنبی بن جاتا۔ گویا رخشندہ کو جانتا ہی نہ ہو۔

حیام فطرتاً "نرم مزاج" بہت سنجیدہ اور کم گو بندہ تھا۔ وہ اس کا خیال رکھنے کی کوشش بھی کرتا تھا اور اسے اپنی محبت سے سرفراز بھی کرتا تھا۔ مگر لالہ کے بارے میں کچھ بھی کہنا سننا حیام کو گوارا نہیں تھا۔ وہ لالہ کی وجہ سے رخشندہ کے ساتھ الجھ پڑتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رخشندہ "لالہ" کا احترام نہیں کرتی۔ جبکہ رخشندہ تو تصور کی آنکھ سے کچھ اور دیکھ رہی تھی۔

اس دن حیام کی فرمائش پر وہ تیار ہونے کے لیے اپنے سوٹ کیس اور الماری کھولے بیٹھی تھی۔ دراصل شادی کے بعد توقیر بیگم نے اسے سختی سے ہار سنگھار کرنے سے منع کر دیا تھا۔

"جو کچھ کرنا ہو۔ اپنے کمرے میں کیا کرنا۔ گھر میں جوان لڑکی موجود ہے۔ ہم نہیں چاہتے' تمہیں دیکھ کر اس کے اندر کی دبی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ اور ہماری بیٹی کی پاکیزہ سوچیں آلودہ ہو جائیں۔" رخشندہ نے حرف حرف [illegible] بات کو سمجھ لیا تھا۔ اور نہ صرف سمجھا [illegible] کیا تھا۔

الماری [illegible] تو اسے عروسی لباس والا بھاری ساڈبہ [illegible] دیا۔ وہ لباس جو اتنے شوق اور چاہ سے بنوایا تھا [illegible] حیام نے اک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈبہ الماری میں نہیں تھا۔ رخشندہ کو خوامخواہ اپنی شادی والی خوفناک رات یاد آگئی تھی۔ اور حیام کے بے تاثر چہرے اور لالہ کی آنکھوں کی چمک بھی پھر سے کلک کر کے روشن ہو گئی تھی۔ رخشندہ نے سر جھٹک کر سوٹ کیس اور پھر بیڈ کے نیچے والی جگہ پر بھی دیکھ لیا۔ اس کے لہنگے والا ڈبہ کہیں نہیں تھا۔ میک اپ والی دراز کھولی تو خالی دراز کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ دراز بالکل خالی تھی۔ ایک لپ اسٹک بھی موجود نہیں تھی۔ اس کے چار پانچ پرفیومز اور باڈی اسپرے بھی غائب تھے۔ رخشندہ تو گویا ہکا بکا رہ گئی تھی۔

ایک دفعہ پھر سے الماری کھول کر کپڑے چیک کیے تو جہیز کی ساڑھی اور تین چار قیمتی اور بھاری سوٹ کے ساتھ کی جوتیاں تک غائب تھیں۔ لاکر کھولا تو زیور نہیں تھا۔ رخشندہ تو گویا خوف سے منجمد ہو گئی تھی۔

"میرا سامان کہاں گیا؟" "کیا بھوت پریت لے گئے ہیں؟ اس گھر میں بھلا چور کون ہو سکتا ہے؟ کسی پر الزام بھی تو نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ صدیقہ ان کی خاندانی ملازمہ تھی۔ کئی طرح کے حساب کتاب اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس پر چوری کا الزام لگا کر وہ توقیر بیگم کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔ اور لالہ' صاحب جائیداد ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بیٹی تھی۔ اسے رخشندہ کی اترن کی کیا ضرورت تھی۔ اس وقت تو رخشندہ خاموش ہو گئی تھی۔ حیام تک کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ وہ خود بھی مورد الزام ٹھہرائی جا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

سر سے پیر تک چادر میں لپٹی لالہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ دن کو ہمیشہ وہ ملگجے حلیے میں ہی دکھائی

http://www.pakfunplace.com

دیتی تھی۔ اتنی بڑی ٹینٹ نما چادر ہوتی تھی کہ کپڑوں کا رنگ اور ڈیزائن تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔

"صدیقہ! کہاں ہو؟ جلدی آؤ ــ دیر ہو رہی ہے۔" لالہ چہرے پر نقاب کرتی صدیقہ کو دبی آواز میں بلا رہی تھی۔ صدیقہ بھی اس کی آواز سنتے ہوئے چپکے سے آگئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" رخشندہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں بیٹھی تھی اور ان دونوں کو چپکے چپکے باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔ نجانے ہر جمعرات کی شب لالہ صدیقہ کے ہمراہ کہاں جاتی تھی۔ اور واپسی پر بھی اس کی عجیب و غریب حرکتیں ہوتی تھیں۔ وہ آتے ساتھ اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ پھر کچھ دیر بعد کچن میں دکھائی دینے لگتی تھی۔ کوئلے سلگا کر نجانے ان پر کیا چھڑکتی تھی کہ پورے گھر میں دھواں دھواں پھیل جاتا تھا۔ توقیر بیگم کے کمرے کے علاوہ ہر کمرے میں دھونی دی جاتی۔ ایسی ناگوار بو ہوتی تھی کہ رخشندہ کے دماغ میں گھس جاتی۔ کچھ دیر بعد مرچوں کو چولہے پر رکھ کر آگ جلا دی جاتی تھی اور پھر تین گھنٹے اسی عمل کو بار بار دہرایا جاتا تھا۔ پھر تعویذ جلائے جاتے۔ یہ سب گھر کی خیر و برکت کے لیے کیا جاتا تھا۔

"سائیں جی کے حجرے تک۔" لالہ نے سرسری انداز میں بتایا تھا اور ایک دم رخشندہ کو نجانے کیا ہوا تھا اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"میں بھی ساتھ چلوں۔"

"تم۔" لالہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ "تم کیا کرو گی وہاں جا کر؟"

"جو تم کرو گی۔" رخشندہ اطمینان سے بولی۔

"میں ــ میں تو دعا کے لیے جاتی ہوں۔" لالہ گڑبڑا کر بولی۔

"اور میں بھی دعا کے لیے ہی جاؤں گی۔"

"تمہیں اور کیا چاہیے ــ سب کچھ تو مل گیا ہے تمہیں۔" لالہ گویا بھڑک کر بولی۔ ایک دم اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔ "مزاروں پر دھکے وہ کھاتے ہیں۔ جو خالی دامن ہوتے ہیں۔"

"تم قبروں سے مانگنے جاتی ہو؟" رخشندہ کو گویا شاک لگا۔ "مٹی کی ڈھیریاں کیا جھولی بھر دیتی ہیں؟"

"میرا اعتقاد ہے۔"

"بڑا غلط اعتقاد ہے۔ تم اللہ سے کیوں نہیں مانگتیں، وہ تو بڑا مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

"مگر مجھ پر مہربان نہیں۔" وہ عجیب باغی انداز میں بولی۔

"اللہ سے ڈرو، اس طرح نہیں بولتے۔" رخشندہ دہل اٹھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ بہت مانگا ہے اس سے۔ بے تحاشا مانگا ہے مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ نہ تنہائی کی قید سے آزادی ملی ہے۔ نہ زندگی کے بوجھ سے چھٹکارا۔"

"تمہاری دعا کا قصور نہیں تمہاری نیت کا قصور ہے۔ خالص نیت سے مانگ کر تو دیکھتیں۔ رحمتوں کی برسات ہو جاتی تھی۔" رخشندہ کا انداز ناصحانہ تھا لالہ اس کی مزید نصیحتوں کو سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔

لالہ کے چلے جانے کے بعد پورے گھر میں سناٹا اتر آیا۔ حالانکہ وہ بھی اتنا نہیں بولتی تھی مگر صدیقہ اور لالہ کی موجودگی سے دل کو ڈھارس سی رہتی تھی۔ اور اس وقت گھر کے سناٹے عجیب سے خوف میں جکڑ رہے تھے۔ نجانے یہ کیسا خوف تھا جو اس گھر کے در و دیوار سے لپٹا ہوا تھا اور یہی خوف اب رخشندہ کے دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ کافی دیر ... جب نجانے کب چپکے سے توقیر بیگم اس کے برابر آ کر بیٹھ گئیں۔

رخشندہ اپنے ہی دھیان میں گم تھی۔ اسی لیے انہیں اچانک بیٹھا دیکھ کر خوف سے اچھل پڑی۔ ظاہر ہے ... میں پہلی مرتبہ رخشندہ نے انہیں کمرے سے باہر بیٹھا دیکھا تھا۔

"ڈر گئی ہو؟" وہ نرمی سے مسکرائی تھیں تاہم ان کے نقوش پھیل کر کچھ بھیانک ہو گئے تھے۔

"جی بس پتا نہیں چلا۔" رخشندہ گڑبڑا کر بولی۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ جب سے اس گھر میں آئی ہے۔ بس ڈرے ہی جا رہی ہے اول روز سے اب تک

ایسے ایسے عجیب و غریب واقعات وقوع پذیر ہو رہے تھے۔

"لالہ کہاں گئی؟"

"کسی سائیں جی کے حجرے تک گئی ہے۔" رخشندہ کو جتنا معلوم تھا بتا دیا۔

"بے چاری لالہ!" توقیر بیگم اس قدر بے ڈھنگے پن سے ہنسی تھیں کہ رخشندہ کا دل پھڑکنے لگا۔ بھلا اس میں ہنسنے والی کیا بات تھی؟

"کوئی فائدہ نہیں، جہاں مرضی ناک رگڑ آئے۔ کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں نے جو کرنا تھا کر دیا۔ اپنی ضد پوری کی اور اسے اپنے ہی ... کی قبر میں قید کر دیا۔ ایسا ہی ایک ... وجود لپیٹ کر میں نے اپنے سارے ... باق کر لیے ہیں۔ اب میرے دل ... ملال نہیں۔" وہ اپنے جسم سے لپٹی چادر کے پلو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عجیب ابنارمل انداز میں کہہ رہی تھیں۔ یوں کہ رخشندہ کا دل اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ کپکپاتے لہجے میں بمشکل بولی۔ پسینے کے چند قطرے اس کے ماتھے پر ابھر آئے تھے۔

"تم بھلا کیسے سمجھ پاؤ گی۔ یہ تمہاری سمجھ سے اوپر کی بات ہے۔" انہوں نے پھر سے چادر کے پلو پر ہاتھ پھیرا۔

"اماں جی! میرے اندر بہت گھبراہٹ ہے۔ عجیب سے اندیشے اور وسوسے پریشان کرتے ہیں۔ جی چاہتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ہر وقت وجود پر عجیب سی سستی چھائی رہتی ہے۔ سوتے میں یوں لگتا ہے کہ گویا کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے۔" وہ اپنے خوف اور بے چینیوں کی وضاحت نہیں کر پائی تھی۔ خصوصاً جب وہ اپنے کمرے میں ہوتی تھی تب کچھ زیادہ ہی خوف اور گھبراہٹ اس پر سوار ہو جاتی تھی۔

"پریشان مت ہوا کرو۔ معوذتین پڑھا کرو نحوست ہے تعویذوں کی۔ میرے وظیفوں سے خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے سارے وار بیکار جاتے ہیں۔ کوئی عمل پورا نہیں ہو پاتا۔ ورنہ اب تک مجھے کب کی ہرا کر رکھ دیتی۔" توقیر بیگم کا انداز مبہم اور پراسرار ... کا تھا۔

"کس ... کون ہرا دیتا؟" اس نے لکنت زدہ لہجے پر قابو ... پوچھا۔

"بے ... سائیں جی سے تعویذ لا کر جلاتی ہے۔ جادوگرنی کے سارے وار بے کار گئے۔" انہوں نے حقارت سے کہا تھا۔

"کالے جادو کی نحوست سے تمہارا دل گھبراتا ہے۔ تم غم نہ کھاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس حیام کو مٹھی میں کر لو۔" انہوں نے باہر کو ابلے ڈیلوں کو گھما کر دیکھا۔

"بھلا کیسے؟" اس نے خوف کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔

"بیوی ہو اس کی ــ اپنی مٹھی میں کر لو۔ جب وہ تمہارا ہو گیا تو پھر میں اپنی ساری جائیداد تم دونوں کے حوالے کر دوں گی۔ پر اس لالہ کو ایک دھیلا تک نہ دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔" ان کے لفظ لفظ سے نفرت پھوٹ رہی تھی۔ اس نفرت کا حصار صرف لالہ کے ارد گرد تھا۔ نجانے ان ماں بیٹی میں کیسی عداوت چل رہی تھی۔ رخشندہ تو جتنا سوچتی تھی اسی قدر ــ ٹوٹ جاتی۔

"لالہ سے آپ کی ناراضی چل رہی ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر سے پورے ڈیلے گھما ڈالے۔

"صرف ناراضی۔ نفرت ہے مجھے اس کتیا سے۔" انہوں نے حقارت کی انتہا کر ڈالی۔ فرش پر تھوک دیا۔

"نفرت؟ پر کیوں؟" اس کی نوک زبان پر سوال مچل رہے تھے۔

"سب پتا چل جائے گا۔ اس "جادوگرنی" نے حیام پر جادو چلا رکھا ہے۔ تعویذ گھول گھول کر پلاتی ہے۔ تبھی تو وہ کسی کی نہیں سنتا۔ بس اس جادوگرنی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟ لالہ ایسا کیوں کرتی ہے؟" وہ

http://www.paktunplace.com

بے تابی سے بولی۔

"ہونہہ، جو بھی کرلے، جو بھی چاہے، بامراد پھر بھی نہیں ہوگی۔"

"میرے دل پر آبلے پڑے ہیں۔ میں چاہتی ہوں اس کا دل بھی آبلوں سے بھر جائے۔" ان کی سونی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" وہ حیران تھی۔ کوئی سگی ماں بھلا اپنی اولاد کے لیے ایسا سوچ سکتی تھی؟

"میری مرضی۔" ایک دم انہیں غصہ آگیا۔ تو وہ خوف زدہ ہو کر خاموش ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

رخشہ کی شادی کے بعد پہلی مرتبہ نوشابہ بھابھی اس کے گھر آئی تھیں۔ دراصل بیٹی بیاہ کر کسی اور کی بیٹی کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ پہلے تو لائبہ سے مہینے دو مہینے بعد ملاقات ہو جاتی تھی مگر اب لائبہ بھی طلال کے ہمراہ یورپ فلائی کر گئی تھی۔ صرف فون تک رابطہ محدود ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لائبہ سال دو سال سے پہلے تو نہیں آسکتی تھی۔ سو بھابھی گھر کی تنہائی سے عاجز آجاتی تھیں۔ باقی بھابھیوں کے پورشن الگ تھے اور کچھ وہ اپنے اپنے بچوں اور گھرداری میں مصروف رہتی تھیں۔ مل جل کر بیٹھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ آج ان کا بڑا دل گھبرایا تھا سو وہ رخشہ سے ملنے کے لیے آگئیں۔

"تمہاری پھوپھی ساس کہاں ہیں رخشی!..." وہ چائے وغیرہ بھی پی چکی تھیں مگر گھر کا کوئی فرد ان سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ بھابھی کو تشویش ہو چلی تھی۔

"اماں جی تو کبھی اپنے کمرے سے باہر نہیں آتیں بھابھی!" رخشہ جو بھابھی کی آمد پر خوشی سے کھل رہی تھی، بے مزاسی بتانے لگی۔

"اور وہ شہزادی حسن آرا؟"

"وہ بھی ہمیشہ حجرہ نشین رہتی ہے۔" رخشہ نے بے دلی سے بتایا۔

"کمال کی خوب صورت لڑکی ہے۔ مگر ابھی تک اسے گھر میں کیوں بٹھایا ہوا ہے؟" نوشابہ نے فطری تجسس کے تحت پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔"

"کیوں نہیں پتا؟" نوشابہ نے تیکھے چتونوں سے گھورا۔ "احمق! حیام سے کہہ کر اسے چلتا کرو۔ چلتی پھرتی قیامت گھر میں رکھی ہوئی ہے۔" بھابھی کا انداز گھرکنے والا تھا۔

"یہ میرے بس میں ہے کیا؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔ "جن لوگوں کی لالہ ذمہ داری ہے۔ وہ ہی اتنے انجان بنے ہوئے ہیں۔ تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" رخشہ نے دھیرے دھیرے اپنے سارے خدشے کہہ سنائے۔

"تم اپنی ساس سے بات کرو۔ وہ کیوں بیٹی کے بارے میں نہیں سوچتی۔" بھابھی کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ رخشہ کے سارے خدشے انہیں حق بجانب نظر آرہے تھے۔ شادی کی اولین رات کے اس منظر کے علاوہ رخشہ نے من و عن سب کچھ بھابھی کے گوش گزار کر دیا تھا۔

"حیام کا رویہ کیسا ہے؟" انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔ نجانے یہ فکرمندی دکھاوا تھی یا [illegible] اس کے لیے فکرمند ہو رہی تھیں۔

"بس دھوپ چھاؤں جیسا۔"

"دیکھو رخشہ! تم حیام کے کانوں میں چپکے چپکے یہ بات ڈالتی رہو۔ لالہ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"

"حیام [illegible] سے لگ کر بیٹھا رہتا ہے نا۔"

"[illegible] بتایا تو ہے آپ کو۔"

"وہ اپنے کمرے میں کیوں نہیں سوتا؟ تم کیسی بیوی ہو جو اس سے باز پرس بھی نہیں کرتیں۔" نوشابہ اسے سخت سست سنا رہی تھیں۔

"حیام کو عادت نہیں اپنے کمرے کے علاوہ کسی اور جگہ سونے کی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" نوشابہ اس عجیب منطق پر تپ

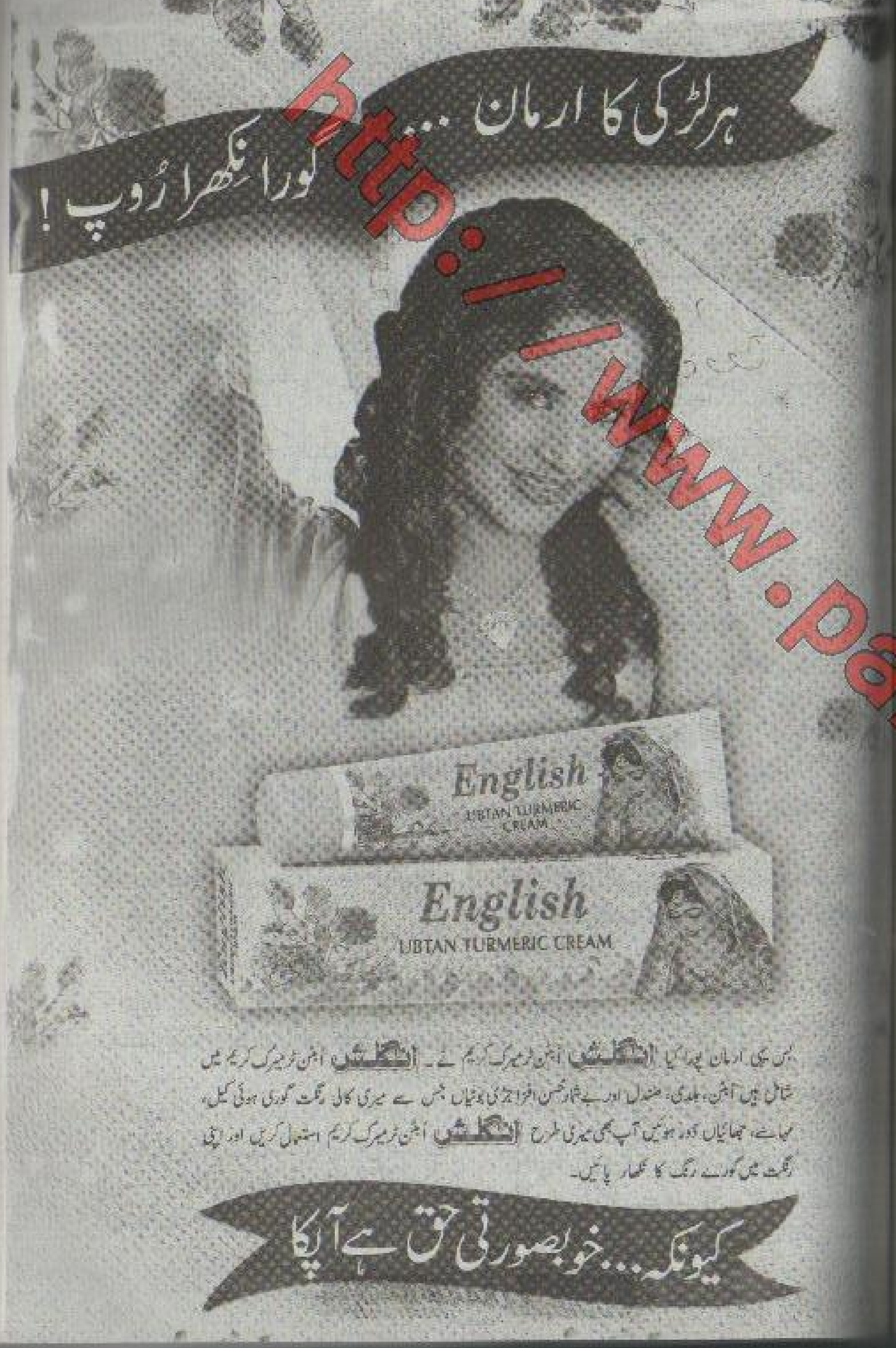

گئیں۔ "تو تم بھی حیام کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"میں خود سے بھلا کیسے؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"جب تک حیام کو اپنے قریب نہیں کرو گی۔ وہ تم سے دور ہی بھاگے گا۔"

"میں حیام سے بات کروں گی۔"

"بات نہیں کرنی۔ منوانی ہے۔ اور ہاں، یہ لالہ کو بھی ٹھکانے لگانے کا سوچو۔۔۔ ویسے تو بڑا دین دار گھرانہ ہے اور سنت، شریعت کی خبر نہیں۔ جوان بچی کو گھر بٹھا رکھا ہے۔" بھابھی نے لگے ہاتھوں اس کی برین واشنگ بھی کر دی تھی۔

"میں اماں جی سے بات کروں گی۔" اس نے گویا ارادہ باندھ لیا تھا۔

"ضرور کرنا، میں نوراں آپا سے کسی اچھے رشتے کی بات کروں گی۔" نوشابہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ حیام کے ساتھ ادھر کا چکر بھی لگانا۔ تمہارے بھیا بہت یاد کر رہے تھے۔"

"آج ادھر ہی رہ لیتیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"پھر آؤں گی۔ تمہارے بھیا اکیلے ہیں۔ مانو، تمہارے اور لائبہ کے بغیر گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" جاتے جاتے وہ افسردگی سے بولی تھیں۔ بالآخر اندرونی اور بیرونی تنہائیوں نے نوشابہ کے بھی بل نکال کر رکھ دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

حیام اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ جب دروازہ کھول کر رخشندہ با اعتماد قدم اٹھاتی اندر آگئی۔ حیام اسے دیکھ کر چونک گیا۔

"تم۔۔۔"

"ہاں جی، میں۔۔۔ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے دو قدم کا فاصلہ طے کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"کوئی کام تھا کیا؟" حیام ٹھٹک کر پوچھنے لگا۔

"بغیر کام کے میں آپ کے کمرے میں نہیں آسکتی؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"یوں مناسب نہیں لگتا۔" وہ اس سے نظر چرا کر بولا اور اٹھ گیا۔

"میں آپ کی بیوی ہوں۔" رخشندہ تنا کر بولی۔

"سب جانتے ہیں مگر ہمارے خاندان میں اس چیز کو مناسب نہیں سمجھا جاتا۔"

"اس میں نامناسب کیا ہے؟" وہ ایک دم تلخ ہو اٹھی۔ بھلا برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

"وہ دراصل لالہ کو برا لگے گا۔" اچانک حیام کے منہ سے پھسل پڑا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا تو نہیں چاہتا تھا۔

"کیا برا لگے گا؟" وہ ترشی سے بولی۔

"دیکھو گھر میں لالہ موجود ہے۔ اس کے سامنے یہ سب معیوب لگتا ہے۔ تم جاؤ میں رات کو آؤں گا۔ تم نے جو بات کرنا ہو کر لینا۔" حیام کا انداز صلح جو قسم کا تھا۔ یعنی وہ جھگڑا یا بحث مباحثہ نہیں چاہتا تھا۔

"تو پھر ابھی چلیں۔" اس کے صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔ اب وہ ضد اور زور زبردستی سے اپنی منوانا چاہتی تھی۔ خاموش رہ کر بہت دیکھ لیا تھا۔

"پلیز رخشندہ!" حیام نے ہاتھ اٹھا کر مزید اسے بولنے سے روک دیا۔

"حیام! میری سمجھ میں آپ کا رویہ نہیں آتا۔ یہ چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیل رہے ہیں میرے ساتھ؟" وہ تھک کر بولی۔

"کچھ عرصہ اور۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ نرمی [illegible] کے انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں ہو گا۔" رخشندہ نے دائیں بائیں نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک لالہ یہاں موجود ہے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"تو اس کا کیا کروں؟ گھر سے نکال دوں یا اس کا گلا دبا دوں؟" حیام نے خفگی سے کہا۔ خلاف معمول اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ تحمل سے اس کی ہر بات کا جواب

دے رہا تھا اور اگر بیچ میں لالہ ہوتی تو ضرور حیام نے بھڑک اٹھنا تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ اس کی شادی کر دیں۔ اسے دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا۔ ویسے بھی لالہ کے بارے میں سوچ سوچ کر تو وہ نیم دیوانی ہوتی جا رہی تھی۔ لالہ کی حیام سے بے تکلفی اور حیام کی فرمانبرداری اسے نجانے کیسے کیسے خدشات کا شکار کر رہی تھی۔

"میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔" حیام کو مسلسل خاموش دیکھ کر وہ چڑ گئی۔

"ابھی جاؤ۔۔۔ لالہ کی آواز آ رہی ہے۔ ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ رات کو۔ ٹھیک ہے نا۔ تم تیار رہنا۔" وہ مزید رخشندہ کی کوئی بات سنے بغیر جلدی جلدی بول رہا تھا۔ رخشندہ نے بھی مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ حیام باہر نکل گیا تو وہ بھی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو بھیا اسے لینے کے لیے آگئے تھے۔ بقول ان کے شادی کے بعد وہ ایک دفعہ بھی ٹھیک طرح سے رہنے نہیں آئے سو رخشندہ پھر سے ادھر ہی تھی۔ حیام نے کہا تھا، وہ دفتر سے واپسی پر اسے لیتا جائے گا۔ رخشندہ اس کایا پلٹ پر بھی حیران تھی۔

نوشابہ بھابھی کے علاوہ دوسری بھابھیاں بھی خاصی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ رخشندہ کو یہ تبدیلی بہت بھاری تھی۔ یہ عزت، یہ محبت اور یہ آؤ بھگت صرف اور صرف حیام کے توسط سے ہی تو تھی۔ بھلا رخشندہ کی ان سب کی نظر میں حیثیت ہی کیا تھی۔

بھابھی کے مزاج میں بھی بہت تبدیلی آگئی تھی۔ رخشندہ کے لیے ان کے دل میں پیار امڈ آیا تھا۔ اب وجہ حیام کی شخصیت تھی یا پھر اس کا سسرالی وسیع و عریض گھر۔ جو بھی تھا۔ رخشندہ کے لیے ان کے رویے کا بدلاؤ بہت خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اب وہ اکثر میکے آجاتی تھی۔

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ رخشندہ کا قیام میکے میں ہی تھا جب ایک روز غنی چلا آیا۔ اگرچہ غنی اپنی پھوپھو نوشابہ سے ناراض تھا مگر بھابھی کی اچانک بگڑ جانے والی طبیعت کی وجہ سے وہ اس سے متاثر ہو کر آگیا تھا۔ بھابھی بھی کسی طرح غنی کی ناراضی دور کر کے اسے پاکستان بلوانا چاہتی تھیں۔ بھابھی کی خواہش تھی کہ غنی پاکستان ان کے پاس آجائے۔ سو اسی لیے انہوں نے اپنی بیماری کے بہانے فون کر کے غنی کو بلوا لیا تھا۔ رخشندہ جو سمجھتی تھی کہ غنی نجانے کیسے ری ایکٹ کرے گا۔ اسے ہمیشہ کی طرح ہلکا پھلکا اور خوش مزاج دیکھ کر خود بھی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

غنی نے کہا بھی تو صرف اتنا۔

"مجھے دکھ یہ نہیں کہ تمہاری شادی کیوں ہو گئی۔ غصہ مجھے اس بات پر تھا کہ پھوپھو نے میرا پرپوزل موجود ہونے کے باوجود حیام کو مجھ پر فوقیت دی۔ چلو، یہ بھی بات نظر انداز کر دوں پھر بھی پھوپھو اور لائبہ کی اس سازش کو در گزر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے بہت افسوس ہوا تھا یہ جان کر کہ تمہیں منظر سے ہٹانے کے لیے بھابھی نے اپنے گھر اور شوہر کی عزت کا بھی خیال نہیں رکھا۔۔۔ خیر شکر ادا کیا کرو جو پھوپھو کو احساس ہو گیا۔" وہ بلا کا منہ پھٹ تھا۔ نوشابہ بھابھی کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر ہر بات منہ پر مارتا چلا گیا اور بھابھی اتنی شرمندہ ہوئیں کہ بے چاری اٹھ کر چائے بنانے کا بہانہ کر کے منظر سے ہٹ گئیں۔

"بھابھی کی موجودگی کا ہی خیال کر لیتے۔ ایک شرمندہ بندے کو بار بار شرمندہ کرنا زیب دیتا ہے کیا؟ اور جو کچھ ہوا تھا۔ میں سب بھول چکی ہوں۔ اب پلیز غنی! تم بھی کسی بات کو مت دہرانا۔" بھابھی کے چلے جانے کے بعد وہ التجائیہ انداز میں غنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں دہراؤں گا اعلیٰ ظرف رکھنے والے لوگو!" غنی نے گویا دہائی دی۔ یعنی وہ اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ رخشندہ دل میں بغض اور کینہ رکھنے والوں میں سے نہیں ہے۔

http://www.pakfunplace.com

"تم ابھی تک اکیلے پھر رہے ہو۔" وہ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ سو خوشگوار لہجے میں پوچھنے لگی۔
"کیوں ساتھ کسی دم چھلے کا ہونا بھی ضروری تھا؟" وہ غنی ہی کیا جو سیدھی بات کا سیدھا جواب دے۔
"تو اور کیا؟" بھابھی پھر آ گئیں۔ "میں تو سمجھ رہی تھی کوئی میم شمیم بھی ساتھ ہو گی۔ اور ہماری خدمت کرے گی۔"
"پھوپھو جان! میری بیوی سے ایسی توقع مت رکھیے گا۔ اسے تو پانی بھی میں ہی گلاس میں ڈال کر دوں گا۔" وہ اطمینان سے بولا۔
"ہائے 'ایسی زن مریدی۔" بھابھی اس کی جگت بازی کو بھی سچ ہی سمجھ لیتی تھیں۔
"راحیل انکل کی پیروی کروں گا ان شاء اللہ۔" وہ برابر انہیں چڑا رہا تھا۔ "ابھی تک آپ کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ پکڑ کر فون کھڑکا دیا ہے۔ آخری دیدار کر لو' اپنی پھوپھی کا' ورنہ پچھتاتے رہ جاؤ گے تمام عمر' نوشابہ بس آخری سانسوں پر ہے۔" غنی نے ہو بہو بھیا کی نقل اتاری تھی اور بھابھی نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے چپل اتاری۔
"یہ فائرنگ نہیں ہونی چاہیے پھوپھو! ورنہ میں واپس بھاگ جاؤں گا۔" غنی کا انداز دھمکی آمیز تھا۔
"اب نہیں بھاگنے دوں گی۔ پکا انتظام کروں گی۔ نوراں آپا کو بلا رکھا ہے۔" بھابھی نے بھی جواباً "اسے دھمکایا۔
اسی پل اوپر سے آواز آئی تھی۔ بھابھی اٹھ کر اوپر والوں کی بات سننے چلی گئی تھیں۔ رخشندہ نے کچھ دیر غنی کے ہشاش بشاش چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر جھجکتے ہوئے بولی۔
"غنی! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"
"کرلوں گا شادی بھی' جلدی کیا ہے' کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہیں کہ میں نے تمہارے لیے جوگ لے رکھا ہے۔"
"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ خفگی سے اٹھنے لگی۔
"بیٹھو بتاتا ہوں۔" غنی نے سرعت سے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ "پیاری رخشی! میں سمجھتا ہوں تم کیا جاننا چاہتی ہو۔"
اصل میں بات یہ ہے کہ میں بڑا صاف گو بندہ ہوں۔ سیدھی اور سچی بات کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں شادی کے لیے ضرور پسند کیا تھا۔ کیونکہ تم میں جتنی خوبیاں تھیں۔ وہ میں اپنی ہونے والی بیوی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ہمارے نصیب نہیں ملے۔ میں کل بھی تمہاری عزت کرتا تھا اور ہمیشہ کرتا رہوں گا کیونکہ تم بہت اچھی ہو رخشی! میں تم سے محبت نہیں کرتا تھا یا فیلنگز تمہارے لیے کچھ خاص قسم کی نہیں تھیں۔ ہاں' میں تمہیں' تمہاری اچھی عادتوں کی وجہ سے آج بھی پسند کرتا ہوں۔"
غنی نے بہت ہلکے پھلکے لہجے میں وضاحت کر دی تھی۔ سو اس کا دل کچھ اور بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اور اب غنی اسے چھیڑنے اور چڑانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"ویسے لوگوں کو بھی بڑی بڑی خوش فہمیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔" اب غنی نے کئی دنوں تک اس کا ریکارڈ لگانا تھا مگر بھلا ہو حیام کا جو بیچ میں اسے لینے آ گیا تھا۔ اور رخشندہ اسی خوشی میں گم پھر اسی خاموش حویلی میں چلی آئی تھی۔ جس کی خاموشیاں جانے کس کے عذاب' خواب یا آنسو اور درد سمیٹے ہوئے اس اونچی چھتوں والے گھر کی دیواروں سے لپٹی تھیں۔ مگر رخشندہ کے لیے خوشی اس بات کی تھی کہ حیام اس کی طرف دھیرے دھیرے سے ہی سہی متوجہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے آپ سے ایک بات کہی تھی۔" رات کو چپکے سے دروازہ کھلا تھا اور کوئی بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ یہ ہیولا دھیرے دھیرے قریب آتا چلا گیا تھا اور پھر رخشندہ کے دائیں پہلو میں کسی ذی روح کے ہلکے سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ رخشندہ بغیر دیکھے بھی جانتی تھی کہ اس کے پہلو میں لیٹنے والا کون ہے۔ اس نے یوں ہی آنکھیں موندے موندے کروٹ لی تھی اور اپنا ہاتھ حیام کے بازو پر رکھ دیا۔
"کون سی بات؟" حیام اس کی طرف متوجہ تھا۔
"بھول گئے ہیں کیا؟" اب کے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔
"پھر بھی بتا دو۔" وہ اس کی طرف کروٹ لیے سرگوشی نما آواز میں بولا تھا۔
"لالہ والے مسئلے پر بات کی تھی۔ آپ سے۔"
"تمہیں لالہ کا بے ضرر وجود کیوں کھٹکتا ہے آخر؟" وہ دھیمی آواز میں بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔
"ایک بات تو آپ ذہن سے نکال دیں۔ لالہ کا وجود کم از کم میرے لیے بے ضرر نہیں ہو سکتا۔" وہ ناگواری سے بولی۔
"تم لالہ کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتیں؟" حیام بیزاری سے بولا۔
"آپ لالہ کے لیے کچھ اچھا نہیں سوچ سکتے؟" اس نے الٹا سوال داغ دیا۔
"کیا اچھا سوچوں؟"
"اس کی شادی کر دیں؟"
"کس سے؟ ہماری برادری میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں اور برادری سے باہر ہم لوگ رشتہ نہیں کرتے۔" حیام کے لہجے میں اب بھی خفگی نمایاں تھی۔ یعنی اسے لالہ کے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہیں تھا۔
"تو آپ ہی کر لیتے۔" رخشندہ چیخ کر بولی۔ "کیا کمی ہے لالہ میں۔۔۔ سارے لالہ کے باغ کا حسن تو سمیٹے ہوئے ہے۔"
"میں تو تیار تھا مگر۔۔۔" حیام کہتے کہتے ایک دم رک گیا اور رخشندہ گویا سر سے پیر تک چونک گئی تھی۔
"مگر کیا؟" وہ بے چینی سے بولی۔
"کچھ نہیں۔" حیام کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے غنودگی میں ہو۔ "لالہ کی بات نہ کرو' اپنی بات کرو' مجھے نیند آجاتی ہے۔"
"بتائیں نا۔" وہ اصرار کرتی رہی تھی مگر حیام کی چپ نہ ٹوٹی۔ وہ چہرہ تکیے پر رکھ کر اوندھا لیٹ گیا تھا۔
"جب ہماری بات نہیں کر سکتیں تو پھر کسی اور کی بات کیوں کرتی ہو۔" نیند میں ڈوبی ڈوبی آواز تھی۔
"نہیں کرتی۔ منہ سے خاکریں' اپنی بات کر لیتی ہوں۔" وہ مسلسل التجائیں کر رہی تھی۔ مگر حیام تکیے میں منہ دیے لیٹا رہا۔
"حیام! سو گئے ہیں کیا؟" وہ اس کا شانہ ہلا ہلا کر جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"حیام!۔۔۔" وہ پریشان ہو گئی۔ مگر جواب پھر بھی ندارد۔۔۔ صرف پندرہ منٹ میں وہ سو بھی چکا تھا یا پھر اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔
"حیام! آخر اتنی جلدی آپ کیسے سو گئے ہیں؟" وہ مسلسل بولے جا رہی تھی تاکہ حیام کی نیند ٹوٹ جائے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کچھ سوچنے پر رخشندہ کو خیال آیا تھا کہ اس کی آواز خاصی بھاری تھی۔ جیسے کوئی نیند میں اٹھ کر آجائے۔ کھویا کھویا سا' نیند میں دھت۔
"حیام!۔۔۔" اس کی آوازیں بھی حیام کی نیند توڑ نہیں پائی تھیں۔ "آخر مسئلہ کیا ہے؟ ابھی تو جاگ رہے تھے۔ کیا خفا ہو گئے ہیں؟" وہ مسلسل اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔
"حیام! میں رونے لگی ہوں۔" رخشندہ سچ مچ حواس باختہ سی رو پڑی۔ مگر دوسری طرف گویا کسی بات کا اثر ہی نہیں تھا۔ وہ خوف زدہ سی اٹھ کر صوفے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے وہ مسلسل قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا تھا کہ اسے حیام پر دم کرنا چاہیے۔ سو وہ زور و شور سے گھٹنے میں منہ دیے مختلف سورت مبارکہ کا ورد کرتی رہی۔ جب اس نے پھونک مارنے کی غرض سے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھایا تو اس کی گویا چیخ نکل گئی تھی۔
حیام اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ بالکل سیدھا' آنکھیں بند۔۔۔ ایک انداز سے چلتا ہوا۔ نیند میں

http://www.paklunplace.com

دھت۔

"یا اللہ خیر!" رخشہ مارے خوف کے تھرا اٹھی۔

"حیام! نیند میں چل رہے ہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھی بیٹھی چیخی تھی۔ مگر حیام نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہینڈل بھی ایک انداز سے گھمانا چاہا تھا مگر دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا اور رخشہ کی گویا چیخ نکل گئی۔

خوف کے مارے رخشہ کے حواس سلب ہو گئے تھے۔ اس کے جسم میں ذرہ بھر حرکت کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ خوف کے مارے اس کے ہونٹ تک نیلے ہو رہے تھے۔ مگر وہ کھلے دروازے سے باہر کے منظر کو دیکھنے سے خود کو روک نہیں پائی تھی۔

یہ دروازہ خود بخود نہیں کھلا تھا۔ بلکہ اسے کھولا گیا تھا' اور دروازہ کھولنے والی عورت کو دیکھ کر رخشہ کی چیخ نکل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے ایک بڑا ہی عجیب منظر دیکھا تھا' دروازے کے چوکھٹے میں لالہ رخسار کھڑی تھی۔ مکمل دلہن کے روپ میں سرخ بھڑکیلا اور بے انتہا قیمتی لہنگا پہنے ہوئے' اور یہ لہنگا' یہ عروسی لباس رخشہ کا تھا مگر لالہ کے پاس کیسے پہنچ گیا؟ زیورات' گہنے' اور پھولوں کے ہار' گجرے پہن کر لالہ مکمل طور پر دلہن بنی کھڑی تھی۔ یہ زیورات بھی رخشہ کے تھے۔ اور لالہ کے وجود سے اٹھنے والی پرفیوم کی خوشبو سے رخشہ کا کمرا بھر گیا تھا اور یہ "خوشبو" بھی رخشہ ہزاروں خوشبوؤں میں سے پہچان سکتی تھی' یہ گہنے' لباس اور یہ پرفیوم رخشہ کا تھا۔ اور انہیں چوری کرنے والی رخشہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔

"یعنی لالہ نے میرا سامان چوری کیا؟" پردہ تھا جو رخشہ کی نظر کے سامنے سے ہٹ گیا۔ لالہ بہت خوب صورت تھی اور رخشہ کے عروسی لباس نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ گلے میں ٹینٹ نما چادر کو لپیٹے پورا دن عبادت میں مشغول رہنے والی لالہ رات کے انتہائی پر خود کو سجا بنا کر کھڑی تھی؟ کیوں؟ کس لیے؟ یہ سارا ہار سنگھار کس لیے تھا؟ یہ صرف آج کی بات تھی یا پھر لالہ کا معمول ہی یہی تھا؟ بہت سے سوالیہ نشان تھے جو اس کے ارد گرد چکرا رہے تھے۔

جو بھی تھا مگر ایک بات روز روشن کی طرح سے عیاں ہو چکی تھی کہ رخشہ کی چیزیں صدیقہ نہیں بلکہ لالہ رخسار چراتی تھی۔

صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے لالہ کو حیام کا ہاتھ تھام کر واپس پلٹتے دیکھا تھا' لالہ' سہج سہج قدم اٹھاتی حیام کے کمرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ پھر اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد کچھ دیر کھڑی رہی۔ حیام خود بخود لیٹ گیا تو وہ فتح مندی کے احساس سے سرشار باہر نکل آئی تھی۔ اب وہ مرچیں جلا کر حیام کے دروازے کے ارد گرد دھونی دے رہی تھی۔ اتنی ناگوار بدبو تھی کہ رخشہ کے کھلے دروازے سے بھی اندر تک چلی آئی۔ مگر رخشہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر دروازہ ہی بند کر لیتی۔ اس کا ذہن ایک دم کسی غبار سے بھرنے لگا تھا۔ شاید مرچوں کی بدبو کا اثر تھا۔ لالہ کی خون رنگ آنکھوں کی ساری سرخی رخشہ کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اور وہ اس غبار کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی۔

صبح اس کی آنکھ حیام کے بہت زور سے پکارنے پر کھلی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ حیام کے لمس کو اپنے گالوں پر محسوس کر کے رخشہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"آپ۔" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"صوفے پر کیوں سو رہی ہو؟ بیڈ پر سوتیں نا۔" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ رخشہ لب بھینچے بہت دیر تک سوچتی رہی تھی۔ حیام یقیناً "رات کی ہر بات بھول چکا تھا۔ اور رخشہ کو اسی فکر اور اندیشے نے متوحش کر رکھا تھا کہ حیام کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے اور لالہ رخسار بھلا کیا چاہتی ہے؟ دن بھر بہروپ بھر کر ملنگوں جیسے حلیے میں پھرنا بھلا کیا معنی رکھتا تھا اور

رات کو چوری کیے گئے سامان سے ہار سنگھار کرنا۔ خصوصاً" حیام کے بارے میں تو وہ اور بھی فکر مند ہو رہی تھی۔ کیونکہ رات کو نیند کی حالت میں چلنا اور باتیں کرنا حیام کو یاد ہی نہیں رہتا تھا' اصل پریشان کن صورت حال ان دونوں کا رویہ تھا' خصوصاً" لالہ تو پورے ہوش و حواس میں نجانے کون کون سے ٹونے کرتی تھی۔ اور نجانے یہ بھی ان کی کوئی خاندانی روایت تھی کہ رات کو جاگ جاگ کر دیواروں پر پانی کے چھینٹے مارنا' کمرے کو جلانا' مرچوں کی دھونی دینا' اس وقت بھی بہت سوچ سمجھ کر رخشہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"رات کو آپ کہاں گئے تھے؟"

"میں اپنے کمرے میں تھا۔ شاید طبیعت کچھ بھاری تھی۔" حیام نے سادگی سے بتایا۔ وہ ابھی بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا' اور اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے نجانے کیا سوچ رہا تھا کہ رخشہ کی آواز پر چونک گیا۔

"مگر آپ تو میرے کمرے میں تھے؟" رخشہ نے سوچ سوچ کر کہا۔

"نہیں تو' میں اپنے کمرے میں تھا۔" حیام نے الجھ کر جواب دیا۔

"پہلے آپ یہاں تھے۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔"

"ایسے کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ میں اگر اٹھ کر یہاں سے جاتا تو مجھے کیا اتنی سی بات بھول جاتی تھی؟" حیام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا' رخشہ سوچ میں گم ہو گئی تھی کہ لالہ کا ذکر چھیڑے یا نہ چھیڑے۔ اور پھر اس نے لالہ کے خیال تک کو بھی ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

"آپ آج دفتر نہیں جائیں گے؟"

"جانا تو ہے مگر تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔" حیام کی نظریں اس کے پر سوچ چہرے اور تھکی تھکی آنکھوں پر تھیں۔

"بس ایسے ہی سستی فیل ہو رہی ہے۔ ذہن بھاری ہے۔"

"آپ کے لیے ناشتا لاؤں؟" وہ اٹھ کر چپل پہننے لگی۔

"ناشتا تو لالہ نے بنا لیا ہے۔ میں تمہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ فریش ہو کر باہر آ جاؤ۔ پھر اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں۔" حیام نرم لہجے میں بولتا ہوا کس قدر اپنا اپنا لگ رہا تھا' رات سے قطعاً" مختلف۔ کاش ہمیشہ ایسے ہی رہتا وہ۔ رخشہ نے تھکے تھکے ذہن سے سوچا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ہال کمرے میں آئی تو لالہ کی بڑی فریش فریش آواز سنائی دی۔

"تمہیں آج دیر ہو گئی حیام!"

"ہوں۔" حیام نے مختصر ہنکارا بھرا۔ رخشہ غیر محسوس انداز میں اس کے قریب بیٹھ گئی تھی اور لالہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔

"لالہ! میرے لیے بھی ناشتہ لاؤ۔" رخشہ اس کے تاثرات کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر بولی۔

"صدیقہ سے کہو' بنا دے۔ تمہارا ناشتہ ابھی نہیں بنا۔" لالہ نے نجانے کس دل سے جواب دیا تھا۔ رخشہ کو اس کے لہجے کی تلخی نے واضح مزا دیا تھا۔ لالہ رکھائی سے بولی۔ "آئندہ اپنا ناشتہ خود بنایا کرو۔"

"جی بہتر۔ میں اپنا اور حیام کا ناشتہ بنا لیا کروں گی۔" اس نے فوراً" فرماں برداری سے کہا تھا۔ اور لالہ اسے خوا مخواہ گھورنے لگی۔

"ابھی تو میرا کچن میں جانے کا موڈ نہیں ہو رہا اور صدیقہ بھی نہ جانے کہاں ہے؟" رخشہ بڑی سی کچن میں کھلنے والی کھڑکی سے جھانک کر بولی۔ "میں حیام کے ساتھ ناشتا شیئر کر لوں گی۔"

وہ جان بوجھ کر لالہ کو چڑا رہی تھی اور جب حیام آفس جانے لگا تو لالہ چپکے سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناً" دوسرے دروازے سے پورچ تک جانے کا ارادہ تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے رخشہ' حیام کے ہمراہ ہی گیراج تک چلی آئی تھی اور جب وہ مسکراتے ہوئے حیام کو خدا حافظ کہہ رہی تھی تب لالہ نے اس منظر کو

http://www.paklunplace.com

وحشت کے عالم میں دیکھا تھا اور پھر گویا پتھر ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات کہوں حیام!" رخشہ اپنے ہاتھوں اور چہرے کا مساج کر رہی تھی۔

"جی فرمایئے؟" وہ لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ آج وہ سر شام ہی اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اور رخشہ کو یہ تبدیلی بہت بھلی لگی تھی۔ یہ کیا بندہ چوروں کی طرح اپنے ہی کمرے میں جانے کے لیے رات گہری ہونے کا انتظار کرے۔

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ میری بات پر آپ کو کتنا یقین آئے گا؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ چونکا۔

"بتائیں نا' آپ میری بات پر کتنا یقین کرتے ہیں؟" رخشہ نے اصرار کیا۔

"کچھ وضاحت کرو گی تو پتا چلے گا۔"

"اچھا چھوڑیں اسے' فی الحال اس بات کو رہنے دیں' یہ بتائیں آپ کو کچھ کہوں' مطلب آپ کی ذات کے حوالے سے' آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟"

"نہیں' برا کیوں لگے گا' مگر آپ فرمانا کیا چاہتی ہیں؟" حیام بھی پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"پہلے بتائیں' آپ غصہ تو نہیں کریں گے۔"

"نہیں یار!" وہ زچ ہو اٹھا تھا' "تمہیں جو بات کہنا ہے کہہ دو۔"

اس کی سوچیں اس وقت بھی منتشر تھیں' یہ یقین تو ہرگز بھی نہیں تھا کہ اس قدر اپنائیت سے بات کرنے والا حیام رات تک اسی موڈ میں رہے گا۔ حالانکہ مہینے کی آخر راتوں سے تو رخشہ بے حد خوف زدہ رہنے لگی تھی' جب لالہ کی آنکھیں بھی لال بوٹی ہو جاتی تھیں۔ اور گھر میں بھی ہر طرف ہواں سا پھیلنے لگتا اور سب سے بڑی بات حیام کی ذہنی رو بہک جاتی تھی۔ عجیب گم صم سی کیفیت میں باتیں کرنے لگتا' تب رخشہ کا دل اس گھر سے بھاگ جانے کو چاہتا۔

"ارے' کہاں گم ہو گئیں؟" حیام نے اسے ٹھوکا دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سوچوں کو جھٹک کر حیام کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"حیام! میرا ذہن سوچ سوچ کر تھکنے لگا ہے' مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتی۔" وہ بے قراری سے بولتی چلی گئی۔

"خواہ مخواہ خود کو مت الجھاؤ' جتنا سوچو گی خود کو اتنا ہی پریشان کرو گی۔"

"مجھے آپ کا راتوں کو اٹھ کر چلنا اور بولنا وحشت زدہ کرتا ہے حیام! آپ بالکل بھی نارمل ری ایکٹ نہیں کرتے۔ آپ کو یاد نہیں ہے۔ رات کو آپ یہاں سوئے تھے' مگر پھر خود ہی اٹھ کر چلے بھی گئے اور صبح آپ کو یاد بھی نہیں رہتا' آپ کو نہیں لگتا آپ کے ساتھ کوئی سائیکی پرابلم ہے۔" جھجکتے ہوئے رخشہ نے کہہ ہی دیا تھا۔

"پہلے تو نہیں' البتہ اب مجھے بھی یہ ہی محسوس ہونے لگا ہے۔" حیام نے بھی گویا تسلیم کر لیا تھا۔ "میں خود کو اعصابی دباؤ کا شکار محسوس کرنے لگا ہوں۔ ہم دونوں کی فیلنگز ایک ہیں' مگر یہ فیلنگز ایسی ہیں کہ ہم دونوں ہی ان محسوسات کی وضاحت نہیں کر پا رہے' کچھ تو ہے جو غیر واضح اور مبہم ہے' انوکھا اور اچھوتا ہے' کچھ تو ہے' جو ہمارے ذہن میں کھل کر روشن نہیں ہو پا رہا ہے۔"

وہ پہلی مرتبہ دھیرے دھیرے اس پر کھل رہا تھا۔ یعنی چونکتا تو وہ بھی تھا' مگر رخشہ کی طرح کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا اور رخشہ اگرچہ بہت کچھ سمجھ رہی تھی' مگر فی الحال کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی' وہ بہت صبر اور تحمل کے ساتھ پردے میں چھپی غیر واضح چیزوں کے عیاں ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

"میرا ذہن سویا سویا رہتا ہے' میں کئی کئی گھنٹے کی نیند لینے کے باوجود خود کو سویا ہی سمجھتا ہوں' یوں لگتا ہے کہ جاگنے کی وجہ سے میری نیند پوری نہیں ہو رہی۔" وہ الجھے الجھے انداز میں کہہ رہا تھا اور رخشہ بہت دھیان سے اس کے تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے حیام کے سامنے ایک حل پیش کر دیا تھا' جسے اس نے پس و پیش کے بغیر ہی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

"میں کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کروں آپ کے لیے؟"

"میں خود دیکھ لوں گا' کسی کے ساتھ کانٹیکٹ کرتا ہوں۔" حیام نے پرسوچ انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

"اگر آپ کہیں تو غنی سے بات کر لوں؟ وہ بلا کا مسخرا اور خوش مزاج ماہر نفسیات ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ ایک اچھا معالج ثابت ہو گا۔ فی الحال وہ پاکستان میں ہی ہے' ابھی واپسی کا ارادہ نہیں۔ میرا خیال ہے غنی یہاں آکر رہے' اور پھر کچھ ٹریٹمنٹ بھی دے۔ اس کا مشاہدہ' علم اور سمجھ بوجھ بہت وسیع ہے۔ وہ یقیناً ہماری مدد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

رخشہ پرجوش سی بولتی چلی گئی تھی۔ غنی سے اس کی خاصی بے تکلفی اور دوستی تھی اور رخشہ اس لیے پُریقین تھی کہ وہ ہر بات کھل کر غنی سے کر سکتی تھی۔ حیام نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ یعنی وہ رضامند تھا۔ اور رخشہ اور بھی پُرامید ہو گئی تھی۔ وہ تو اسی سوچ میں خاصا وقت ضائع کر چکی تھی کہ سائیکاٹرسٹ کا مشورہ کہیں حیام کو برا نہ لگے' وہ غصہ نہ کر جائے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ حیام اتنی آسانی سے خود بخود مان جائے گا۔ مگر یہ یقین تھا کہ غنی اس کی بے شمار پراہلمز حل کر دے گا۔ اور اسی یقین کے بل بوتے پر اس نے غنی کو فون کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پھوپھو! یہ آپ نے میرے لیے پراٹھا بنایا ہے؟" صدمے سے ٹوٹی پھوٹی یہ آواز زرگون غنی کی تھی۔ وہ اسٹول پر بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا۔ مگر نظریں ہنوز میز پر رکھی پلیٹ پر مرکوز تھیں۔ ادھ جلا سا کچا پکا پراٹھا غنی کی نخریلی طبیعت کی وجہ سے ابھی تک ان چھوا رکھا تھا۔

"تو اور کیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھو۔" نوشابہ پہلے ہی شدید گرمی کی وجہ سے تپی ہوئی تھیں۔ اوپر سے لاڈلے بھتیجے کے نخرے اللہ کی پناہ! انہیں تو رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ احمق لڑکی محض حسد اور کمینگی کے باعث ہاتھ سے نکل دی ہے۔ رخشہ ہی تھی جو نہ صرف ان کا کچن سنبھالے ہوئے تھی بلکہ غنی کی فرمائشوں کو بھی بڑے ہی تحمل سے پورا کر دیا کرتی تھی۔ جبکہ نوشابہ تو ایک ہفتے میں ہی غنی کی نکتہ چیں طبیعت سے گھبرا اٹھی تھیں۔ اب تو صرف اور صرف پچھتاوا تھا جو ہاتھ ملنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ اگر غنی کی رخشہ سے شادی ہو جاتی تو پھر غنی نے آئرلینڈ جانے کے بجائے اپنا کلینک یہیں سیٹ کر لینا تھا اور راحیل نے غنی کو الگ تو نہیں رہنے دینا تھا' ساتھ رہنے سے رخشہ نے گھر بار تو سنبھالے رکھنا تھا۔ اور وہ پھر سے گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتیں۔ مگر ہائے افسوس۔ اب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

پچھلے ہفتے رخشہ تین چار گھنٹوں کے لیے آئی تھی اور تین چار سالن بنا کر فریز کر گئی تھی۔ مگر اس غنی خبیث کو نجانے کیسے خبر ہو گئی۔ نوشابہ کی کاہلی اور سستی کا اس نے ریکارڈ لگا دیا تھا۔ اس وقت بھی پراٹھے کا ایکسرے کرنے کے بعد اور ہر زاویے سے جائزہ لے کر اس نے پلیٹ پرے کھسکا دی۔

"آپ چاہتی ہیں۔ میں عین جوانی کی بہاروں میں اس دنیا کو گڈ بائے کہہ دوں' میں یہ ٹیڑھا میڑھا اور خوب موٹا سا پراٹھا نہیں کھا سکتا۔"

"تو نہ کھاؤ' بھوکے رہو۔" وہ پسینے سے تر پیشانی پونچھ کر دھپ سے اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

"اس عمر میں باورچی خانے میں کھپنا پڑتا ہے۔ رخشہ اور لائبہ بھی چلی گئیں۔ خیر بیٹیوں کو اپنے گھروں میں جانا ہی ہوتا ہے۔ تم ہی کوئی ہاتھ پیر ہلا لو۔" انہوں نے منہ پھلا کر بیٹھے غنی کو گھور کر دیکھا۔

"میں تو کب سے ہاتھ پیر ہلا رہا ہوں۔ مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بیل بجا بجا کر انگلیاں تھک گئی ہیں۔ اور ٹانگیں جھلا جھلا کر پیر ٹوٹ گئے۔ اور سامنے

http://www.paktunplace.com

کیا آیا کچا پکا۔ رہ اٹھا۔" وہ ان کی بات اچھی طرح سمجھنے کے باوجود گھما گیا تھا۔

"غنی! میری جان کیوں ستاتے ہو؟ اگر کوئی لڑکی تمہاری نظر میں ہے تو بتادو۔ میری پسند کی ہوئی تو لڑکی تمہیں بھاتی نہیں۔" نوشابہ نے دکھتی ٹانگوں پر ہاتھ رکھے عاجزی سے التجا کی تھی۔

"جو نظر میں تھی اسے آگے چلتا کر دیا ہے۔ اب میں بھلا کس کس لڑکی کو تاڑتا پھروں؟" غنی فریج میں سے جوس کا ڈبا نکال کر گلاس بھرنے لگا۔ "اللہ کی قسم! کیا ذائقہ تھا رخشہ کے ہاتھ میں۔"

"اچھا ہوا، تم اس کے متھے نہیں لگے۔ بے چاری کی اگلی زندگی بھی باورچی خانے میں گزر جاتی تھی۔" نوشابہ نے بے ساختہ سچ بول دیا تھا اور غنی کو گویا کھانسی آگئی۔

"آپ نے ٹھیک کہا پھوپھو! پچھلی اور اگلی زندگی اس کی کچن میں ہی گزرنی تھی۔" غنی نے پچھلی زندگی پر خاصا زور دے کر کہا تھا، تب ہی تو نوشابہ جز بز ہو گئیں۔

"تم نا مجھ سے پٹ کر رہو گے غنی!" نوشابہ نے اس کے کندھے پر زوردار دھپ لگائی۔

"خالی پیٹ مارتی رہیں بے چارے یتیم بھتیجے کو۔" غنی نے پھولے منہ سے ایک دفعہ پھر پراٹھے کو دیکھا اور نظر چرائی۔

"غنی! کچھ میری حالت پر بھی ترس کھاؤ۔" نوشابہ رو دینے کو ہو گئیں۔ "یہ تیسرا پراٹھا بنایا ہے تمہارے لیے جو تمہیں پسند نہیں آیا۔"

"منہ کو کوکنگ میں ایکسپرٹ کرنے کے بجائے کبھی خود بھی ہاتھ ہلا لیتا تھا نا۔" غنی نے شرارتی لہجے میں کہا۔ "سارا وقت بے چاری کو چولہے میں جھونکے رکھتی تھیں۔ اس نے تو شکر کیا ہو گا یہاں سے گئی ہے۔ سوا لاکھ آیت کریمہ پڑھا ہو گا۔" غنی کی زبان پھسل پھسل جا رہی تھی۔

"اب ایسی بھی بات نہیں۔" وہ پھر سے جز بز ہوئیں۔

"ضرور ایسی بات ہوگی۔ ویسے میں نے سنا ہے، رخشہ کی ایک پھوپھی ساس اور ان کی ہٹلر ٹائپ پراسرار قسم کی بیٹی بھی موجود ہے، بے چاری رخشہ کو کچن کی نذر کر دیا ہو گا انہوں نے۔"

"نہیں تو۔" نوشابہ "فوراً" پرجوش ہو گئیں۔ "مہارانیوں کی طرح رہتی ہے رخشہ وہاں، کام نہ کاج، سارا دن فراغت میں گزرتا ہے۔ اتنی بڑی گدی کے وارث ہیں وہ لوگ، اتنی جاگیریں اور زمینیں ہیں، روپے پیسے کی کمی نہیں، ایک ملازمہ چوبیس گھنٹے خدمت کے لیے موجود رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو رخشہ کے لیے نوراں آپا نے بڑا اچھا رشتہ بتایا تھا۔ بڑے اچھے لوگ ہیں، باوقار، وضع دار۔"

"کبھی ان باوقار، وضع دار لوگوں سے میری بھی ملاقات کروا دیجیے، رخشہ کی پھوپھی ساس سے اپنے لیے دعا کروا لوں گا۔" غنی نے ہنسی چھپا کر سنجیدگی سے کہا تھا۔

"واقعی، کروا لینا۔ کوئی لڑکی تمہیں پسند آہی جائے۔ ویسے دونوں ماں بیٹی پردہ کرتی ہیں۔ میری تو رخشہ کی شادی کے بعد ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی ان سے۔ بس لالہ ایک دفعہ دکھائی دی تھی۔ [illegible] ہے، ماں بیٹی دونوں کی صورت شکل میں بڑا فرق ہے۔ ایسی موہنی صورت ہے لالہ کی۔ میرا تو دل [illegible] لگا تھا۔ ویسے اگر تم لالہ کو دیکھ لو تو [illegible]" کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ بھلا [illegible] ہو سکتا تھا۔ وہ سید خاندان کی لڑکی [illegible] خاندان [illegible] بیٹی کا رشتہ کرنا وہ لوگ کسی [illegible] نہیں سمجھتے۔ اس معاملے میں انتہا کے [illegible] تھے۔ پھر اس قسم کی سوچ رکھنا بھی بڑی حماقت تھی۔ نوشابہ نے سر جھٹک کر [illegible]

"آپ کچھ فرما رہی تھیں؟" غنی جتنا لاپروا نظر آتا تھا، اتنا لاپروا تھا نہیں۔ نوشابہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"مطلب کی بات خوب سمجھ لیتے ہو۔"

"دراصل لفظ خوب صورتی میں دل تھوڑا سا اٹک گیا ہے۔ موہنی صورت، بلا کی خوب صورت۔" وہ

چہک کر مزے سے بولا۔

"فضول مت بکو۔ وہ لوگ پردے کے خاصے پابند ہیں۔" نوشابہ سنجیدہ ہو چکی تھیں۔

"اور میں کون سا محترمہ لالہ رخسار کو ڈیٹ پر لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"توبہ کرو۔" نوشابہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"مگر میں ان کے دربار اقدس پر حاضری دینے ضرور جاؤں گا۔" اس نے خود سے گویا عہد کیا۔

"چلے جانا۔ ہزاروں لوگ وہاں جاتے ہیں۔ ذرا رخشہ کا گھر بار بھی دیکھ کر آنا۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔ سنا ہے اٹھائیس کمرے ہیں۔ اور لوگ ہیں صرف گنتی کے۔ یعنی [illegible] ایک [illegible] سے خاموشی ایسی کہ دل گھبرا اٹھے۔ [illegible] رخشہ بے چاری کیسے رہ لیتی ہے۔ [illegible] سے اٹھ کر سناٹوں میں جا کر رہنا [illegible] ناممکن بھی ہے۔ مگر شان و شوکت بھی تو کمال کی ہے۔ رخشہ کا نصیب بڑا اونچا ہے۔" [illegible] دل ہی دل میں نوشابہ، خیام کے حسب نسب [illegible] متاثر تھیں۔

"تو پھر کسی دن چلیں گے پیر صاحب کے دربار پر حاضری دینے۔ خیام سے بھی بڑے دن ہوئے ہیں ملاقات نہیں ہو سکی۔" غنی نے "فوراً" ہی پروگرام بھی ترتیب دے لیا تھا۔ مگر رخشہ کا خود بخود فون آ گیا۔

☆ ☆ ☆

اتفاق سے فون غنی نے اٹینڈ کیا تھا۔ اور رخشہ کے گویا من کی مراد بر آئی تھی۔

"شکر ہے غنی! تم مل گئے۔" غیر متوقع غنی کی آواز سن کر رخشہ کھل اٹھی تھی۔

"میں کیا گم ہو گیا تھا رخشی؟" وہ غنی ہی کیا جو سیدھے سوال کا صحیح جواب دے۔

"ویسے آپ کو آج بہت یاد فرما رہے تھے ہم لوگ۔"

"بھابھی ہیں کہاں؟" رخشہ نے پوچھا۔

"وزٹ پر نکل گئی ہیں۔"

"تم۔ تم فارغ ہو غنی؟" رخشہ نے بھابھی کی غیر موجودگی کے بارے میں [illegible] کر کے دھیمے سے پوچھا۔

"ابھی تو فارغ [illegible] ہیں، کچھ کام ہے؟"

"تم [illegible] آؤ گے؟" وہ سوچتے ہوئے بول رہی تھی [illegible] وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ غنی سے خیام [illegible] کس طرح سے بات کرے۔ اسی الجھن میں وہ غیر ارادی طور پر بولے جا رہی تھی۔

"کیوں، تم نے مجھے ایئرپورٹ پر سی آف کرنے جانا ہے۔"

"پلیز غنی!" وہ زچ ہو گئی۔

"اچھا، وہ بات کرو جس کے لیے فون کیا ہے۔" غنی نے نرمی سے پچکارتے ہوئے کہا تھا، یعنی وہ جانتا تھا کہ رخشہ اسے بغیر وجہ کے فون نہیں کر سکتی۔

"دراصل غنی مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔" وہ اپنے لہجے کی پریشانی چھپاتے ہوئے بولی۔

"کوئی پرابلم ہے رخشی!" غنی نے نرمی سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے لہجے کی پریشانی محسوس کر چکا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔"

"او کے میں چکر لگاؤں گا۔ پھوپھو بھی آئیں گی میرے ساتھ۔"

"نہیں غنی! تم اکیلے آنا پلیز!" رخشہ نے بے ساختہ کہا، اب کے وہ کچھ چونک گیا تھا۔

"او کے جناب! کوئی اور حکم۔" وہ انکساری سے بولا۔

"اور بس، ضرور آنا، ٹھیک ہے نا۔" رخشہ نے پھر سے یاددہانی والے انداز میں کہا تھا۔ اور پھر فون رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

رخشہ نیل پالش لگا رہی تھی جب دروازہ کھول کر خیام اندر داخل ہوا۔ خلاف توقع وہ آج جلدی گھر آ گیا تھا۔ سو رخشہ کو بھی کچھ تشویش ہونے لگی۔

"خیریت تو ہے؟" وہ فی الفور اپنا مشغلہ ترک کر کے خیام کے پاس چلی آئی۔

"بالکل خیریت ہے۔" حیام ٹائی کی ناٹ کھول کر صوفے پر ڈھے گیا۔

"آج آپ جلدی آگئے ہیں؟" رخشندہ نے کارپٹ پر بیٹھ کر حیام کے جوتے اتارے تھے۔ کوٹ اور فائلوں والا بیگ الماری میں رکھا۔

"ہوں۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھے ہوئے تھا' یعنی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر وہ خود کو بشاش ظاہر کر رہا تھا' رخشندہ کچھ پریشان ہو گئی۔

"حیام! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بس ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کر شرٹ اتارنے لگا تھا۔ پھر اس نے ریموٹ اٹھا کر اے سی آن کر لیا۔ "بہت گرمی لگ رہی ہے۔ اسکوائش بنا کر لاؤ۔" وہ اٹھ کر واش روم میں چلا گیا تھا۔

رخشندہ فوراً" سرہلا کر کچن میں آگئی تھی مگر کچن میں پہلے سے ہی لالہ موجود تھی۔ اور عجیب حلق میں چبھنے والی بدبو بھی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی نجانے آج لالہ نے کیا جلایا تھا۔ تعویذ یا پھر کوئی اور چیز عسر سوختہ وغیرہ۔"

"کیا چاہیے؟" لالہ بغیر اس کی طرف دیکھے پوچھ رہی تھی۔

"اسکوائش" اس نے جگ میں پانی ڈالا تھا۔ اور چینی کا ڈبہ اٹھایا۔

"حیام اسکوائش نہیں پیے گا۔" لالہ نجانے سفید میدے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں کیوں بنا رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی مگر بلاشبہ مخاطب رخشندہ ہی سے تھی۔

"انہوں نے مجھے خود اسکوائش بنانے کے لیے کہا ہے۔" رخشندہ نے ڈبے کا ڈھکن کھول کر چینی گھولنا شروع کر دی تھی۔ مگر لالہ کی آواز نے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو پل بھر کے لیے روک دیا۔

"مگر اب وہ اسکوائش نہیں پیے گا بلکہ چائے پیے گا اور ساتھ یہ میٹھی گولیاں کھائے گا۔" لالہ نے کڑاہی میں تیل ڈال کر وہ چھوٹی چھوٹی گولیاں فرائی کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایک چولہے پر چائے کا پانی جوش کھا رہا تھا۔

"حیام چائے نہیں' بلکہ اسکوائش پییں گے۔ تم اتنا تردد نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔" رخشندہ نے انتہائی کڑوے لہجے میں کہا تھا۔ دراصل جب سے اس نے لالہ کو اپنا عروسی لباس پہنے دیکھا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ اس کا سامان کسی اور نے نہیں بلکہ لالہ نے چرایا تھا۔ تب سے ہی اسے لالہ سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اوپر سے اس کے حیام پر حق جتانے والے انداز رخشندہ کو آگ بگولہ کر دیتے تھے۔

"میں نے کہا نا میری جان! حیام چائے پیے گا صرف اور صرف چائے۔" لالہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ لالہ!" رخشندہ سلگتے دل کو تھپکتے اور صبر کا درس دیتے ہوئے بڑے ترش مگر دھیمے لہجے میں بولی تھی۔ اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔ غیر ارادی طور پر وہ جگ میں چمچہ ہلائے جا رہی تھی۔

"پوچھ لو' ایک کی بجائے کئی باتیں پوچھ لو۔" اس نے گویا رخشندہ کی ہنسی اڑائی تھی۔

"تم آخر چاہتی کیا ہو لالہ؟"

"میں کیا چاہتی ہوں؟ بہت جلد تم پر واضح ہو جائے گا۔ ابھی تم اپنا کام کرو اور جاؤ۔" لالہ ایک دفعہ پھر کٹھور بنی کھڑی تھی۔

"تم کیا چیز ہو لالہ! تم دن میں کچھ ہوتی ہو اور رات میں کچھ اور ہوتی ہو۔ تمہارا اصل چہرہ کون سا ہے؟" غصے اور نفرت کے احساس نے رخشندہ کی آنکھوں کو لہو رنگ کر دیا تھا۔

"میں ایک دن اور تمہارا خون چوس لوں گی۔" لالہ زہر خند ہوئی تھی اور پھر کڑاہی میں ایک ساتھ ساری گولیاں ڈال کر پلٹی تھی مگر اس کی بات سنے بغیر رخشندہ جگ اور گلاس اٹھا کر باہر نکل چکی تھی۔ لالہ نے بھی محض تین سیکنڈ بعد اس کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ اور جب وہ بغیر دستک دیے ان کے کمرے میں ٹرے ہاتھ میں پکڑے داخل ہو رہی تھی۔ تب اس نے حیام کو کہتے سنا۔

"یہ کون مرچوں کو سلگا رہا ہے۔ عجیب بو ہے جو میری ناک میں گھس کر دماغ کو چڑھ رہی ہے۔" حیام کی آنکھوں کی سرخیاں مرچوں کی اوپری جلد کے ہم رنگ ہو رہی تھیں۔ حیام اس بو کو محسوس کرتے ساتھ ہی غصے سے بپھرنے لگا تھا۔

"یہ کیسی بو ہے؟ کیوں مرچوں کو تیلی لگا کر آئی ہو؟" وہ غصے کے عالم میں رخشندہ پر چڑھ دوڑا۔

"حیام! میں نے کوئی مرچیں نہیں جلائیں۔" رخشندہ اس کے تیور دیکھ کر گھبرا گئی۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔" وہ غصے سے پھنکارتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا تب اس کی نظر لالہ کے چہرے سے ٹکرائی تھی جو فتح مندی کے احساس سے مسکرائے جا رہی تھی۔ مگر رخشندہ بھی نہیں۔ ہاتھ میں ٹرے تھی جسے دیکھ کر وہ سمجھ گئی۔

"لالہ تمہیں کوئی اسمیل آ رہی ہے؟" وہ لالہ سے گویا تائید چاہ رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے۔ رخشندہ نے نظر اتارنے کے بعد مرچوں کو کوئلوں پر پھینک دیا ہو گا۔" لالہ اتنے یقین بھرے انداز میں کہہ رہی تھی کہ حیام کو سچ مچ گمان ہونے لگا تھا کہ واقعی رخشندہ نے ہی مرچوں کو دہکتے کوئلوں پر پھینکا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ رخشندہ! تم جانتی نہیں ہو کہ مرچوں کی ناگوار بو میرے دماغ کو چڑھ جاتی ہے' میرا دل بری طرح سے گھبرانے لگا ہے۔" وہ غصے کے مارے رخشندہ کو خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا۔ جبکہ لالہ بازی کو اپنے حق میں جاتا دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

"یہ اسکوائش پی لیں حیام! گھبراہٹ کم ہو جائے گی۔" وہ گلاس میں اسکوائش ڈالے جلدی سے حیام کے قریب آ کر بولی تھی۔ مگر حیام نے گلاس پکڑ کر دیوار سے دے مارا تھا۔

"یہ زہر کیوں بنا کر لائی ہو؟" وہ دھاڑ کر بولا۔

"آپ نے خود کہا تھا۔" رخشندہ خوف کے مارے کپکپا کر رہ گئی۔ اسے پورا یقین تھا کہ لالہ کے سلگائے تعویذ اپنا اثر دکھا گئے تھے۔ اور اسے ایک بات تو سمجھ میں آگئی تھی کہ حیام کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ جادو ٹونے کا اثر تھا۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ میں نے کب کہا تھا۔" اسے رخشندہ کی ہر بات اب الٹی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ رخشندہ اس صورت حال کو دیکھ کر سخت پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ کو کیا چاہیے؟ میں وہی چیز بنا لاتی ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔" وہ دھاڑ کر بولا۔

"حیام! چائے پیو گے؟" وہ مکار' ڈرامے باز عورت بہروپ بھرے کھڑی تھی۔ "میں تمہارے لیے چائے لائی ہوں۔" وہ سج سج قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی تھی۔

"میرے سر میں بہت درد ہے لالہ!" حیام دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی لال بوٹی آنکھوں پر بازو رکھ لیے تھے۔

"یہ چائے پی لو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ دھیمے سے مسکرائی تھی' بڑی طنزیہ قسم کی مسکراہٹ تھی۔ رخشندہ کا انگ انگ سلگ اٹھا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں رخشندہ کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ اور اس نے سوچ لیا تھا کہ کم از کم یہ چائے حیام کو ہرگز پینے نہیں دے گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ سو اس نے اپنی اس سوچ کو یوں عملی جامہ پہنایا تھا کہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی لالہ سے اس طرح ٹکرائی تھی کہ لالہ ٹرے سنبھال نہیں سکی اور چائے سمیت ٹرے زمین پر گر گئی تھی۔ یہ سب اس قدر غیر ارادی اور اچانک ہوا تھا کہ حیام تک بھی چونک نہیں سکا۔ ویسے بھی حیام دھیرے دھیرے ہی سہی اس دھوئیں کی بو سے آزاد ہو رہا تھا۔ یعنی مرچوں کے اس دھوئیں کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہو رہا تھا۔ اور حیام خود کو ایک شکنجے میں سے نکلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اور جب فرش سے اٹھ کر بپھری ہوئی لالہ' رخشندہ تک آئی تو حیام گویا نیند سے جاگ اٹھا۔

http://www.pakrumplace.com

"تم نے مجھے دھکا دیا۔ تم نے ساری چائے گرادی۔" لالہ کسی زخمی شیرنی کی طرح پھنکار رہی تھی جب حیام ایکدم اس کے قریب چلا آیا۔

"لالہ! کیا ہوا ہے؟"

"اس نے مجھے دھکا دیا ہے۔" لالہ نے ایک دم دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔ "اس نے مجھے گرایا ہے۔" لالہ کا یہ رونا دھونا "عمل" کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے تھا۔

"نہیں لالہ! رخشہ نے تمہیں دھکا نہیں دیا۔ تم ٹرے سنبھال نہیں سکیں۔" وہ ایک دم رخشہ کی ڈھال بن گیا تھا۔ اور رخشہ کو لگا تھا گویا ایک طوفان کا رخ حیام نے اپنی طرف موڑ لیا ہے۔

"تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گی کمینی!" لالہ کا فشار خون ایک دم بلند ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوبصورت بلا کے روپ میں کھڑی تھی۔ ایسی حسین بلا جس کے منہ کو انسانی خون لگ گیا تھا۔

"لالہ۔" وہ رخشہ پر جھپٹنا چاہتی تھی جب حیام کی دھاڑ نما آواز نے لالہ کے قدموں تلے سے زمین کو کھسکا دیا تھا۔

"لالہ تم پاگل ہو چکی ہو اور ہم دونوں کو بھی پاگل کر دینا چاہتی ہو۔ اللہ کا واسطہ تمہیں نکل آؤ اس پاگل پن کے قیر سے۔ مت خود کو اذیت کی بھٹی میں جھونکو اور نہ ہماری زندگیوں کو جہنم کدہ بناؤ۔" حیام کے الفاظ نے لالہ رخسار کو انگارہ بنا دیا تھا۔ جلتا بلتا سلگتا انگارہ۔

☼ ☼ ☼

"حیام! ایک بات کہوں۔" وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی لان میں آگئی تھی۔ دراصل اس نے دریچے میں سے حیام کو لان میں بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ چونکہ اس وقت بھی صدیقہ سمیت سب حجرہ نشین تھے سو وہ مطمئن سی باہر نکل آئی۔ حیام اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

"تم یہاں؟"

"کیوں میں یہاں نہیں آسکتی۔" وہ لاڈ سے جتا کر بولتی ہوئی حیام کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کوئی کام تھا تو مجھے بلوالیتیں۔"

"میں بغیر کام کے آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتی؟" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"کر سکتی ہو۔ بالکل کر سکتی ہو۔ مگر یوں باغ میں تمہارا آنا مناسب نہیں۔" اس نے اخبار کو لپیٹ کر میز پر رکھ دیا۔

"کبھی اس مناسب اور غیر مناسب کے چکر میں سے نکل بھی آیا کریں۔" رخشہ کا منہ کڑوا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے جی! آپ کی بات مان لیتے ہیں۔" حیام دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔ اور اس کا موڈ خوشگوار دیکھ کر رخشہ نے پہلی مرتبہ فرمائش کرنے کا سوچا تھا۔ حالانکہ وہ پر امید نہیں تھی کہ اس کی اس خواہش کو حیام "فوراً" پورا کر دے گا۔ مگر وہ خلاف توقع "فوراً" مان گیا تھا۔ گویا وہ بھی اس ماحول سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"تم چادر لے آؤ۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

"کیا ہم سچ مچ لانگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں؟" رخشہ ابھی تک بے یقین تھی۔

"تو اور کیا۔ خود ہی تو تم جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ اب اگر تمہاری پہلی فرمائش بھی پوری نہ کی تو خواہ مخواہ طعنے مارتی رہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے سچ مچ گاڑی گیراج میں سے نکالنے چلا گیا تھا۔ اور جب وہ چادر لے کر باہر نکل رہی تھی تب لالہ اچانک اپنے حجرے میں سے نکل آئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" عموماً ان دونوں میں بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر اپنے مطلب کی بات پوچھنے کے لیے لالہ خود۔ خود اس سے مخاطب ہو جاتی تھی۔

"کہیں نہیں۔" رخشہ نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ورنہ لالہ کی تفتیش کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا تھا۔

"اماں جی سے پوچھا ہے؟" لالہ کے لہجے میں واضح چبھن تھی۔

"نہیں۔"

"کیوں نہیں پوچھا؟" وہ ترخ کر بولی۔

"اماں جی اس وقت آرام کرتی ہیں۔ میں نے انہیں بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" رخشہ نے دل پر پتھر رکھ کر وضاحت کی۔

"میں تمہیں اماں جی کی اجازت کے بغیر جانے نہیں دوں گی۔"

"میں اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں اور اس کی اجازت کے علاوہ مجھے کسی اور کی اجازت درکار نہیں۔"

"حیام کی یہ جرأت؟" لالہ غصے سے پھنکار کر رہ گئی۔ "تم اندر چلو میں حیام کو بھی دیکھ لیتی ہوں۔"

"میں کیوں اندر چلوں میں تمہارے حکم کی پابند نہیں۔ یہ تحکمانہ لہجہ صرف صدیقہ کے لیے استعمال کیا کرو۔" رخشہ نے انتہائی کاٹ دار لہجے میں جواب دیا تھا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے تھے۔ اس نے مڑ کر لالہ کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب وہ گاڑی میں آکر بیٹھ چکی تو حیام نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"میچنگ جوتے نہیں مل رہے تھے۔" اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا گفتگو اگر لالہ کی طرف مڑ جاتی تو اس کا باہر نکلنا ہی فضول تھا وہ اپنے چہرے کے تاثرات بھی نارمل کر چکی تھی۔ حیام بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"حیام! آپ مجھے ایک بات بتائیں۔" کچھ دیر بعد رخشہ کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے بولی تھی۔

"پوچھیے؟" حیام دلار سے بولا۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" وہ بغیر جھجکے پوچھ رہی تھی۔ بالکل صاف اور سیدھے انداز میں۔

"ہاں!" حیام نے بھی بے ساختہ کہا۔

"کب سے؟"

"نکاح والے روز سے۔" وہ سچ کہہ رہا تھا۔ "یہ بندھن ہی ایسا ہے۔ محبت نہ بھی ہو تو انسیت ضرور ہو جاتی ہے۔ دراصل یہی انسیت 'اپنائیت' پھر محبت میں بدل جاتی ہے۔"

"آپ نے کبھی اظہار تو نہیں کیا؟"

"کیا مطلب؟" وہ بہت دھیان سے مگر تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گاڑی اب شہری حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

"اس محبت کا جو آپ مجھ سے کرتے ہیں؟"

"پتا ہے رخشہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس محبت کا اظہار بھی کرنا چاہتا ہوں مگر نجانے کیا چیز ہے ایسی جو میرے تمہاری طرف مائل شدہ دل کو پلٹانا چاہتی ہے۔ موڑ دینا چاہتی ہے۔ یا پھر اس محبت کو اکھاڑ دینا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی میں خود بھی اپنی ذہنی اور دلی کیفیات سمجھ نہیں پاتا ہوں۔"

وہ بہت دھیمی اور آہستہ آواز میں بول رہا تھا گویا خود سے بات کر رہا ہو۔ انداز بھی کھویا کھویا سا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کی کیفیات کو اب بھی محسوس کر رہا ہے۔ رخشہ کا دل لمحہ بھر کے لیے بے دم سا ہو گیا۔ وہ جن کیفیات کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ سب رخشہ کو کب سے کسی انہونی کے وقوع پذیر ہونے کا اشارہ دے رہی تھیں۔ نجانے آئندہ زندگی میں کیا ہونا تھا؟ مگر وہ فی الحال آئندہ کی گھڑیوں کے خدشات کو خود پر طاری کر کے ان لمحوں کی خوبصورتی کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی گاڑی ایک فیملی ریسٹورنٹ کے سامنے رک چکی تھی۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ حیرانی سے بولی تھی۔

"فلم دیکھنے۔" جتنا بونگا اس کا سوال تھا جواب بھی ایسا ہی ملا۔ "کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں میرا خیال ہے کھانا کھانے کے لیے ہی آیا جاتا ہے نا!"

وہ جھینپ کر ہنس دی تھی۔

☼ ☼ ☼

رخشہ کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک

خوبصورت شام گھر سے باہر گزار کر آنا اتنا بڑا جرم بن جائے گا۔ اور اس کا معمولی سا جھوٹ لالہ بڑھا چڑھا کر ماں کے سامنے پیش کرے گی۔ حیام تو اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور رخشہ اپنے کمرے میں جانا چاہ رہی تھی جب وہ مہاتما بدھ کے مجسمے کی صورت والی صدیقہ نجانے کس کونے سے نکل آئی تھی۔

"پہلے اماں جی کی بات سن لیں۔ پھر اپنے کمرے میں جائیے گا۔" صدیقہ سر جھکائے اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ رخشہ اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

"اماں جی بھلا کیا کہیں گی؟" وہ پر سوچ نظروں سے توقیر بیگم کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ دروازہ اس وقت بھی بند تھا اور ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ رخشہ کچھ سوچ کر توقیر بیگم کے کمرے میں آ گئی تھی۔ خلاف معمول وہ جائے نماز کے بجائے لکڑی کی بھاری کرسی پر بیٹھی تھیں۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور آنکھیں بھی موندر کھی تھیں اور مسئلہ یہ تھا کہ اماں جی کو سلام کرکے بھی متوجہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دو مرتبہ رخشہ نے انہیں دوران وظائف انہیں مخاطب کر لیا تھا اور پھر بے بھاؤ کی سننے کو ملی تھیں۔ اب وہ بہت احتیاط کرتی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز، جوتی کی ہیل اور چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ ساتھ پرفیوم کی بھینی بھینی مہک سے اتنا تو وہ اندازہ لگا ہی چکی تھیں کہ اندر آنے والی نہ صدیقہ ہے نہ لالہ۔ مگر اس کے باوجود وہ اگلے بندے کو انتظار میں سلگا کر نجانے اپنی کون سی حس کو تسکین پہنچاتی تھیں۔

رخشہ کو کھڑے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ ٹخنے سوجنے لگے تھے، کمر تختہ ہو چکی تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا۔ سامنے بیٹھی اس عورت کو ذرا بھر ترس نہیں آیا تھا جب آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا۔ تب توقیر بیگم نے اپنی سرخ ڈیلوں والی آنکھوں کو کھول دیا تھا۔ اور رخشہ کی گویا جان میں جان آ گئی۔

"یہ بناؤ سنگھار کرکے کہاں گئی تھیں؟" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی پھنکار تھی۔

"حیام کے ساتھ باہر گئی تھی۔" توقیر بیگم کے لہجے کا رعب تھا یا پھر اس کے اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز، اس نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں نے تو سنا ہے تم میکے جا رہی تھیں۔" انہوں نے پورے، ڈیلے گھما دیے تھے۔ اور رخشندہ کا دل بھی گویا گھوم کر رہ گیا تھا۔

"جانا تو میکے ہی تھا مگر پھر ارادہ بدل گیا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔" یکدم ان کی پھنکار نما آواز دھاڑ میں بدل گئی تھی۔

"اماں جی! میں سچ بول رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔" وہ کپکپائی۔

"یہ ہار سنگھار کس خوشی میں کیا تھا؟ اس گھر میں تمہیں لا کر میں نے کیا بکواس کی تھی۔ کیا کہا تھا میں نے کہ جب بھی سنگھار کرنا ہو، اپنے کمرے تک محدود رہ کر کرنا۔ پھر یہ چمک دمک دکھا کر کس کے اندر چنگاریاں بھرنا چاہتی ہو؟" توقیر بیگم کے لفظ لفظ میں زہر تھا۔ رخشہ کانپ کانپ گئی۔

"اماں جی! ایسی بات نہیں۔ میں تو بس۔" اس سے بات نہیں بن پائی تھی۔ اور اماں جی اور بھی آگ بگولا ہو گئیں۔

"یہ طوائفوں والے انداز کسی اور کو دکھانا۔ حیام تیرے ان چھنوں سے متاثر ہوگا۔ اور مجھے اس بے حیائی کے مظاہرے پر کیا سزا دوں کہ تیری روح تک کانپ جائے گی۔ ...مجھے شرم نہ آئی لالہ رخسار کے سامنے ... کرکے اس کی خواہشات کو سلگا دینا چاہتی ہے۔"

"میری ایسی کوئی خواہش نہیں اماں جی! اور رہی لالہ رخسار کی خواہشات کی بات، لالہ کی خواہشات کو جن میں آپ کچل رہی ہیں۔" ان کے الزام در الزام کو سن کر رخشہ بھی سنگ کر رہ گئی تھی۔

"بکواس کرتی ہے۔ زبان چلاتی ہے۔" اماں جی کا سانولا رنگ غصے کی شدت سے سیاہ پڑ گیا۔

"میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔" اگر بات اماں جی نے چھیڑ ہی دی تھی تو رخشہ نے سوچا، وہ بھی اپنے ذہن میں نمو پانے والے خیالات کا اظہار کر دے۔

"میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔ تو ایک پاک باز سید گھرانے کی لڑکی کو کیا سمجھتی ہے۔" وہ اس پر جھپٹنے کے لیے گویا تیار تھیں۔

"عورت چاہے، جس نسل، خاندان، ذات یا برادری سے ہو۔ رہتی تو عورت ہی ہے نا اماں جی! آپ عورت کی فطری خواہشات سے منکر کیوں ہوتی ہیں۔ سید گھرانے کی عورتوں کے لیے کوئی اور قانون فطرت لاگو ہوتے ہیں کیا؟" رخشہ بھی اپنے اندر کی بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔

"بکواس مت کر بدبخت عورت!" وہ چنگھاڑیں۔

"سچ گھرانے کی عورت ہو۔ اور آج ثابت بھی کر دیا ہے آج تم نے ... مجھے تیری سوچ سے۔" غصے کے مارے ان کے چہرے کے زاویے بگڑ کر رہ گئے تھے۔

"اور گھن اور کراہت آتی ہے مجھے آپ جیسے لوگوں کی سوچ سے بھی۔ جو اپنی بیٹیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔ جو قانون فطرت سے منکر ہو جاتے ہیں۔ جو صرف اپنی عورتوں کے نہیں اللہ کے بھی گنہ گار ہیں۔ آپ کس دین کی پیروکار بنتی ہیں۔ دین محمدی میں تو عورت کے مقام اور مرتبے کو اتنا بلند کیا گیا ہے۔ اسے بہن بیٹی، ماں ہر روپ میں عزت دی گئی ہے۔ اور آپ آج تک اپنے بزرگوں کی رسموں اور فرسودہ روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آپ کے بزرگ کئی سو سال ہوئے مٹی ہو گئے۔ انہوں نے قبروں سے نکل کر آپ کا گریبان نہیں پکڑنا۔ تو پھر آپ اپنی کوکھ سے جنی بیٹی کے ساتھ ظلم کیوں کر رہی ہیں۔ اسے نارمل زندگی جینے دیں اماں جی! آپ کی بیٹی دھیرے دھیرے ابنارمل ہو رہی ہے۔ پاگل ہو رہی ہے۔ اور اس پاگل پن میں وہ بہت بڑے بڑے نقصان کرے گی۔"

رخشہ نے آج اپنے اندر کی ساری گھٹن کو باہر نکال دیا تھا۔ ادھر اماں جی کسی بپھری شیرنی کی طرح رخشہ پر جھپٹ پڑی تھیں۔ انہوں نے اس کے رخساروں کو تھپڑوں سے لال کر دیا تھا۔ رخشہ توازن برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔ وہ منہ کے بل فرش پر گر گئی تھی۔ دراصل انہوں نے حملہ ہی اس قدر اچانک کیا تھا کہ رخشہ کوئی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔ سمندر ہوتی آنکھوں کو بار بار پونچھتے ہوئے اٹھ گئی۔

"حق کی بات کہنے میں مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ آپ ظلم کر رہی ہیں اماں جی! یہ جنگ لالہ رخسار کی نہیں۔ ایک عورت کی ہے۔ اس خاندان کی پچھلی عورتوں کی بھی جو مر چکی ہیں اور آنے والی ان عورتوں کی بھی جو حیام کی اولاد کے روپ میں جنم لیں گی۔ مجھے اس خاندان کی ہر بیٹی کے لیے "جنگ" کرنا ہے۔ اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

نجانے کوئی غیبی قوت تھی۔ جس نے رخشہ کے کانپتے لرزتے وجود کو ایسی ڈھارس پہنچائی تھی کہ اس بار وہ عبادت گزار مگر درندہ نما عورت کے مقابلے میں ڈٹ گئی تھی۔ اور جس کی خاطر رخشہ حیام بھڑکتے دوزخ میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑی تھی۔ اسی لالہ رخسار نے رخشہ حیام کے لیے ایک اور تندور بھڑکا دیا تھا۔ جس میں رخشہ حیام ایسی گری کہ پھر نکلنے کا راستہ ہی ڈھونڈتی رہ گئی۔ جھلسا دینے والی لپٹوں نے گویا رخشہ کے پورے جسم کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے مجھے بلایا ہے اماں جی!"

حیام مؤدب سا ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر جھکائے، نظر جھکائے آج تک اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ سر اٹھا کر اپنی پھوپھی سے اونچی آواز میں بات کرے۔ حالانکہ ایک وقت ایسا آیا تھا جب اس نے دبی دبی آواز میں لالہ سے نکاح کی درخواست کرنا چاہی تھی مگر جب توقیر بیگم نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تھا تو پھر حیام نے بھی بھول کر۔ لالہ کے بارے میں دوبارہ نہیں سوچا۔ وہ اپنی پھوپھو کا بے انتہا احترام

http://www.pakurduplace.com

ہی نہیں، ان سے بے تحاشا محبت اور عقیدت بھی رکھتا تھا۔ یہ واحد عورت تھی۔ جس نے اس حویلی میں اس پر اپنے پیار کا سایہ کر رکھا تھا۔ اور ان کا ہر لفظ حیام کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

"ہاں بچہ! تمہیں بلایا ہے۔" انہوں نے زہر کا گھونٹ بھرا۔

"جی اماں جی! فرمائیں کیا کہنا ہے؟" اس کی آواز اور لہجہ نرم اور دبا ہوا تھا۔

"ہم نے تم سے ایک التجا کرنی تھی بچہ!" اب کے توقیر بیگم نے لہجہ بدلا۔ آواز میں نمی بھری۔

"التجا نہیں اماں جی! آپ حکم کیجیے۔" وہ گویا تڑپ کر بولا۔ "میری جان بھی حاضر ہے۔"

"سدا خوش رہو حیام! سدا جیتے رہو۔" وہ اندر تک سرشار ہو گئی تھیں۔

"جی اماں جی!" حیام ان کے حکم کو سننے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

"حیام بچہ! ذرا اپنی بیوی کو اپنے لفظوں میں سمجھا دو میری جان!" انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کیا تھا۔

"کیا؟" حیام چونک کر رہ گیا۔

"پیر عالی حضرت کے خاندان کی رسموں، رواجوں اور روایات سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگی ہے۔" انہوں نے کھجور کی گٹھلیوں کی پرات کو اپنے سامنے رکھا تھا۔

"اچھا" وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے حیام! اسی لیے ہم اس کی بدتمیزیوں اور زبان درازی کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" ان کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی۔

"اس نے آپ سے بدتمیزی کی ہے۔" حیام ایکدم ٹھٹک کر رہ گیا۔

"کی تو ہے مگر ہم نے درگزر سے کام لیا ہے۔" انہوں نے تول تول کر بتایا۔

"آپ سے بدتمیزی کیوں کی اس نے؟" رخشنہ کی یہ جرات۔" وہ ایکدم غصے سے سلگ اٹھا۔ اسی خاندان کا ایک فرد تھا نا۔

"اس نے جو کہا۔ اسے بھول چکے ہیں۔ اگر بھولتے نہ تو وہ اس گھر میں دوسری سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ بس آئندہ کے لیے اسے سمجھا دینا۔" ان کے ہاتھ گٹھلیوں پر رینگ رہے تھے۔ وہ استغفار پڑھ رہی تھیں۔

"اماں جی! اس نے آپ سے کس قسم کی بدتمیزی کی ہے؟" حیام اتنی جلدی اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"نہیں میری جان! ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس لیے کہ ہم واقعی بھول چکے ہیں۔" زبان پر اللہ کا نام تھا اور وہ باوضو ہو کر جھوٹ بول رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھیں۔ نہ ہی بھول سکتی تھیں۔

حیام اٹھ کر اپنے کمرے کے بجائے رخشنہ کے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ واضح نظر آ رہا تھا۔ اور لب بھینچے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بہت کٹیلے تھے۔ مگر سامنے بیٹھی رخشنہ کو دیکھ کر اس کا دل ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ صرف لمحہ بھر میں اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس کا غصہ پل بھر میں [illegible] ہو گیا۔

وہ نپے تلے قدم اٹھاتا بیڈ کے قریب آ گیا تھا۔ اور سولہ سنگھار اور حسن کو [illegible] رخشنہ [illegible] ہو گئی تھی۔ اس کے وجود سے [illegible] نے حیام کو مسحور سا کر دیا تھا۔ [illegible] میں موجود دبا غصہ خود بخود کسی [illegible] بیٹھ گیا۔ اس لمحے رخشنہ اسے اپنے دل [illegible] قریب محسوس ہوئی تھی۔

"[illegible]!" رخشنہ نے چونکنے کی بھرپور اداکاری کی۔ حالانکہ وہ تو کب سے حیام کی منتظر بیٹھی تھی۔ یہ ہار سنگھار اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مرد کو کون کون سی چیزیں اٹریکٹ کرتی ہیں۔ اور پھر اس گھٹے گھٹے ماحول میں رہنے والے مرد کو تھوڑی بہت تبدیلی بھی ایک خوشگواریت عطا کر دیتی ہے۔ اور اس

http://www.paktunplace.com

وقت تو رخشندہ کچھ خوف زدہ بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ توقیر بیگم 'حیام کو خوب بھڑکا دیں گی۔ اور وہ سارا غصہ اس پر نجانے کس انداز میں نکالے گا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ حیام اس سے توقیر بیگم سے کی جانے والی گفتگو کی تفصیل پوچھے۔ سو اس نے حیام کو اس موضوع طرف پلٹنے ہی نہیں دیا تھا۔ رخشندہ حیام کی آنکھوں میں واضح پسندیدگی دیکھ چکی تھی۔ سو وہ ایک طرف سے تو کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔

"تمہیں خبر تھی میں ابھی آنے والا ہوں۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ لہجے میں محسوس کی جانے والی تازگی بھری گئی تھی۔

"آپ کی خوشبو نے بتا دیا تھا۔" رخشندہ مسکرائی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" حیام کی نظروں نے اس کے اردگرد حصار باندھ لیا تھا۔ اور حیام کی نظروں کی تپش رخشندہ کو گلنار کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر سلیپر پہننے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو۔" وہ اسے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

"آپ کے لیے کھانا لے آتی ہوں۔ خالی باتوں سے پیٹ بھرتا ہے۔" وہ کھلے بال سمیٹ کر دوپٹہ لینا چاہتی تھی جب حیام نے اسے روک دیا۔

"رہنے دو۔ یوں ہی چڑیل کے روپ میں کھلے بالوں کے ساتھ اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اور اسی چڑیل کے روپ میں اگر باہر چلی گئی تو آپ کے گھر والوں نے مجھ پر تین سو دو کا کیس بنوا کر جیل بھجوا دینا ہے۔" اس نے غیر محسوس انداز میں طنز کیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ باہر نہ جاؤ۔ میرے سامنے رہو۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر ہی پیٹ بھر لیتا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اپنی طرف کھینچ کر بولا تھا۔

"ایک شرط پر نہیں جاتی؟"

"فرمائیں جی۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"آپ نے آج رات یہیں رہنا ہے۔"

"کوئی اور حکم؟"

"ہماری مجال ہے۔ جو حکم دیں۔ صرف درخواست پیش کی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہم نے آپ کی درخواست منظور کر لی ہے۔"

"آپ ہمیشہ کے لیے اس درخواست پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ کب تک چوروں کی طرح ہمارے کمرے میں آیا کریں گے؟"

"مجبوری ہے جاناں! ورنہ ہم بھی دل اور جذبات رکھتے ہیں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

بھلا کیسی مجبوری؟" وہ خفگی کو چھپاتی ہوئے بولی تھی۔ حالانکہ اس کی ساری مجبوریوں کو رخشندہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔

"اس گھر کے رسم' رواج یا اصول کچھ بھی سمجھ لو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اور میں ان فرسودہ اصولوں کو بدل کر رہوں گی۔" رخشندہ نے گویا دل ہی دل میں عہد باندھ لیا تھا۔ مگر اس کے سارے عہد ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ صرف چند دن بعد ہوا کچھ یوں۔

☆ ☆ ☆

اس نے غنی کو فون کیا تھا اور اسے بے بھاؤ کی سنائی بھی تھیں۔ اور پھر اسی غصے کے عالم میں اس نے فون بھی کھٹاک سے بند کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد غنی کی کالز آنے لگی تھیں مگر رخشندہ نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ بھی ڈھیٹوں کی طرح لگا رہا یہاں تک کہ مجبوراً رخشندہ کو ریسیور اٹھانا پڑا تھا۔

"اب کیا تکلیف ہے؟" وہ دل کڑا کر غصے سے بولی۔

"تکلیف تو کوئی نہیں۔ بس تم میرے لیے جھٹ پٹ اور بڑیا بنا لو میں بس دو منٹ میں آیا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے سویٹ ڈش تیار ہو گی۔" رخشندہ نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے کہا تھا اور پھر فون رکھ کر کچن میں چلی آئی تھی اور کچھ دیر بعد اس کے پیچھے صدیقہ بھی آگئی۔

"کون آ رہا ہے۔"

"مہمان ہے۔"

"کہاں سے آئے گا؟" صدیقہ اب پوری تفتیش کرنے کے بعد ہی کچن سے نکلے گی اتنا تو رخشندہ جانتی ہی تھی۔

"میرے میکے سے۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"کون ہے؟" ایک اور سوال۔

"میرا بھائی سمجھ لو۔"

"اچھا" صدیقہ نے سر ہلا دیا تھا اور رخشندہ جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کرتی اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اور جب وہ سویٹ ڈش بنا کر فریج میں رکھتے باہر نکلی تھی' اسی پل غنی آگیا۔ ملازم نے اسے مہمان خانے میں بٹھایا تھا۔ رخشندہ فوراً "مہمان خانے کی طرف آگئی۔

"شکر ہے تشریف تو لے آئی تمہاری۔ اب اگر مجھے ہی کام ہے تو بھلا کیوں نہ نخرے دکھاتے۔" اس نے فوراً طنز کیا۔

"فوراً" اپنی اوقات پر اتر آئی ہو۔ نہ چائے نہ پانی۔" غنی کا اشارہ اس کی طنزیہ گفتگو کی طرف تھا۔

"سب کچھ ملے گا کمینے! ذرا دم تو لے لو۔"

"دم نہیں لے سکتا۔ خالی پیٹ آ رہا ہوں۔ پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔" وہ بھی سچ مچ کمینہ ہی تھا۔ کھانے پینے کے علاوہ اسے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

"گھر سے خالی پیٹ کیوں آ رہے ہو؟"

"تمہاری بھابھی جو ملغوبے بناتی ہیں ناں' بس تمہارے بھائی صاحب ہی کھا سکتے ہیں اور پھر حتی المقدور تعریف بھی کرتے ہیں۔"

"کھایا' پیا حرام کر دیتے ہو۔ میں بھابھی کو بتاؤں گی۔" اس نے دھمکایا۔

"تو پھر میں بھی تمہاری ساس کو بتا آؤں گا۔"

"بھلا کیا؟" رخشندہ بولی۔

"یہی کہ میں ان کے دماغ کا علاج کرنے آیا ہوں۔"

"پھر تم ڈرائنگ روم میں ہی آجاؤ۔" وہ بولتے ہوئے ایک راہداری کے دروازے کو کھول کر آگے بڑھ گئی تھی۔ غنی کاہلی سے وہیں بیٹھا رہا۔ مجبوراً اسے واپس آنا پڑا۔

"یہ بھی اچھی جگہ ہے۔ ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ تم بڑے اخلاق۔" غنی کو یہ قدیم' بے حد قدیم طرز کی حویلی بہت اچھی اور رومانٹک سی دکھ رہی تھی۔ رخشندہ کندھے اچکا کر پلٹ گئی تھی اور پھر واپس آئی تو ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اور جب وہ اورنج ڈیلائٹ کھا پی کر فارغ ہوا تو پھر رخشندہ کے حالیہ مسئلے کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو گیا تھا۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ مسئلہ کافی گمبھیر ہے۔ ورنہ رخشندہ گھر کی بات بھلا اس سے شیئر کیوں کرتی۔

"دراصل میری سوچ کہتی ہے۔ ذہنی پرابلم حیام کے ساتھ نہیں بلکہ لالہ کو نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر تم ہو مگر مجھے اس کا واحد حل شادی۔"

"رخشندہ بہت سوچ سمجھ کر گہری سنجیدگی کے ساتھ تمہید باندھ رہی تھی۔ ابھی وہ اس گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنے ساتھ رونما ہونے والے واقعات سے پردہ بھی نہیں اٹھا پائی تھی۔ جب ایک دم اس کی چھٹی حس نے اسے چونکا دیا۔ وہ غنی سے بات کرتے کرتے دو مرتبہ چونکی تھی۔ دراصل چونک تو غنی بھی گیا تھا۔ ان دونوں کا ذہن فوری طور پر حالیہ مسئلے سے ہٹ گیا تھا۔ غنی ٹھٹک کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ مہمان خانے کی اونچی کھڑکیوں کے سامنے موجود پردے ہلنے لگے تھے اور پھر کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ غیر محسوس طریقے سے بند کیا گیا تھا عین اسی لمحے کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ لائٹ ایک دم چلی گئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنا اندھیرا تھا کہ رخشندہ کی آنکھیں دیکھنے کی کوشش میں پھٹنے لگی تھیں اور سے سائیں سائیں کرتی سنانے کی آواز سے روح کانپ اٹھی تھی۔ رخشندہ نے گھٹی گھٹی آواز میں غنی کو پکارا۔

"غنی! کہاں ہو؟"

"رخشندہ! میں ادھر ہوں۔ دروازے کے پاس" یقیناً وہ لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

http://www.pakfunplace.com

"یہ کیا ہے غنی!" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بے ساختہ رو پڑی۔ دل تھا کہ سوکھے پتے کی طرح سے لرز رہا تھا۔

"ہائے رخشی! تمہارے گھر میں تو بھوتوں کا سایہ لگتا ہے۔" غنی ہلکے پھلکے لہجے میں مذاقاً بولا تھا تاکہ اس کا خوف کچھ کم ہو سکے۔ وہ برابر ہینڈل گھمائے جا رہا تھا۔ مگر دروازہ یقیناً "لاک" کر دیا گیا تھا۔ رخشہ احتیاط سے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

"رخشی! یہ اچانک کیا ہوا ہے؟ کس نے لائٹ آف کی؟ اور ہمیں کمرے میں بند کر دیا؟" غنی کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کچھ بہت برا یا انہونا ہونے والا ہے۔

"پتا نہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے غنی! تم کسی کو آواز دو۔ ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔" وہ ہاتھ پیر چھوڑ قریب ہی رکھے کاؤچ پر ڈھے گئی تھی۔

"حوصلہ پکڑو رخشی! اور ذرا اپنے دماغ کو جگا کر سوچو۔ یہ جو کچھ کیا گیا ہے۔ بہت غلط انداز میں کیا گیا ہے۔ رخشی! مجھے لگتا ہے۔ تم نے مجھے اپنے گھر میں بلوا کر ایک بڑی مصیبت میں خود کو مبتلا کر لیا ہے۔ میرا یہاں موجود رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مجھے کسی نہ کسی طریقے باہر نکلنا چاہیے۔ ورنہ بہت برا ہو گا۔ رخشی۔ تم ایک بڑی سازش کا شکار ہو چکی ہو۔"

غنی حاضر دماغی سے کام لے رہا تھا۔ اس نے پینٹ کی پاکٹ میں سے اپنا سیل فون نکال کر لائٹ آن کی تھی۔ اب وہ پورے ہال کا مدھم سی روشنی کی کرن سے جائزہ لے رہا تھا۔ دراصل وہ کوئی روشن دان اور کھڑکی دیکھ رہا تھا جس سے باہر نکلنا اس کے لیے آسان ہو جاتا۔

"میں نے اسی لیے تو تمہیں گھر بلایا ہے تاکہ یہاں آکر دیکھو اس گھر کے مکینوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' یہ کیوں دوسروں کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔" وہ سینے میں اٹکی سانسوں کو ہموار کرنے کے چکر میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اس کا پورا وجود خوف سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ ہونٹ نیلے اور خشک ہو رہے تھے۔ تب ہی اسے قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔

"رخشہ! یہاں سے باہر نہیں نکلا جا سکتا؟"

"نہیں۔" کلک کی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا۔ رخشہ ابھی کچھ بولنا چاہتی تھی مگر حیام کو اندر آتا دیکھ کر دہل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم روشنی سے پورا کمرا بھی نہا گیا تھا۔ رخشندہ کاؤچ پر بے دم سی بیٹھی تھی۔ جبکہ غنی بھاری کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ حیام نپے تلے قدم اٹھاتا غنی کے قریب چلا آیا تھا جبکہ اس کے چہرے کے تاثرات رخشہ کا دل پھاڑ چکے تھے۔ حیام اس وقت حیام نہیں' کوئی بھپرا ہوا طوفان لگ رہا تھا۔

"یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہے جو آجاتا ہے۔ واپس نہیں جا سکتا۔ جب تک ہم نہ چاہیں۔" یہ آواز توقیر بیگم کی تھی۔ جو اس وقت انسانی شکل میں ایک بلا کی صورت لیے کھڑی تھیں ان کے لب زہر اگل رہے تھے۔

"اس مقدس گھر کی دیواروں نے بے حیائی کے اس منظر کو دیکھ کیسے لیا؟ یہ دیواریں اور چھتیں ڈھے کیوں نہیں گئیں؟ یہاں زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ ہائے اس گھر کی کنواری عورتیں پاکیزگی کی زندگی بسر کر کے دنیا سے پردہ پوش ہو گئیں۔ ان کے بعد اس گھر میں بے حیائی اور بے غیرتی کی فلمیں چلتی تھیں کیا؟"

"تم نے اچھا نہیں کیا رخشہ۔" حیام [illegible] رخشندہ تک آیا تھا۔ اس کی آنکھیں [illegible] اور وہ وہی کچھ دیکھ رہا تھا۔ جو [illegible] بتایا اور دکھایا گیا تھا۔

"میری عزت سے کھیل کر تم نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔ چلی جاؤ یہاں سے' ورنہ میں ایک نہیں دو خون کر دوں گا۔ چلی جاؤ رخشہ! میں نے تمہیں اپنے دل اور گھر دونوں سے نکال دیا۔" حیام کی لال لال آنکھوں میں نفرتوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ رخشہ بے قرار ہو کر حیام کے قدموں میں ڈھے گئی۔

"حیام! مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہاری عزت کو داغ دار کرنے سے پہلے زہر پی لوں گی۔ مجھے غلط مت سمجھو حیام! میری بات سنو میں سب بتاتی ہوں بس۔ یوں بدگمان ہونا ٹھیک نہیں' دیکھو' آج میں تمہیں بتاؤں گی۔ تمہارے اس گھر کی بنیادوں کو کون سی چیز ہلا رہی ہے؟ تمہارے گھر کی عورتیں کس نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں۔ مجھے ایک موقع دو میری بات تو سن لو۔"

وہ گڑگڑا رہی تھی' چلا رہی تھی۔ توقیر بیگم کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ انہوں نے لاتوں اور گھونسوں سے رخشہ کو مارنا شروع کر دیا۔

"نکل جا یہاں سے گندی عورت۔ میں تیرا سایہ بھی لالہ رخسار پر نہ پڑنے دوں۔" وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔ غنی سے [illegible] تشدد دیکھا نہ گیا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا تھا۔

"رک جائیے خالہ! ہاتھ مت لگائیے گا اسے۔"

"تو کون ہوتا ہے اس کا بے غیرت انسان! عاشق ہے کیا؟" وہ دھاڑ کر بولیں۔

"میں اس کے بھائیوں جیسا بھائی ہوں۔ آپ اپنی گندی سوچ اور آلودہ نظر سے سب کو نہ دیکھیں تو بہتر ہے۔" غنی ضبط کرتے کرتے بھی پھٹ پڑا۔

"لے جا اس ناپاک کنجری اور بد معاش عورت کو اپنے ساتھ۔" توقیر بیگم نے فرش پر تھوک دیا۔

"تم نے سچ کہا تھا رخشہ! ان لوگوں کو دماغی علاج کی ضرورت ہے۔ اٹھو یہاں سے' اور چلو میرے ساتھ۔ بظاہر پاکیزہ اور مقدس نظر آنے والے لوگوں کی سوچ کتنی بدبودار گٹر کی بو جیسی ہوتی ہے یہ تو میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑا۔ رخشہ جانا نہیں چاہتی تھی' وہ منتیں کر کر کے بے حال ہو رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر حیام کے پیر پکڑنا چاہتی تھی مگر منظر پھر سے بدل گیا تھا' حیام اس کی طرف دیکھے بغیر چلا گیا۔ توقیر بیگم نے زہر خند نظر اس کی طرف اچھالی اور ایک دفعہ پھر سے فرش پر تھوک دیا۔

"بڑی آئی تھی لالہ رخسار کی شادی کروانے والی۔ بھلا میں اس کا نکاح کسی مرد ذات سے ہونے دوں گی؟ کبھی نہیں' کبھی نہیں۔ خود ہی چلی گئی بے چاری' لالہ کو آباد کرتے کرتے خود برباد ہو گئی ہاہاہا۔"

وہ نفرت سے سوچ رہی تھیں۔ لالہ رخسار نے اپنے پیروں کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیا تھا۔ دراصل وہ ہی تو تھی جو توقیر بیگم کو حجرے میں سے نکال کر باہر لائی تھی۔ اور اس وقت وہ فتح مندی کے جذبات سے سرشار اوپر منزل کے چوکھٹے میں کھڑی تھی۔

وہ بکھری بکھری رخشہ کو اس گھر سے نکلتا دیکھ رہی تھی۔ رخشہ نے آخری نگاہ درد میں ڈوبی ہوئی حویلی کی بلند عمارت کی طرف اٹھائی تھی اور پتھر ہو کر رہ گئی۔ اس نے لالہ رخسار کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور گویا وہ جان گئی تھی کہ لالہ رخسار اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اس کا دل زخم زخم ہو گیا تھا اور وہ زرگون غنی کے پیچھے چل رہی تھی سر جھکائے ہوئے۔

لالہ نے چوکھٹے میں کھڑے کھڑے دور تک پھیلی جاگیروں کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"صدیقہ!"

"جی کراں میں صدقے جاں۔" (جی فرمائیں میں صدقے جاؤں) وہ اس کے پیچھے ہی تو ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"وہ چلی گئی صدیقہ؟" وہ گویا خوشی کے مارے حواس باختہ ہو رہی تھی۔

"جی بی بی! وہ چلی گئیں۔"

"اور حیام؟"

"پیر حیام واثق آپ کے ہیں لالی بی بی!"

"تم سچ کہہ رہی ہو؟" لالہ گویا بے یقین تھی۔

"جی بی بی!" وہ مودب تھی۔ ہاں میں ہاں ملانے کی پابند تھی۔

"تو پھر یوں کرو۔ میری طرف سے حیام کو نکاح کا پیغام دو۔ میں اب مزید دیر نہیں کر سکتی۔" اس کا انداز اٹل تھا۔

"جو حکم بی بی!" اس نے سر جھکا کے کہا۔

"جاؤ۔"

"کیا ابھی کہوں؟" صدیقہ تذبذب کا شکار تھی۔ وہ

http://www.paktunplace.com

اتنی جلد بازی کے حق میں نہیں تھی۔

"ہاں۔" لالہ دور بہت دور تک پھیلے اونچے درختوں کی اونچی شاخوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خواہش اس کے خواب اتنے اونچے نہیں تھے مگر ان کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر جائز ناجائز طریقے کو استعمال کر لیا تھا، دریچے میں یوں ہی کھڑے کھڑے وہ ماضی کے پُرپیچ راستوں پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نئے چاند کی پہلی تاریخ تھی۔ باریک سا ٹوٹی چوڑی جیسا چاند آسمان کے سینے پر اپنی چاندنی بکھیرنے سے قاصر تھا، تاریک سی گہری اداس رات تھی۔ اردگرد کے دیہاتوں اور اس گھنے جنگل جیسے درختوں میں چھپے جانور عجیب دہشت طاری کر دینے والی آوازیں نکال رہے تھے۔

ابھی تو رات کا آغاز تھا، مگر ہر سو ہولناک قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی بھید بھری خاموشی کہ دل سوکھے پتے کی طرح سے لرزا جا رہا تھا۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر عاجز آچکی تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ گیا تھا، اور نیند تھی کہ نجانے کس شہر روٹھ کر چلی گئی تھی۔ سارے گھر پر ہو کا عالم طاری تھا، وہ بستر چھوڑ کر بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ توقیر بیگم نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ رات کے کسی بھی پہر اپنے کمرے سے باہر دکھائی نہ دے۔ حتیٰ کہ پانی پینے کے لیے بھی نہیں۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس کے اندر عجیب بغاوت اتر آئی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اس کام کو کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ جو توقیر بیگم کو غصہ دلانے کا باعث بنتا۔

بھلا لالہ رخسار میں ایسی تبدیلیاں آنا کب سے شروع ہوئی تھیں؟ اس وقت جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پورے اٹھائیس سال کی ہو گئی ہے۔ یا پھر اس وقت جب توقیر بیگم کا اکلوتا لاڈلا بھتیجا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

حیام سے اسے محبت نہیں تھی۔ نہ کبھی ہوئی تھی اور نہ آج تھی۔ وہ تو بس لالہ کو اچھا لگتا تھا، صرف شادی کے لیے۔ کیا فرق پڑتا تھا کہ اس کی شادی حیام سے ہوتی یا پھر کسی سے بھی۔ اسے تو بس اس گھٹن سے نجات چاہیے تھی۔ جو دھیرے دھیرے دیمک کی طرح اسے چاٹ رہی تھی۔

اور حیام تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا، صدیوں کا سفر طے کرتی پھر بھی حیام تک نہ آپاتی۔ اتنے ہی فاصلے تھے۔ اس کے اور حیام کے درمیان۔

وہ بہت چپ رہتا تھا۔ بات کرتا تو نظر کو زمین میں گاڑ دیتا۔ کبھی چونک کر یا ٹھٹک کر اس نے اردگرد دیکھا ہی نہیں تھا کہ کیسی قیامت اس کے آس پاس موجود ہے۔ عجب بے نیازی سی بے نیازی تھی۔ اور لالہ رخسار دل ہی دل میں گیلی لکڑی کی طرح سے سلگتی رہتی تھی۔

یہ نومبر کی اس سرد رات کی بات ہے۔

وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ گیلری میں کھلتا تھا۔ لاؤنج کے داخلی دروازے کے بالکل ساتھ حیام کا کمرا تھا۔ گیلری کے دوسرے کونے پر توقیر بیگم اور صدیقہ کے کمرے تھے۔ حیام کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ چلتی ہوئی سیدھی اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے آرکی۔ مگر دستک دینے کی ہمت بھلا کہاں سے لاتی۔ یوں رات کے اس پہر حیام کے کمرے میں جانا کس قدر معیوب تھا مگر وہ بے چینی اس گھبراہٹ اور تنہائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں تک چلی آئی تھی۔

اس نے بہت ہمت سے بعد دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا اور دروازہ گویا خود بخود کھلتا چلا گیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھ کر دروازہ پھر سے بند کر دیا تھا۔ حیام کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھا۔

"آپ۔" حیام اسے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔ یوں کہ اس کے ہاتھ میں موجود کتاب پھسل گئی تھی۔ وہ حواس باختہ سا کھڑا ہو گیا۔ "کوئی کام تھا کیا؟" غیر ارادی سی نظر اٹھی تھی اور پھر خود بخود جھک گئی۔

"کیوں کام کے علاوہ میں تمہارے کمرے میں تم سے بات کرنے نہیں آسکتی۔" اس نے اطمینان سے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر صبح کہہ لیتیں۔ اس وقت کچھ مناسب نہیں لگتا۔" اس نے ہنوز نظر جھکائے جھکائے کہا۔

"میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا؟"

"نہیں تو۔ میں بھی بس بور ہی ہو رہا تھا۔" دراصل آج سے پہلے کبھی لالہ سے اس نے تنہائی میں بات نہیں کی تھی، بلکہ ان کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔ اکثر لالہ کو اگر کچھ شہر سے منگوانا ہوتا تو وہ صدیقہ کو ایک چٹ لکھ کر دے دیتی اور اس کی مطلوبہ چیزیں آجاتیں۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی تھیں؟" حیام نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"بس نیند نہیں آرہی تھی اور یہ تم مجھے اتنے تکلف سے کیوں بلاتے ہو، نام لیا کرو میرا، مجھے اچھا لگتا ہے۔" لالہ نے بے تکلفی کی پہلی ریت کا آغاز کیا تھا۔

"وہ اماں جی ناراض ہوں گی۔" حیام بھی توقیر بیگم کو پھوپھی کے بجائے اماں جی ہی کہا کرتا تھا، کیونکہ توقیر بیگم نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اور وہ لالہ کی طرح ہی اماں جی سے خوف زدہ رہتا تھا۔

"اماں جی کچھ نہیں کہیں گی، اب تو اماں جی کے خوف سے آزاد ہو جاؤ۔"

لالہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

"اماں جی سے ڈرتا نہیں ہوں، مگر ان کے احترام اور رعب کی وجہ سے کچھ ایسا نہیں بولنا چاہتا جو انہیں ناگوار گزرے۔ ایسی بے تکلفی انہیں پسند جو نہیں۔"

وہ صاف اور سیدھی بات کر رہا تھا، کیونکہ لگی لپٹی تو اسے آتی نہیں تھی۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا، ہم دونوں اتنے قریبی رشتے اور تعلق کے باوجود ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ تم تو کالج اور یونیورسٹی میں پڑھے ہو۔ دنیا دیکھی ہے تم نے کیا تمہیں نہیں لگتا، ہم دونوں کزنز ہونے کے باوجود دوست نہیں ہیں۔" لالہ کے لہجے میں حسرتوں کا طوفان تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول ان باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔" بہت دیر سوچنے کے بعد حیام نے کہا بھی تو صرف اتنا۔

"اس گھر کا ماحول کب بدلے گا۔ جب ہم زندہ نہیں رہیں گے؟ آخر کون بدلے گا اس گھر کا ماحول حیام!" لالہ گویا سسک اٹھی۔

"کبھی نہیں بدلے گا، اس گھر کا ماحول ایسا ہی رہے گا، یہ پیروں کا معزز ترین گھرانہ ہے۔ اس گھر کی عورتیں ہمیشہ باپردہ رہی ہیں۔ کبھی نامحرم ملازم تک اندر نہیں آیا۔ ہم پیر ہیں اور ہماری پیروی ہمارے مریدین اور عقیدت مند کرتے ہیں۔ (اس وقت توقیر بیگم کے پاس ہزاروں عقیدت مند دعا کے لیے آتے تھے۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ اب اس سلسلے کو ختم کر دیا گیا تھا، کیونکہ توقیر بیگم گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ عورتوں کے سامنے بھی نہیں آتی تھیں۔) ہر نسل میں ہماری ایک عورت اس گدی پر بیٹھتی ہے، جس گدی پر اماں جی موجود ہیں اور لالہ رخسار! آپ کو اسی گدی پر بیٹھنا ہے اور جب آپ کی باری آئے گی تو پھر مریدین کے آنے کا دوبارہ سے سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔ کئی نسلوں سے یہ ہی ہوتا آرہا ہے۔ اس خاندان کی آپ واحد اور اکلوتی عورت ہیں، جبکہ میں تو ایک دوسرے خاندان کا فرد ہوں۔ اماں جی کا بھتیجا ہوں۔ میرا آپ کی اس گدی سے کوئی لینا دینا نہیں، اس گدی پر آپ کو ہی بیٹھنا ہے، جلد یا بدیر۔"

حیام نے سچائی کی انتہا کر دی تھی۔ لالہ اس سچائی کو سن کر گویا بپھر گئی۔

"مجھے نفرت ہے ان باتوں سے، میں ہرگز بھی یہ سب نہیں کر سکتی جو اماں جی نے کیا۔ ضروری نہیں کہ میرے نصیب بھی میری ماں جیسے ہوں۔ انہوں نے بیوگی کے بعد زندگی کی ہر خوشی خود پر حرام کر لی۔ اپنی زندگی کے دروازے خود اپنے اوپر بند کر لیے تھے مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔" حیام نے سر جھکائے

http://www.pakfunplace.com

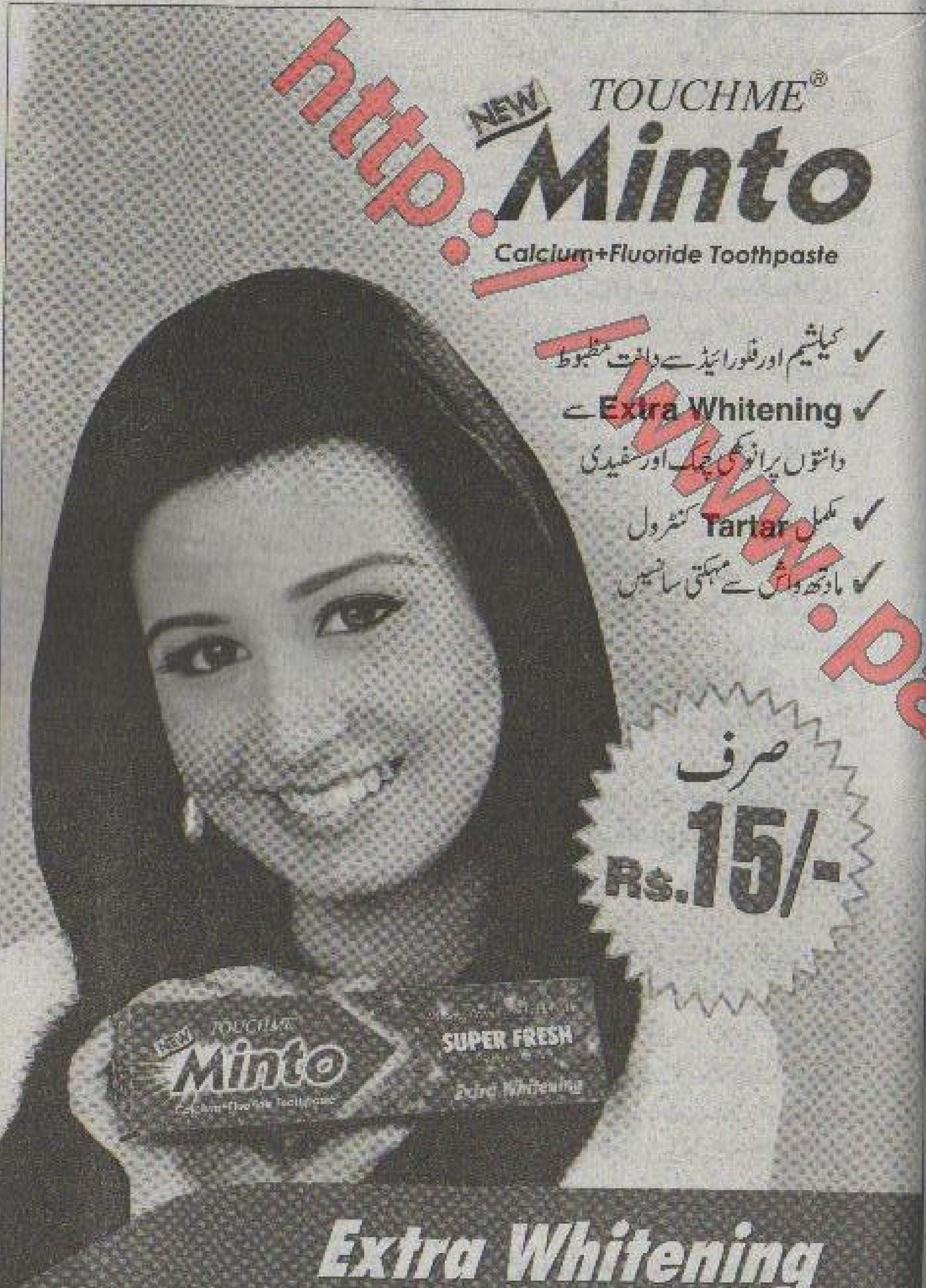

کہا۔ وہ اخبار اٹھا کر ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اور وہ یہ کام نہ جانے کتنی دیر سے کر رہا تھا۔ ایک اضطراری قسم کی حرکت تھی۔

"تم کچھ نہ کہو بس اتنا کر لو کہ میرے دکھ سکھ سن لیا کرو' میری دل کی باتیں' میرے اندر کی بھڑاس' کیا تم ایسا کرو گے؟"

لالہ نے گویا التجا کی تھی۔ آنسو بھری حسین گہری گلابی اور خمار آلود آنکھیں' اس کی دوشیزگی' دلکشی اور بانک پن وہ کسی بھی ہوش مند آدمی کو اپنی نظروں کے تیر سے گھائل کر سکتی تھی۔ مگر حیام واحق گھائل ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی غیر ارادتاً" اٹھنے والی نظر بھی احترام کے رنگوں سے جھکی ہوئی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اگر اماں جی کو خبر ہو گئی' میں جانتا ہوں' انہیں خبر ہو جائے گی۔" حیام نے گھبرا کر کہا۔

"تو مجھے کوئی پروا نہیں۔" لالہ بے خوف تھی۔

"پر مجھے ہے۔" حیام اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "مجھے آپ کی عزت ہی نہیں اس گھرانے کی عزت بھی عزیز ہے۔ میں نے اس گھر کا رزق کھایا ہے' اور مجھے اماں جی کی نظر میں ہمیشہ سرخرو رہنا ہے۔"

"اور چاہے تمہاری نظر کے سامنے ایک وجود گل سڑ کر ختم ہو جائے؟" وہ زخمی نظر سے اسے دیکھنے لگی۔ "میں تم سے کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہی' صرف چند گھڑیاں' صرف چند لمحے۔"

"آپ مجھ سے یہی بات کرنے کے لیے آئی تھیں۔" اگرچہ وہ اس کی ایک ایک بات سے متفق تھا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا اول روز سے حیام نے اس گھر کے چند ایک اصول دیکھے تھے۔ اور یہ اصول بہت پرانے اور بوسیدہ تھے۔ پہلے پہل جب لالہ کے دادا جان پیر جالی حضرت زندہ تھے تب تو حیام کو اندرونی حصے میں جانے کی اجازت تک نہیں تھی۔ ان کے مرنے کے بعد اماں جی نے اس کے لیے اندرونی دروازے کھلوائے تھے۔ اور اس کا کمرا اب بھی داخلی دروازے کے پاس تھا۔

"نہیں کہنا تو اور بھی بہت کچھ تھا مگر پھر سہی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تم نوکری کیوں تلاش کر رہے ہو؟ بھلا تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ جاگیریں اور ان کی آمدن' یہ سب کچھ ہمارا' تمہارا ہی تو ہے۔"

"نہیں' یہ صرف آپ کا ہے' میرا نہیں' اور میں نے تعلیم اسی لیے حاصل کی ہے کہ تاکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔" اور یہ سچ ہی تھا۔ وہ شروع ہی سے اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا کہ اسے خود کو کسی قابل بنانا ہے' تاکہ اپنی پہچان خود بنا سکے۔

"اچھا' ایک بات تو بتاؤ؟" وہ جان بوجھ کر باتوں کو کھینچ کھینچ کر لمبا کر رہی تھی۔ "تم نے کالج میں کسی سے دوستی کی؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' میرا مزاج ایسا نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"وہ تو لگ رہا ہے۔" لالہ نے بھنا کر کہا۔ "تم کس دنیا میں رہتے ہو حیام؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم سمجھ بھی بھلا کیسے سکتے ہو؟" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔

"اب آپ جائیے پلیز! بہت وقت ہو چکا ہے۔" اس نے کوئی تیسری مرتبہ کہا تھا۔

"پہلے کہو لالہ۔" نہ جانے لالہ کو کیا سوجھا تھا' وہ ایک دم آنکھوں میں شرارت بھر کر بولی۔ "میرا نام لو پھر جاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ زچ ہوا۔

"کہو لالہ ورنہ میں ہرگز بھی نہیں جاؤں گی۔" لالہ اسے ستا رہی تھی۔

"پلیز لالہ! جائیے' اپنے کمرے میں جائیے۔"

"آپ' جناب کہنا چھوڑو۔" لالہ بے ساختہ اس جیت پر خوش ہو گئی تھی۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اس مٹی سے بنے وجود کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لے گی۔

http://www.pakfunplace.com

"اچھا۔" حیام نے گویا جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"اچھا چلتی ہوں، صبح ملاقات ہوگی۔" لالہ کو گویا اس کی حالت پر ترس آگیا تھا۔ اور وہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبا کر باہر نکل رہی تھی۔ مگر ایک، دو مرتبہ اس نے مڑ کر گم صم بیٹھے حیام کی طرف ضرور دیکھا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"صدیقہ! میرا ناشتا کمرے میں رکھ دو۔" وہ زمینوں کے حساب کتاب والا رجسٹر توقیر بیگم کو دکھا کر سارا حساب سمجھا آیا تھا۔ کل پیداوار، کل خرچہ اور کل آمدنی، فصل کی ساری رقم وہ ہمیشہ کی طرح توقیر بیگم کو دے کر باہر نکلا تو صدیقہ کو دیکھ کر ناشتے کے بارے میں کہتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کے کپڑے کافی میلے ہو رہے تھے۔ دراصل وہ اس وقت پانی لگوا کر آرہا تھا۔ جب تک اسے ڈھنگ کی جاب نہیں مل رہی تھی۔ وہ اپنا پورا وقت زمینوں کی دیکھ بھال میں صرف کر رہا تھا۔ فارغ رہنے سے بہتر مصروفیت تھی اور آج کل تو حیام ویسے بھی لالہ سے بچنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی کہتی بولتی آنکھیں حیام کو ایک خوف میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ وہ جتنا اس سے کترا رہا تھا۔ وہ اسی قدر اس کے قریب آنے کی کوشش میں تھی اور حیام کو لگتا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔

ابھی وہ نہا کر واش روم سے نکلا ہی تھا جب لالہ کو ناشتے والی ٹرے میز پر رکھتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"صدیقہ کہاں ہے؟" وہ ناگواری چھپاتے ہوئے بولا۔

"وہ اماں جی کے کمرے میں چلی گئی ہے ان کی ٹانگیں دبانے، دوپہر کے کھانے سے پہلے نہیں نکلے گی۔ تم اطمینان رکھو۔" لالہ نے مطمئن انداز میں کہا تھا جبکہ حیام کی پیشانی پر سلوٹ پڑ گئی۔

"آپ کو میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں آنا چاہیے؟"

"یہ سب ٹھیک نہیں، پلیز، آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ جھنجلا کر رہ گیا تھا۔ جو کچھ وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا، لالہ جانتے بوجھتے بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"تم مجھ سے گھبراتے کیوں ہو؟ اس قدر کتراتے کیوں ہو؟" گہری اداسیاں لالہ کی سمندر آنکھوں میں اتر آئیں۔

"نہیں تو ایسی تو بات نہیں۔" وہ صاف مکر گیا۔

"ایسی بات ہے۔" لالہ اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی۔ "تم کیوں نہیں چاہتے، ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیواریں گر جائیں، ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے کچھ دیر کے لیے بات کر لیا کریں۔ تم میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے؟"

"یہ ناممکن ہے، ایسا نہیں ہو سکتا، بھلا ہمارے خاندان میں ایسی باتیں زیب دیتی ہیں اور پھر آپ تو پیر عالی حضرت کی پوتی ہیں ان کی گدی کی واحد حق دار۔"

"اللہ کا واسطہ تمہیں، یہ گدی کی بات میرے سامنے نہ کیا کرو۔" لالہ نے اپنے کنول جیسے نرم ملائم سفید ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے اور حیام ہواحق پھر سے نظر چرا گیا۔

"مجھے نہیں خواہش اس گھر کے ایک کمرے میں قید اپنی زندگی کو زنگ لگانے کی۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں، کرنا تو آپ کو ہی ہے۔" وہ الجھ کر بولا۔

"تم ہی تو سب کچھ کر سکتے ہو۔" یکایک لالہ کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔

صحیح وقت پر فیصلے نہ کیے جائیں یا فطری خواہشوں اور امنگوں پر زبردستی کے بند باندھیں تو خود بخود ایک چور دروازہ کھل جاتا ہے۔ لالہ رخسار اسی چور دروازے سے غیر مناسب اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر چل پڑی تھی۔ حواس باختہ، الجھی، پریشان اور ڈبل مائنڈڈ۔

"میں بھلا کیا کروں گا، میرے اختیار میں کچھ نہیں۔"

"تم ایسا مت سوچو، تمہیں ذلیل و رسوا کرنے والے، روٹی کے ٹکڑے جتانے والے کب کے راہی عدم ہوئے۔ فرار کا احاطہ ان قبروں سے بھرا ہوا ہے۔ اب تمہیں نیچ نظر سے کوئی نہ دیکھے گا۔ پھر کاہے کا خوف حیام!" وہ مچل کر بے قراری سے بولتی چلی گئی۔

"پھر بھی میں اپنا مقام نہیں بھول سکتا، ایک طوائف کا بیٹا ہی رہوں گا۔ پیر عالی حضرت کے خاندان کا حصہ نہیں بن جاؤں گا۔" وہ خطرناک حد تک صاف گو تھا۔

"پر تم دادا حضرت کے بھانجے کے بیٹے ہی رہو گے۔ چاہے تمہاری ماں کسی خاندان، قبیلے یا پیشے سے تعلق رکھتی ہو، تم اسی خاندان کا حصہ ہو، یہ حقیقت کوئی نظر انداز کر سکتا۔"

"بس، مجھے جانے دیجیے، آپ مجھ حقیر پر ایک مہربانی کیجیے۔" وہ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر رخ موڑ گیا۔

"یہاں سے چلی جاؤں؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" وہ گویا اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"اگر آپ کو مجھ پر رحم آتا ہے تو چلی جائیں۔"

"یوں رخ مت موڑا کرو حیام! میرا دل دکھتا ہے۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے چھلکتی آنکھوں کے کٹوروں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

پیر عالی حضرت اپنی خاندانی گدی کے اصل وارث یعنی لالہ کے والد پیر ذاکر کی حادثاتی موت کے دکھ کو دل میں سموئے اپنی آخری گنی چنی سانسوں میں اپنی گدی کو پیر ذاکر کی بیوہ اور اپنی سگی بھانجی توقیر بیگم کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئے تھے۔

توقیر بیگم جو کہ ازل سے اس گھر کی دیواروں میں سانسیں لے رہی تھیں۔ اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ تلے دب کر رہ گئیں۔ مگر ایک خوشی اور دل میں چبھن دیتی پھانس پیر ذاکر کی موت کی صورت میں تو نکل ہی چکی تھی۔

انہوں نے پیر عالم اور جابر آدمی کوئی نہیں دیکھا تھا اور ان کے عالم اور جابر ہونے کے سوائے حیام کے اور کسی کے لیے نہیں تھے۔ پیر عالی حضرت کو اپنی بہو اور بھانجی کے سگے بھتیجے سے اس لیے نفرت تھی کہ ان کے بھانجے پیر واصل نے ایک ایسی عورت جو گناہ کی دلدل سے نکل کر پاکیزگی کے سفر پر نکلی تھی کے ہمراہ تھے۔ اللہ نے اسے حیام جیسے بیٹے کی نعمت سے بھی نواز دیا تھا۔ مگر ایک حادثہ ان دونوں کو نگل گیا۔ معصوم حیام اپنی پھوپھی توقیر بیگم کی گود میں پہنچ گیا اور یہاں سے اس کی زندگی کے تلخ ترین دور کا آغاز ہو گیا تھا۔

پیر عالی حضرت کی نگری میں حیام کو لمحہ لمحہ نفرتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پیر ذاکر اسے کسی کتے کی طرح ناپاک اور کسی چھوت کی بیماری میں مبتلا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک طوائف کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ نہایت کریہہ اور ناپاک تھا۔ سو وہ اپنی پھوپھی کی مہربانی سے ہمیشہ اس گھر سے دور ایک درس گاہ میں زیر تعلیم رہا۔ مگر جب بھی اسے واپس گھر آنا پڑتا اور یہاں آکر رہتا تو یہ دن اس کی زندگی کے عذاب ناک دن بن جاتے۔

پیر صاحب کا جلال اسے دیکھ کر اڈ آتا۔ وہ قرآن پاک کو ہاتھ میں پکڑتے آنکھوں سے چومتے اور اسے وضو کرنے کا اشارہ کرتے۔ وہ وضو کر کے آجاتا تو ان کی گرج دار آواز اس کی روح تک کو لرزا کر رکھ دیتی۔

"پارہ نمبر تیرہ، سورۃ الرعد، آیت نمبر تین سے شروع ہو جاؤ۔"

"پیر صاحب! میں کسی مدرسہ میں نہیں پڑھتا، یہ ایک اسکول ہے جہاں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اور میں قرآن پاک ناظرہ پڑھ سکتا ہوں اور مجھے سورۃ البقرہ، سورۃ یونس، سورۃ الرحمٰن اور سورۃ یاسین زبانی یاد ہے۔ جو آپ کہیں میں سنا دیتا ہوں۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے لرزتی آواز میں کہتا تھا اور پیر صاحب کا ہنٹر ایک دم ہل کھانے لگتا۔

"کافر! تجھے پیروں کے خاندان میں نہیں پیدا ہونا

http://www.pakfunplace.com

چاہیے تھا تو قرآن پاک کا حافظ نہیں، تجھے اللہ کا کلام یاد نہیں۔" ہنٹر کی شائیں شائیں اور پھر گہری ضربیں۔ حیام کی چیخیں زنان خانے کے در و دیوار تک ہلا کر رکھ دیتی تھیں۔ توقیر بیگم جائے نماز پر بیٹھی ہوتی تھیں وہ حیام کی چیخوں کو سن کر ہذیانی انداز میں فرش پر ٹکریں مارنے لگتیں۔

"مار دیا ہائے مار دیا، حیام کو مار دیا۔" وہ سسک سسک کر روتی جاتیں۔ ادھر پیر صاحب کے مرید اٹھا کر حیام کو گھر چھوڑ جاتے، تب صدیقہ کی اماں رفیقہ بھی ہوا کرتی تھی اور وہ پوری رات حیام کے جسم پر ہلدی کا لیپ اور ٹکوریں کرتی۔ وہ ایسی نفرت ذلت اور حقارت کو سہتے سہتے جوان ہوا تھا۔

پیر صاحب اسے گھر کے اندر پھوپھی سے ملنے کے لیے بھی نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ پابندی اس وقت عائد ہوئی تھی جب انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی اکلوتی پوتی لالہ رخسار جوان ہو گئی ہے۔

پیر صاحب مر گئے تو گدی پر توقیر بیگم کو بٹھایا گیا۔ عقیدت مندوں کی لائنیں، عرس، لنگر، دعائیں، فریادیں۔ بہت جلد توقیر بیگم اس ہجوم سے گھبرا کر گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ مریدین کو منع کر دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زنان خانے کے در و دیوار ایک گہری خاموشی کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ اس خاموشی کے پردے کو بھی کبھی لالہ کی سسکیاں چاک کر دیتی تھیں۔

رات کی ہولناک تاریکیوں میں جب لوگ اپنے بستروں میں گہری نیند کے مزے لے رہے ہوتے تھے۔ لالہ رخسار ننگے پیر فرش پر چلتی تھی اور اسے لگتا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے آبلے پڑے ہیں۔

اور وہ زخمی قدموں سے چلتی ہوئی ایک مرتبہ پھر حیام کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ مگر آج دروازہ اندر سے لاک تھا۔

"حیام! دروازہ کھولو۔" وہ دھیرے دھیرے دستک دے رہی تھی۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

حالانکہ وہ جانتی تھی حیام جاگ رہا ہے۔ مگر جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھول رہا۔

"حیام! میں کہہ رہی ہوں، دروازہ کھولو۔" وہ دبی آواز میں چیخی۔ "میں شور مچا دوں گی اگر تم نے دروازہ نہ کھولا۔" اس کی دھمکیاں بے اثر تھیں۔

"تم مان جاؤ گے ایک دن، سرنگوں ہو جاؤ گے، پھر سارے دروازے کھل جائیں گے۔" اس کے آنسو فرش پر گر رہے تھے۔

"یہ سانسوں میں اتری گھٹن دور بہت دور چلی جائے گی۔ ایک دن پیر عالی حضرت کے زنان خانے میں بچوں کی کھلکھلاہٹیں اور قلقاریاں گونجیں گی۔" وہ سسک رہی تھی بلکتی جا رہی تھی۔

"ایک نسل کی امین عورت کو پھر کوئی بھی مرد طاقت کے زور پر گدی پر نہیں بٹھائے گا اور نہ ہی قسموں اور وعدوں میں جکڑ کر عورت کی فطری خواہشوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ عورت کو تعویذ دھاگوں میں الجھا کر ایک کمرے میں بند کر دینے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ گھروں کی زینت و زیبائش اور افزائش نسل کے لیے اسے مرد کا رفیق بنایا گیا ہے تو پھر یہ قید تنہائی کے عذاب بخش کر عورت کی توہین کیوں کی جاتی ہے؟" وہ فرش پر گرنے والے اپنے آنسوؤں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"نہیں اماں جی! آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی لالہ رخسار [illegible] نہیں ہو سکتی جو پیر عالی حضرت کے حکم [illegible] میں اپنی زندگی کے سارے ماہ و سال [illegible] دے۔ میں لالہ رخسار ہوں۔ اور میں اپنی [illegible] خوشیاں چھین کر بھی حاصل کروں [illegible] دیکھ لینا اماں جی! میں یہ کر کے رہوں [illegible] کے لیے مجھے حیام کو سیڑھی بنانا پڑا تو بھی [illegible] کروں گی۔ میں پرانی رسموں اور رواجوں پر خود کو قربان نہیں کر سکتی۔ نہیں، اماں جی! کبھی بھی نہیں۔" وہ تھک کر بکھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حیام!" مانوس سی اپنائیت سے بھری اس آواز کو

سن کر حیام رک گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹریکٹر کی چابیاں تھیں اور وہ ہل چلانے کے لیے زمینوں پر جا رہا تھا۔ مگر لالہ کی آواز سن کر رک گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ بڑے سے ٹینٹ کو اپنے ارد گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ اس چادر کو اتارنے کی کبھی بھی اجازت نہیں ملی تھی اور یہ چادر اتارنا بھی ایک بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی حیام کو بھی ان خیمہ نما چادروں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ [illegible] ڈھکنے کے لیے لباس سے ہم رنگ دوپٹے اوڑھ لینے میں بھلا کیا حرج تھا۔ مگر یہ پشت در پشت سے رسومات چلی آ رہی تھیں۔ جن کی [illegible] ضروری ارکان کی طرح لازمی سمجھا جاتا [illegible]

"زمینوں [illegible]" مختصر بتایا۔

"مجھے [illegible] لے چلو گے کیا؟" لالہ تیز تیز بول [illegible] اسے بہت جلدی تھی۔

اس وقت تو نہیں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک آ جاؤں گا۔" حیام نے سنجیدگی سے بتایا۔

"نہیں سورج ڈھلنے تک مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ ورنہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم زبان دانتوں تلے دبا کر چپ کر گئی۔

"تو پھر مجھے واقعی دیر ہو جائے گی۔ آج ہل چلانا ضروری نہ ہوتا تو میں آپ کو لے جاتا۔ آپ نے خانقاہ ہی جانا ہو گا تو آپ صدیقہ کو ساتھ لے جائیے۔"

اس نے خود ہی اندازہ لگایا تھا کہ لالہ نے خانقاہ کے علاوہ بھلا کہاں جانا ہے۔ حالانکہ آج جمعرات کا دن نہیں تھا اور جمعرات کے علاوہ لالہ کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ آج منگل کا دن تھا۔ یعنی بدھ ہر کام سدھ اور منگل یعنی سنگل (زنجیر) اور یہ عمل اسی وقت کیا جاتا تھا جب دو وقت مل رہے ہوتے۔ یعنی دن شام سے بغل گیر ہو رہا ہوتا۔ یہ وقت کسی بھی عمل کے لیے مناسب تھا۔

"اماں جی کو مت بتانا۔" وہ پلٹنے لگا تھا جب لالہ نے جلدی سے کہا۔

"تو اس میں چھپانے والی کیا بات ہے؟" حیام حیران ہوا۔

"وہ دراصل آج جمعرات نہیں ہے نا۔" اس نے پریشانی کی اصل وجہ بتا دی تھی، اب کے حیام بھی چونکا۔

"تو پھر آپ کیوں جا رہی ہیں؟"

"میں بابا صاحب اور دادا صاحب کی قبروں پر پھول چڑھانے جا رہی ہوں۔ نئے غلاف چڑھاؤں گی، دل بہت بے قرار تھا۔ سوچا بزرگوں کی قبروں پر چراغ جلا آؤں۔" اس نے وجہ کافی معقول بتائی تھی۔ اسی لیے حیام چپ سا کر گیا۔

"پھر بھی آپ اماں جی کو بتا دیں۔"

"نہیں بتا سکتی، وہ منع کر دیں گی۔"

"یوں بغیر بتائے جانا مناسب نہیں۔" وہ سوچ میں گم تھا۔

"تم ہر وقت مناسب اور غیر مناسب کے چکروں میں پڑے رہا کرو۔" لالہ کو غصہ آ گیا۔

"میں اب جاؤں؟" حیام اجازت چاہ رہا تھا۔

"کچھ دیر اور رک جاؤ۔" لالہ نے گویا فرمائش کر دی۔

"کتنی دیر تک۔" وہ گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔

"اگر میں کہوں پوری زندگی۔" لالہ انوکھی باتیں ہی تو کرتی تھی۔

"تو میں کہوں گا کہ یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"آپ نہ جانے کیسی باتیں کرتی ہیں، میرے تو کچھ پلے نہیں پڑتا۔"

"سب کچھ سمجھتے ہو اور پھر بھی انجان بنتے ہو۔" لالہ کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔ "کب تک نگاہ چراؤ گے؟ کب تک نا سمجھ بنو گے؟"

وہ نچلے ہونٹ کو اذیت سے کچلتے ہوئے پلٹ گئی تھی، جبکہ حیام بھی سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر پہلی مرتبہ اپنے کام کی طرف اس کی توجہ نہیں تھی۔ اس کا ذہن بار بار بھٹک جاتا تھا اور دھیان کی سوئی لالہ کی گہری باتوں میں اٹک جاتی۔ اسی لیے کچھ ہی دیر میں وہ ٹریکٹر بند

http://www.paktunplace.com

کے خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سب غیر ارادی تھا۔ وہ جانا تو گھر کی طرف چاہتا تھا مگر قدم اس کے خانقاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا لالہ اس وقت خانقاہ میں موجود ہوگی۔ مگر اس کی آنکھیں اس وقت تحیرزدہ رہ گئی تھیں جب اس نے لالہ کو صدیقہ کے ہمراہ خانقاہ کے بجائے سائیں جی کے جھونپڑے سے نکلتے دیکھا تھا اور اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئی تھیں۔

"لالہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

☼ ☼ ☼

"آپ خانقاہ گئی تھیں؟" دوسرے دن از خود حیام کو گول کمرے میں آتا دیکھ کر لالہ سمجھ تو گئی تھی، مگر خوشی اس بات کی تھی کہ حیام آج خود اس کے پاس آیا تھا چاہے کچھ پوچھنے یا تفتیش کرنے ہی سہی۔

"ہاں۔" اس نے چمکتی آنکھوں سے جھوٹ بولا۔

"نہیں، آپ وہاں نہیں گئی تھیں۔" حیام نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

"میں خانقاہ گئی تھی۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

"تم نہیں گئی تھیں۔" ایک دم بلا ارادہ اس کے منہ سے پھسل پڑا تھا اور جب اسے اپنے منہ سے نکلنے والے لفظ تم کا احساس ہوا تو گویا وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔

"ایک دفعہ پھر کہو۔" لالہ نے گویا خوب ہی لطف لیا تھا اور اسے یہ بے تکلفی کی طرف پہلا قدم کامیابی کی ایک کڑی معلوم ہونے لگا تھا۔

"میری بات کا جواب دیں۔" وہ سنبھل کر گویا ہوا۔

"پہلے آپ جناب کہنا ترک کرو، پھر بتاؤں گی۔" اس نے اطمینان سے شرط بتا دی۔

"پتا تو مجھے چل ہی گیا ہے، نہ بھی بتائیں گی تو فرق نہیں پڑے گا، تاہم مجھے آپ کی غلط بیانی پر شدید افسوس ہوا ہے۔"

"میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔" وہ صاف مکر گئی۔

"آپ سائیں جی کے حجرے میں کیا کرنے گئی تھیں؟" حیام نے بے حد ناگواری سے پوچھا۔

"وہ ایک فقیر آدمی ہیں۔ ان سے دعا کروانی تھی۔" لالہ نے بالآخر وجہ بتا دی۔

"وہ فقیر نہیں، ایک جادوگر ہے، کالا علم ہے اس کے پاس۔ رات بھر قبرستان میں بیٹھا چلے کاٹتا ہے۔ آئندہ اس طرف مت جائیے گا۔ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔ جھوٹی باتیں اور جھوٹے قصے سناتا ہے۔ آپ کو بھلا کیا ضرورت ہے دعائیں کروانے کی۔ اگر دعا مانگنی ہے تو اللہ سے مانگیں۔ ایک بات یاد رکھیے، اللہ کے علاوہ آپ کے دکھ، درد، غم، فکریں کوئی اور دور نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے دل کی بھڑاس، اپنی تنہائیوں کی باتیں اللہ سے کیا کریں۔ وہ آپ کے راز کسی اور کو نہیں بتائے گا۔"

حیام نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا اور لالہ بھلا سن کہاں رہی تھی۔ وہ تو حیام کو بس دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھے جا رہی تھی۔ آج وہ اسے عام دنوں سے بھی زیادہ اچھا لگ رہا تھا، بہت اپنا اپنا سا۔

"آپ آئندہ وہاں نہیں جائیں گی۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔" وہ ضدی پن سے بولی۔

"لالہ! وہاں جانا ٹھیک نہیں۔" حیام کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے سمجھائے۔

"کیوں ٹھیک نہیں؟" لالہ نے ... "ادھر جانا تو بہت مبارک ثابت ہوا ہے۔ حیام کو میری فکر لاحق ہوگئی ہے۔" وہ ... سے بولی تھی اور اسے گویا یقین آگیا تھا کہ سائیں جی کا عمل کامیاب ہوگیا ہے۔ حیام کی اس کے لیے فکر، یہ توجہ اور احساس کرنے کا انداز اسے مطمئن کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ایک، دو مرتبہ مزید سائیں جی کے حجرے میں جانا پڑے گا۔ حیام کو اپنی طرف مزید مائل کرنے کے لیے نئے چاند کی رات کا عمل بہت ضروری تھا۔

"آپ وہاں نہیں جائیں گی، اگر میں نے پھر سے

http://www.pakfunplace.com

آپ کو ادھر دیکھ لیا تو پھر نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔" حیام کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔

"کیا کرو گے؟" لالہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"یہ بعد کی بات ہے، آپ احتیاط کیجیے گا۔" وہ جانے لگا تھا جب لالہ نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

"بات سنو۔"

"جی۔" وہ رک گیا تھا۔

"چائے لاؤں تمہارے لیے؟" لالہ ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ لیے پوچھ رہی تھی۔

"نیکی کا ارادہ ہے تو کر لیجیے۔" وہ پہلی مرتبہ مسکرایا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" لالہ چادر کے ایک کونے کو ہاتھ میں دبا کر بولی تھی۔

"چائے صدیقہ کے ہاتھ بھجوائیے گا۔" وہ جاتے جاتے تنبیہہ کرنا نہیں بھولا تھا۔ لالہ ایک دفعہ پھر سے مسکرائی۔

"تم فکر نہ کرو، میں نہیں آؤں گی۔" لالہ نے اسے تسلی دے کر بھیجا تھا اور خود کچن میں چلی آئی تھی اور جب چائے بن گئی تو اس نے چادر کے کونے میں بندھی پڑیا کو کھول کر چائے میں گھول دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صدیقہ! ایک بات تو بتاؤ؟" صدیقہ اس کے کمرے میں موجود تھی اور لالہ کے لیے سیاہ بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ حالانکہ صدیقہ کو بھی نہ بولنے کی بیماری لاحق تھی۔ ایک چپ کا تالا صدیقہ کے ہونٹوں پر بھی لگا رہتا تھا۔ اور وہ بھی خاموشی کی بکل اس گھر کے مکینوں کی طرح لپیٹے رکھتی تھی۔

"جی....." صدیقہ کے ہونٹ محض دھیرے سے پھڑپھڑائے تھے۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اس بات کا کیسے خیال آگیا آپ کو؟" صدیقہ کے ہاتھوں کی حرکت لمحہ بھر کے لیے رک گئی تھی۔

"بس ایسے ہی، تمہارے سفید بالوں کو دیکھ کر۔"

لالہ نیل کٹر سے ناخن تراش رہی تھی۔ مگر اس کا سارا دھیان صدیقہ کی طرف تھا۔

"آپ جانتی تو ہیں۔" صدیقہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"میری ماں نے اماں جی سے دعا کروائی تھی کہ اگر اس دفعہ بیٹا ہوا تو مجھ کو عمر بھر کے لیے آپ کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر دے گی۔ ماں کو بیٹا مل گیا اور اس نے اپنی منت مجھے یہاں بھیج کر پوری کر دی۔" صدیقہ نے سانولے ہاتھوں کی جھریوں میں شاید گزرے ماہ و سال تلاش کرنا شروع کر دیے تھے۔

"اور تم نے خاموشی سے اپنی ماں کی طرف سے دی گئی اس سزا کو قبول کر لیا؟" وہ بجھے دل سے پوچھ رہی تھی۔

"تو اور کیا کرتی۔"

"اس گھٹن سے دل نہیں گھبراتا؟" ایک دم ہی لالہ کا دل گہری کھائی میں جا گرا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" وہ بے چین ہو اٹھی۔

"بس عادت ہو گئی ہے۔" صدیقہ افسردگی سے بولی۔

"یہ کہو صبر کر لیا ہے۔"

"یہ ہی سمجھ لیں۔"

"پھر میرے لیے بھی ایسے ہی صبر [illegible] کہ میں بھی اپنے حال سے راضی ہو جاؤں۔" وہ صدیقہ کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد [illegible] تھی۔

اور اس شب اسے [illegible] نے اپنے کمرے میں بلوالیا تھا۔ نہ جانے انہوں نے لالہ سے کیا بات کرنا تھی۔ پورے دو گھنٹے تک لالہ ان کا انتظار کرتی رہی تھی۔ ان کے سجدے طویل سے طویل تر ہو رہے تھے۔ تیسرا گھنٹہ شروع ہوا تو لالہ کا صبر بھی جواب دے گیا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگی تھی، جب انہوں نے اسے آواز دے کر روکا۔

"رک جاؤ لالہ رخسار۔"

"جی اماں!" وہ رک بھی گئی تھی اور پلٹ بھی آئی،

بڑی جلالی قسم کی آواز تھی۔ لالہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"آج کل کہاں ہوتی ہو؟" پہلا سوال ہی خاصا دہلا دینے والا تھا۔ لالہ کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

"اپنے کمرے میں اماں جی! اور کہاں جانا ہے۔"

"جھوٹ بھی بولنے لگی ہو؟" ان کی آواز میں پھنکار تھی۔

"نن، نہیں اماں جی!" وہ ہکلا کر رہ گئی تھی۔ ان کی شخصیت کا رعب ہی کچھ ایسا تھا، کسی کی جرات نہیں تھی کہ کوئی اونچی آواز میں ان کے سامنے بول سکتا۔ وہ خوف کے مارے زرد پڑ گئی تھی۔ [illegible] کی ماں تھی جس کے سامنے بات کرتے ہوئے [illegible] مرتبہ سوچنا پڑتا تھا بھلا ماں میں ایسی [illegible]

"اماں جی! [illegible] میں کیوں جھوٹ....."

"دیکھو [illegible]" وہ اسے جھڑک کر بولیں۔ "کن کاموں میں جان کھپا رہی ہو آج کل؟ کس راستے پر چل پڑی ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہیں ایک اعلا منصب ملنے والا ہے، یہ شان، یہ رتبہ، یہ بزرگی تمہیں عطا کر دی جائے گی تو پھر کیوں دنیا کے جھمیلوں میں پڑ رہی ہو؟ اپنے نفس کو اور خواہشات کو لگام دے لو۔ یہ ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ یہ جھاڑ، پھونک، یہ سفلی عملیات، یہ سب تمہیں زیب دیتا ہے؟" جلال کے مارے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"مم، مجھے یہ بزرگی، یہ عظمت، یہ منصب، ان میں سے کچھ نہیں چاہیے اماں جی۔" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"تو کیا چاہتی ہے؟" ان کے اندر گویا بھانبڑ جل اٹھے تھے۔ گول گول ڈیلوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

"مجھے یہ جاگیریں، مرتبے اور شان و شوکت نہیں چاہیے۔ مریدوں کی آنکھوں میں موجود عقیدت نہیں چاہیے۔ میں دیوی نہیں بننا چاہتی کہ لوگ آکر مجھے پوجتے رہیں۔ میں اس کمرے میں قید ہونا بھی نہیں چاہتی اماں جی! مجھے ایک جھونپڑی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا کچا پکا مکان، جس کے ہر در بچے میں ننھے منے بچوں کی قلقاریاں [illegible] کی آواز سنائی دے۔"

بھلا اس بے بس [illegible] اور کتنا کھول کھول کر ستاتی کہ اسے بیوی [illegible] چاہیے۔ اسے تارک نہیں بیٹھنا، اس کی خواہشات سن رسیدہ کونپلوں کی دہکتی بھٹی بن [illegible]

"یہ رسم ہے ہمارے خاندان کی۔ جو آدمی ابتر (اولاد نرینہ سے محروم) اس دنیا سے جاتا ہے۔ اس کی بیٹی کو ہی گدی کا وارث بنایا جاتا ہے، تجھے اس گدی پر بیٹھنا ہے ہر صورت۔"

"اماں جی! آپ میری ماں ہیں اور آپ بھی میری بات سمجھ نہیں پا رہیں۔ آپ اپنی بیٹی کو کیوں زندہ درگور کر دینا چاہتی ہیں؟" وہ دونوں ہاتھ جوڑے گویا التجا کر رہی تھی۔

"تجھے غیرت نہ آئی۔ پیر عالی حضرت کی پوتی ہو کر ایک مرد کو لبھانے کی کوشش کرتی ہے۔ آج کے بعد تجھے ٹونے کرتا دیکھ لیا تو یاد رکھنا مائی جھلاں کے تندور میں راتوں رات پھنکوا دوں گی۔" ان کا وجود غیض و غضب سے — کانپ رہا تھا ادھر لالہ رخسار نے حقارت سے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔

"ہونہہ، کیا کر لیں گی آپ... میں ان لفظوں کے تیروں سے گھائل نہیں ہو سکتی۔ جو چاہے کہہ لیں مگر ایک بات تو طے ہے۔ اپنے حصے کی خوشی کو میں کسی اور کی جھولی میں نہیں گرنے دوں گی۔"

اس کمرے کی قبر سے باہر نکلتے ہوئے لالہ رخسار نے حقارت سے سوچا تھا۔ اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ میں ایک صراحی موجود تھی۔ جس کو گلرونڈے سے بھرا ہوا تھا۔ کھجور کی گٹھلیوں کی ایک لمبی سی مالا تھی جو اس نے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ دوسری ہتھیلی پر ایک دیا رکھا ہوا تھا۔ دیا جل رہا تھا اور اس دیے میں تعویذ بھی موجود تھے۔ جو دھیرے

http://www.pakfunplace.com

دھیرے سلگ رہے تھے۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتی جارہی تھی۔

اس کا رخ حیام کے کمرے کی طرف تھا۔ کچھ دیر بعد وہ نیند میں دھت حیام کے پلنگ کے ارد گرد گول گول گھوم رہی تھی۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ اور وہ تعویذوں کے دھویں کو پورے کمرے میں پھیلا دینا چاہتی تھی۔ اسے حیام کی نیند ٹوٹ جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کیونکہ آج دودھ میں اس نے نیند کی گولیاں گھول کر اسے پلادی تھیں اور یہ کام وہ پچھلے ایک ہفتے سے کر رہی تھی۔ اس کام سے مطمئن ہو کر وہ احتیاط سے دروازہ بند کرکے باہر نکل گئی تھی۔

اس سے اگلی رات بھی لالہ نے یہی عمل دہرایا تھا۔ اس رات بھی وہ حیام کے گرد چکر لگا کر کھلے آسمان تلے چلی آئی تھی۔ اب وہ سر سے چادر اتار رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے سر کے بال کھول دیے اور پیشانی کو ٹھنڈے فرش پر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"اے اللہ! میں نہیں جانتی' یہ کام ٹھیک ہے یا غلط' یہ گناہ کا کام ہے یا ثواب کا۔ حیام کا دل میری طرف مائل ہو رہا ہے اور یہ میرے لیے بڑی کامیابی ہے مالک! میں تیرے بندوں کی دیوی نہیں بن سکتی۔ وہ بندے تیرے' اور آئیں میرے پاس' اور میں بغیر علم کے بغیر علم کی سوجھ بوجھ کے انہیں گمراہ کردوں' نہیں مالک! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اس گدی پر تیرے عبادت گزار' متقی اور پرہیزگار بندے بیٹھنے کے اہل ہیں۔ جو تیری سچی بندگی میں مشغول رہتے ہیں۔ جن پر نفس حاوی نہیں ہوتا۔ خواہشیں جن سے دور ہوتی ہیں جو گھر اور ور کی امید نہیں کرتے' جو چاہے جانے اور سراہے جانے کی طلب نہیں کرتے۔ جن کے دل میں کی چاہ نہیں ہوتی۔ اور میں بھلا کون ہوں؟ ایک عورت جو اپنا جائز مقام اور نام چاہتی ہے۔ میں ایک ایب نارمل زندگی کی تمنائی نہیں۔ یا اللہ! مجھے توقیر بیگم نہیں بننا اور نہ ہی میں خانقاہ میں [illegible] عورتوں جیسی زندگی گزارنا چاہتی ہوں [illegible] درخت اور قرآن پاک سے نکاح [illegible] مجھے اس غیر فطری زندگی سے بچالے میرے مالک۔"

وہ اپنی پیشانی پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی اور اس کمرے کی چھت کے نیچے توقیر بیگم اپنے چہرے پر جلال کے سارے رنگ لیے تسبیح پڑھتے ہوئے دائیں بائیں سر ہلا رہی تھیں۔ ان کے چہرے کی پراسرار لکیریں۔ اور ان لکیروں میں توقیر بیگم کی اپنی زندگی کی داستان کا لفظ لفظ چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔

"کبھی نہیں' کبھی نہیں' تجھ کو اسی مقبرے میں بجنا ہے میری بچی' یہ مقبرہ ہی تمہاری زندگی کا حاصل ہے۔ میری بدصورت اور کریہہ شکل والی جوانی بھی اسی مقبرے میں گل سڑ گئی تھی۔ تیرا حسن' تیری دوشیزگی اور تابناکی و درخشندگی بھی اسی مقبرے میں گل سڑ جائے گی۔ حیام تیرا کبھی نہ ہو پائے گا میری جان! کیونکہ میں حیام کو ایسا کرنے نہیں دوں گی۔ پیرزادگی کی نسل کی اس آخری عورت کو اپنے باپ' دادا کے گناہوں اور جرم عظیم کی کچھ تو سزا پانی چاہیے نا۔" وہ وحشت کے عالم میں ان دیواروں سے پوچھ رہی تھیں۔ جو ہمیشہ کی طرح خاموش' چپ اور اداس تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے عمل کا آج اٹھارواں دن تھا۔ سائیں جی نے کہا تھا کہ اس کی منزل اب بہت قریب ہے۔ ایسے حالات میں اسے مزید ثابت قدم رہنا ہے۔ وہ آج پھر وہی عمل دہرا رہی تھی۔ رات کا انتہائی پہر تھا۔ ہر سو ہولناک سناٹا اور [illegible] چھائی تھی۔ وہ عمل کے انتہائی حصے میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا حیام کا شعور گہری نیند سویا ہوا ہے۔ لاشعور اس پر حاوی تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں' مگر دراصل وہ نیند میں تھا اور نیند کی حالت میں ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور نیند ہی کی حالت میں چلنے اور بولنے لگا تھا۔ کھویا کھویا سا سویا سویا سا۔ سائیں جی کا عمل کامیابی کے آخری کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ حیام کی سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے والی دماغی صلاحیتوں کو سلب ہو چکی تھیں۔ یہ اثر لمحاتی ہوتا تھا۔ یعنی کچھ گھڑیوں پر مشتمل'

تعویذوں کے جلنے کا اثر اس قدر شدید ہوتا تھا کہ حیام سدھ بدھ بھول کر دوبارہ نیند میں دھت ہو جاتا۔ لیکن پریشانی یہ تھی کہ نیند کی حالت میں کہی وہ اپنی ہر بات بھول جاتا تھا۔

نہ جانے یہ کیسا عمل تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ وہ گھبرا گئی تھی کہ کہیں حیام کی دماغی حالت ان تعویذوں کی نحوست کی وجہ سے ابتر نہ ہو جائے اور عام حالت میں بھی حیام پر اس کا اثر قائم نہ رہے۔ اس نے اپنے خوف کو سائیں جی کے سامنے ظاہر کردیا تھا۔ وہ پریشان تھی کہ کہیں شادی کے بعد بھی حیام پر ایسی کیفیات طاری نہ رہیں۔

سائیں جی نے اسے [illegible] تسلی دی تھی۔ انہوں نے لالہ کو [illegible] کا علم اتنا سخت نہیں' کام ہو جانے پر حیام کی ذہنی حالت پر کوئی اثر نہیں رہے گا۔ حیام [illegible] دھیرے ہی سہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ عام طور پر رات کو نیند کی حالت میں نہیں چلتا تھا۔ مگر جب بھی لالہ مہینے میں ایک مرتبہ اپنا عمل دہراتی' تب تعویذوں کی گھبراہٹ اور عمل کی سختی اس کی طبیعت کو حد درجہ خراب کردیتی تھی اور یہ "عمل" مہینے میں ایک مرتبہ ہوتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حیام کو صبح تک اپنی رات والی کیفیت بھول جایا کرتی تھی۔ اسے قطعا" کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔

اس دن حیام بہت خوش تھا۔ اسے نوکری مل گئی تھی۔ اور وہ اپنی خوشی سب سے پہلے لالہ سے شیئر کرنے گھر بھاگا بھاگا چلا آیا تھا۔

"مجھے جاب مل گئی۔" اس کی بے ساختہ خوشی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

"مبارک ہو۔" لالہ نے اپنی خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

"کیا مجھے خوش ہونا چاہیے تھا؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولی۔ دراصل وہ اس کے جواب کی گہرائی کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں۔"

"پر کیوں؟ نوکری تو تمہیں ملی ہے۔" لالہ نے معنی خیزی سے کہا۔

"بس ایسے ہی۔" حیام سے جواب بن نہیں پایا تھا اور پھر وہ اس کے پاس رکا بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں لالہ اس کے سامنے ہوتی تو وہ عجیب و غریب قسم کی کیفیات کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا گویا اس کا ذہن دھیرے دھیرے سونے لگا ہے۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کسی قوت کے زیر اثر ہیں۔ اور وہ خود کو لالہ کے سامنے مکمل طور پر بے بس پاتا ہے۔ اسے یوں لگتا تھا گویا وہ لالہ کے سامنے کبھی اپنی مرضی کی گفتگو نہیں کر پائے گا۔ وہ صرف لالہ کی زبان میں بات کرے گا۔ اور اس کے ذہن سے ہی سوچے گا بھی۔ بھلا یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ حیام سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ اپنے اندر کی گھٹن' بے چینی اور گھبراہٹ کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی' صرف کچھ عرصے سے وہ ان کیفیات کے زیر اثر تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چاند کی پھر—— آخر راتیں تھیں۔ لالہ پچھلے صحن میں مٹی کی کٹوری میں تیل ڈالے عمل کرنے میں مصروف تھی اور جب اس کا عمل اختتام کو پہنچنے لگا تو صدیقہ کی آواز نے اسے کپکپا کر رکھ دیا۔

"کیوں آئی ہو میرے پیچھے۔" وہ پھنکار کر بولی تھی۔

"اماں جی نے آپ کو بلوایا ہے۔" صدیقہ کچھ خوف زدہ تھی۔ یقینا" اماں جی کو دھوئیں کی بدبو اور تعویذ جلانے کی مخصوص مہک نے چونکا دیا تھا۔

"تم چلو' میں آتی ہوں۔" وہ مٹی کی کٹوری کو ایک گملے کی اوٹ میں کرکے توقیر بیگم کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ توقیر بیگم جاگ رہی تھیں اور اس وقت جائے نماز کے بجائے کمرے میں بڑے جلال کے عالم میں ٹہل رہی تھیں۔

"جی اماں!" اس نے سر جھکائے ادب سے کہا۔ وہ

http://www.pakfunplace.com

کافی دیر اسے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی تھیں اور پھر کرخت دار آواز میں پوچھنے لگیں۔

"کیا چاہتی ہے تو؟ کیا چاہیے تجھے؟"

"حیام۔" لالہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"بے غیرت' بے شرم! تیرے منہ میں انگارے پڑیں بدبخت' بے حیائی کی بات کرتی ہے۔" وہ بپھر کر اس تک آئی تھیں اور پھر اس کے منہ پر زور کا طمانچہ جڑ دیا۔ "یہ سفلی عمل' یہ جادو ٹونے' ان سے تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

"یہ عمل' یہ ٹونے مجھے خوشی اور سکون نہیں دیتے۔ میں یہ سب چھوڑ دیتی ہوں اماں جی! پر میری ایک بات سمجھ لو نا۔ آپ۔ آپ میری شادی حیام سے کردو۔ اس جاگیر اور دھن دولت کے سارے اختیار حیام کو دے دینا' اور میں ایک عام عورت جیسی زندگی کو اپنا لوں گی۔ آپ تو میری ماں ہو نا اماں جی! اور مائیں تو بن کہے اندر کا حال جان لیتی ہیں' پھر میرے اندر کی خواہشوں کا حال آپ تک کیوں نہیں پہنچتا۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑے سسک رہی تھی جب توقیر بیگم نے ایک دم دھواں دھار رونا شروع کردیا تھا۔

"میں سب سمجھتی ہوں' پر پھر بھی مجبور ہوں۔"

"کیسی مجبوری اماں جی! آپ کے سر پر کون تلوار لے کر کھڑا ہے؟ آپ اپنے فیصلوں میں بااختیار ہیں۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"میں اپنے بزرگوں کی مجرم نہیں بن سکتی۔ میں وعدہ خلافی نہیں کرسکتی۔" انہوں نے دوٹوک تحکم بھرے لہجے میں کہا تھا۔ لالہ رخسار نے ایک زخمی نظر سے اپنی ماں کے بدصورت چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس لمحے اسے اپنی ماں کا چہرہ اور بھی بگڑا اور بدصورت نظر آیا۔ یوں کہ اس کا دل بری طرح سے متلا گیا تھا اور وہ کسی بپھرے ہوئے طوفان کی طرح اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"اماں جی! تم سب جانتے بوجھتے میری رگوں میں زہر اتارنا چاہتی ہو مگر میں اپنی زندگی کو تمہارے نام نہاد بزرگوں کی غلط رسومات کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی۔" وہ ان کی اجازت کے بغیر پہلی مرتبہ تیز قدموں سے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ اور یہ لالہ رخسار کی طرف سے کھلا بغاوت کا اعلان تھا۔

"تو کچھ نہیں کرپائے گی۔ میری اجازت کے بغیر حیام سانس بھی نہیں لیتا۔ بھلا تیرے ان عملیات کا کتنی دیر تک اثر رہے گا؟ ایک بات تو طے ہے۔ پیر ذاکر کی بیٹی کے بالوں میں سفیدی اتار کر ہی دم لوں گی۔ اس کے ہاتھ پر بھی کبھی مہندی کا رنگ نہیں رچے گا۔ کبھی چوڑی اور پازیب کی آواز نہیں آئے گی۔ کبھی ہار سنگھار اور خوشبو کی باس نہیں اٹھے گی اس کا وجود قبرستان نہ بنادیا تو میرا نام توقیر بیگم نہیں۔"

انہوں نے حقارت سے سوچا تھا اور پھر جائے نماز بچھا کر عبادت میں مشغول ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

توقیر بیگم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ اس کے سارے عمل اور ٹونے بیکار گئے تھے اور گھر میں رخشندہ کی ڈولی اتر آئی تھی۔ لالہ رخسار کے اندر گویا آگ کے بھانبھڑ جل اٹھے تھے۔ یہ شکست نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ ہار' جیت کے معنوں میں الجھنا چاہتی تھی۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ رخشندہ کے آجانے سے اس کی زندگی کے دروازے بند ہوگئے ہیں۔ اب کوئی بھی امید باقی نہیں بچی تھی۔ آگے کھائی اور پیچھے کنواں تھا۔ وہ بھلا جاتی بھی تو کہاں۔

مگر ہمت ہار کر بیٹھنا اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی اگر اس نے ہمت ہار دی تو ہمیشہ کے لیے ایک قبر میں قید ہوجائے گی۔

مگر مسئلہ اس عورت کا تھا جو اپنے جیتے جاگتے وجود کے ساتھ ایک حقیقت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس عورت کو بھلا راستے سے کیسے ہٹایا جاسکتا تھا۔ وہ اسے زہر دے کر مارنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے رخشندہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے سائیں جی کے تعویذوں کو ہتھیار بنایا تھا۔ اسے پوری امید تھی۔ حیام کے ایب نارمل رویے اسے نیند کی حالت میں چلتے بولتے دیکھ کر اور کتنا صبر کرے گی رخشندہ اس گھر میں ٹک پائے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ حیام کے رویے سے رخشندہ خوف زدہ ہو کر خود ہی واپسی کی راہ پکڑے۔ اور لالہ' رخشندہ کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہر روز ایک نئے طریقے سے اس کے سامنے آتی تھی۔ اور سائیں جی کے اس "عمل" کو مہینے میں دو مرتبہ دہرانے لگی تھی تاکہ رخشندہ جلد از جلد یہاں سے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائے۔ وہ حیام کو پاگل اور نیم دیوانہ سمجھ لے جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر چلتا پھرتا بولتا تھا۔ وہ اسے مخبوط الحواس سمجھ لے۔ مگر اس کی ساری کوششیں اس وقت بیکار ہو گئی تھیں جب اس نے رخشندہ کو کسی فون پر بات کرتے سن لیا۔

"وہ حیام کو چھوڑنے کے بجائے اس کے علاج کے لیے فکر مند ہے۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ حیام کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے رخشندہ نے کسی زرگون غنی کو گھر بلایا تھا۔ لالہ رخسار کی ساری تدبیریں الٹ رہی تھیں۔

اس نے ایک دفعہ پھر سفلی عملیات کا سہارا لیا تھا۔ وہ رات رات بھر چلے کاٹنے لگی تھی۔ وہ حیام کے نام کا جنتا ورد کررہی تھی۔ وہ اتنا ہی لالہ کی حدود اور کھینچے گئے دائرے سے باہر نکل رہا تھا۔ رخشندہ کا یقین اور محبت اپنا اثر کررہی تھی اور توقیر بیگم بھی اس کے جادو کا توڑ کرنے کے لیے قرآنی آیات پڑھتی رہتی تھیں وہ یہ ساری ریاضت نہ تو رخشندہ کی ہمدردی میں کررہی ہیں اور نہ حیام کی محبت میں۔ وہ تو صرف لالہ رخسار کا یقین توڑنا چاہتی تھیں۔

"وہ لالہ رخسار کے اندر سے ہر جذبے' امنگ' خواب اور خواہش کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتی تھیں۔ وہ دراصل لالہ رخسار کو اپنے جیسی زندگی —— بخشنا چاہتی تھی۔

پھر ایک دن کیا ہوا۔ لالہ رخسار کو جیتنے کا ایک موقع مل گیا۔ زرگون غنی کی صورت میں جسے —— رخشندہ نے گھر بلایا تھا۔ لالہ کا خیال یہی تھا۔ وہ غنی سے اپنے لیے یا حیام کے لیے دوا وغیرہ لے گی۔

لالہ کے ذہن نے تیزی سے منصوبہ بنالیا تھا۔ اس نے صدیقہ کو اپنا ہمراز بنا کر کمرے کے دروازے بند کرکے میں سونپ دیا۔

حیام کے آنے کا وقت قریب تھا اور لالہ حیام کے آنے سے پہلے توقیر بیگم کو ایک من گھڑت داستان سنا کر مشتعل کرچکی تھی۔ کمرے میں بند غنی اور رخشندہ کو دیکھ کر مزید بھلا کسی ثبوت کی ضرورت تھی؟ حیام اور توقیر بیگم دونوں رخشندہ سے بدگمان ہوچکے تھے۔ اور دونوں ہی اسے گھر نکالنے کے بعد مطمئن تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے حجروں میں بند تھے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔

لالہ کی خواہش پوری ہوچکی تھی۔ رخشندہ اس کے راستے سے ہٹ گئی تھی۔ اب تو صرف حیام تک پہنچنا تھا۔ اور یہ بھلا کیسے ہوگا؟ یہ سوچنا ابھی باقی تھا۔ منزل بہت قریب تھی اور لالہ کا خیال تھا وہ سائیں جی سے کہہ کر اپنا اور حیام کا نکاح چھپ کر پڑھوائے گی اور وہ دونوں یہ حویلی چھوڑ کر چلے جائیں گے مگر لالہ رخسار یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ساری تدبیروں پر "تقدیر" حاوی ہوجائے گی۔ تقدیر جو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے جو اٹل ہوتی ہے۔

رخشندہ حیام پھر سے آگئی تھی۔ حیام اسے لے آیا تھا۔ کیوں؟ کیسے؟ کس طرح؟ وہ گویا پاگل ہو کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم آگئی ہو؟" لالہ کا لہجہ بکھرا بکھرا تھا۔ گویا اس نے اپنی ہار تسلیم کرلی تھی۔ وہ رخشندہ حیام کے آگے گھٹنے ٹیک گئی تھی۔

"ہاں!" آج کی رخشندہ کل کی رخشندہ سے بہت مختلف تھی۔ بااعتماد' پراعتماد' مضبوط۔ اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑی ہوئی۔ یہ اعتماد' یہ مضبوطی' حیام کی بخشی ہوئی تھی۔

"اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ مجھے لے کر آئے ہیں۔ تمہارا پلان ناکام ہوگیا۔ تمہارے لگائے گئے الزام غلط ثابت ہوگئے۔ انہوں نے مجھ پر لگائے

الزام، بہتان کی معافی مانگ لی تھی۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ شرمندہ تھے پچھتا رہے تھے اور میں نے انہیں معاف کر دیا۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ بھلا میں اپنے گھر سے نکل کر کہاں جاتی؟ میرے دل میں حیام کے لیے بہت محبت تھی۔ اس محبت نے مجھے کسی اور طرف بھٹکنے نہیں دیا تھا۔" وہ بہت دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ بہت صبر اور حوصلے کے ساتھ۔

"محبت!" لالہ نے ویران ویران نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں، محبت!" رخشندہ کا لہجہ بلا کا ٹھہرا ہوا رواں تھا۔ "وہ محبت جو مجھے حیام سے ہے۔ وہ محبت جو حیام کو مجھ سے ہے۔ اور وہ محبت جو تمہیں نہ حیام سے ہے اور نہ کسی اور سے۔" وہ بہت تول تول کر اور سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ لالہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"تم نے سچ کہا۔ مجھے حیام سے محبت نہیں۔" وہ چوکھٹ تھامے تھامے ویران ویران سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تمہیں واقعی حیام سے محبت نہیں تھی لالہ! اگر تمہارے جذبے بے کھوٹ ہوتے۔ نیت خالص ہوتی تو حیام تمہیں مل ہی جاتا۔ وہ تم سے محبت بھی کر لیتا۔ اس نے تمہیں اپنا بھی لینا تھا۔ دراصل تم نے دل میں محبت کو نہیں صرف غرض کو جگہ دی۔ تم نے اپنے حصے کی "خوشی" چھیننے کے لیے غلط راستے اختیار کر لیے۔ تمہاری خواہش غلط نہیں تھی۔ خواب غلط نہیں تھے۔ وہ راہ غلط تھی، جس پر تم بغیر سوچے سمجھے چل پڑیں۔ سائیں جی کی جھونپڑی تک جانے والا راستہ دراصل گمراہی کا راستہ تھا۔ جادو ٹونے، عملیات اور گرہوں میں پھونکیں مارنا، یہ بدترین کبیرہ گناہ ہے۔ ہم دوسروں کو تکلیف دینے اور اجاڑنے کی کوشش میں خود پر ظلم کرتے ہیں۔ ہم صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے پھر بھی تم پر اپنا کرم کیا۔ انعام کیا۔ اپنی رحمت کا سایہ نہیں ہٹایا۔ میں وہی لائی ہوں تمہارے لیے خوشی کا سندیسہ۔ خوش خبری لے کر۔

اس وقت جب میں اس گھر سے ننگے سر اور ننگے پاؤں حویلی سے نکل رہی تھی۔ تب میں نے آخری دفعہ اس حویلی کی بالائی منزل پر تمہیں کھڑا دیکھا تھا اور میرے ساتھ زرگون غنی نے بھی تمہیں دیکھ لیا۔ اور اس کا ایک نظر دیکھنا، تمہارے لیے خوشی کی کہکشاں اتار گیا تھا۔ اس نے تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے۔ پسند کر لیا ہے۔ تمہیں زندگی کی حقیقی خوشیوں سے سرفراز کرنے کا میں نے خود سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اب یہ عہد میں نے حیام کے سپرد کر دیا ہے۔ اب یہ حیام کی ہمت پر منحصر ہے کہ وہ توقیر بیگم سے کس طرح یہ جنگ جیتے گا۔ کیونکہ حیام یہ چاہتا ہے۔ اس گھر میں پیدا ہونے والی کسی بھی بیٹی کو ایک زندان نہ دیا جائے بلکہ اسے قانون فطرت کے تحت وہ سب کچھ دیا جائے۔ جسے اللہ پاک نے اس کے لیے حلال اور جائز قرار دیا ہے۔

میں اور حیام تمہارا زرگون غنی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بہت اچھا ہے لالہ! بہت زندہ دل، وہ تمہیں ایک اور دنیا میں لے جائے گا۔ جہاں صرف خوشیاں ہوں گی، رونقیں ہوں گی، ستارے ہوں گے۔ تمہاری مردہ سوچ اور گھٹن کو تازگی میں بدل دے گا۔ وہ تمہیں اس قید خانے سے نجات دے گا۔ ایسا قید خانہ جس کو تمہاری غیر حقیقی ماں نے تمہارے لیے تیار کر رکھا ہے۔ تم ہر زنجیر سے آزاد ہو جاؤ گی۔"

رخشندہ پھوٹ پھوٹ کر روتی لالہ کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے لالہ کے حسین چہرے پر پھیلے آنسوؤں کو پیار اور نرمی سے صاف کر دیا۔

"یقین کرو گلاب، شبنم اور اوس میں بھیگ کر تمہارے چہرے کی طرح کا ہو جاتا ہے۔"

"مجھے معاف کر دو رخشندہ! میں بہت بری ہوں، بہت گناہ گار ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ مجھے معاف کر دو رخشندہ! میں نے اپنے لیے دوزخ خرید لی۔ میں سفلی عملیات کے پیچھے بھاگتی رہی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر جس کے قبضہ قدرت میں ہر ایک ذی نفس کی جان ہے۔ بھلا اس کے حکم کے بغیر یہ جادو اور عمل اپنا اثر دکھا سکتے تھے۔ میں بھی بھٹک کر اسی پاک ذات کی طرف لوٹی تھی۔ مجھے اپنے اللہ کی طرف ہی لوٹنا تھا۔ اور پچھلے پہر کی خاموشی میں میرے ندامت میں بہنے والے آنسو اسے اتنے پسند آئے کہ میرے اللہ نے مجھے معاف کر دیا۔ مجھے نواز دیا۔ مجھے زندگی بخش دی۔"

لالہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو رخشندہ! میں نے تمہارے لیے برا سوچا مگر تم نے میرے۔۔۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ رخشندہ کے پیروں پر رکھ دیے۔

"میں نے کسی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں نے یہ سب اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے۔ پلیز! مجھے گناہ گار نہ کرو۔ اور اپنے ان آنسوؤں کو پونچھ لو۔ بہت رو لیا ہے۔" رخشندہ نے اس کے آنسو پونچھ کر بازوؤں سے اٹھا کر گلے لگا لیا تھا۔ اور وہ اشک ندامت بہاتے بہاتے نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

توقیر بیگم کے فیصلوں سے ٹکرانا اتنا آسان نہیں تھا مگر پہل تو اسی وقت ہو گئی تھی جب حیام، رخشندہ کو ان کے منع کرنے اور حکم دینے کے باوجود لے آیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ رخشندہ اس گھر میں نہیں آسکتی۔ مگر حیام رخشندہ کو لے آیا تھا۔ گھر میں ایک سرد جنگ کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا۔

رخشندہ کا اس گھر میں دوبارہ آنا بھی کسی طور ممکن نہیں تھا۔ حیام اس سے نفرت کی حد تک بدگمان ہو چکا تھا۔ وہ اس کی صورت تک بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

مگر اس شب حیام نے صدیقہ اور توقیر بیگم کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ صدیقہ، توقیر بیگم کو بتا رہی تھی۔ اور حیام سن سائے میں آتا جا رہا تھا۔

"اماں جی! لالہ بی بی نے رخشندہ بی بی کو تو راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اب وہ حیام پیر کو نکاح کا پیغام بھجوا رہی ہیں۔ اگر میں نے بات آگے نہ پہنچائی تو وہ خود کر لیں گی ان سے بات۔"

صدیقہ نے وہ سارا منصوبہ بھی دہرا دیا تھا جو لالہ اور توقیر بیگم نے رخشندہ کو منظر سے ہٹانے کے لیے بنایا تھا۔ حیام تو گویا ششدر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اماں جی اور لالہ اس قدر گھٹیا منصوبہ بنا کر رخشندہ کو گھر بدر کروا دیں گی۔

ایک وہ عورت تھی جو حیام کی ماں کی جگہ تھی اور دوسری اس خاندان کی آخری گدی نشین تھی۔ جس کے بارے میں توقیر بیگم نے اسے بتا رکھا تھا کہ لالہ کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس خاندان کا اصول تھا کہ جس آدمی کی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ اس کی بیٹی کو گدی کا وارث بنا دیا جاتا تھا۔

لالہ کی بغاوت کو توقیر بیگم کسی خاطر میں نہیں لا رہی تھیں۔ مگر رخشندہ نے جب آواز بلند کی تو ان کو کھٹکنا اور سوچنا پڑا۔ دراصل رخشندہ کی بغاوت سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے گھر سے نکال دینا چاہتی تھیں اور یہ موقع انہیں جلد ہی میسر آگیا تھا۔ اپنے تئیں انہوں نے رخشندہ کو رنگے ہاتھوں غنی کے ساتھ پکڑا تھا۔ سو وہ پر یقین تھیں کہ حیام اتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ رخشندہ کو واپس لے آئے۔

مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ حیام ساری حقیقت سے واقف ہو جائے گا اور رخشندہ ایک دفعہ پھر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ بے خوف، نڈر اور پراعتماد۔ توقیر بیگم آگ کی طرح بھڑک اٹھیں۔

"کیوں آئی ہو یہاں، نیچ ذات کی عورت۔"

"خود نہیں آئی۔ آپ کا بیٹا لے کر آیا ہے۔" وہ بھی سخت کٹیلے لہجے میں بولی۔ "میں اس گھر سے کبھی نہ جانے کے لیے آئی ہوں۔ ایک بات تو آپ کی نظر میں واضح ہو چکی ہو گی کہ سچ ہمیشہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ جیسے میری بے گناہی حیام کی نظر میں ثابت ہو گئی۔" وہ گہرے کاٹ دار طنزیہ لہجے میں دھاڑی۔

"کیا کرنے آئی ہے تو میرے کمرے میں؟" ان کے

http://www.pakrunplace.com

سرخ ڈیلے باہر ابلنے کو بے تاب تھے۔

"صرف یہ بتانے کہ لالہ رخسار کا ماہر سائیکاٹرسٹ زرگون غنی سے جمعہ کی شام کو نکاح ہے۔ اگر آپ شرکت کرنا چاہتی ہیں تو موسٹ ویلکم اگر نہیں آئیں گی تو پھر بھی یہ نکاح ہو کر رہے گا۔" اس نے گویا توقیر بیگم کے سر پر بم بلاسٹ کر دیا تھا۔

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تو ہمارے رواجوں اور رسموں کو توڑے گی۔ میں تیری بوٹیاں نوچ لوں گی بدبخت عورت! تو کون ہوتی ہے میری بیٹی کے فیصلے کرنے والی۔" غصے اور تنفر کی وجہ سے ان کا دماغ گھوم رہا تھا۔ فشار خون بلند ہو جانے کی وجہ سے ان کی کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔ "وہ سنگسار کرے گی ہرگز نہیں۔"

"مت ظلم کریں۔ توقیر بیگم! اپنی زندگی اور نصیب کے لکھے عذاب لالہ کی جھولی میں مت ڈالیں۔ وہ آپ کی نہ سہی "آپ کے شوہر کی تو اولاد ہے نا۔ پر آپ نے اس پر ظلم کیا۔ اسے زندان میں قید کیا۔ آپ کے اختیار میں سب کچھ تھا مگر آپ نے اسے نہ تعلیم دی نہ اچھی زندگی دی نہ خوشی دی۔ نہ مرضی سے سانس لینے دیا۔ آپ نے اس کے اندر گھٹن بھر دی تھی۔ اور لالہ رخسار نے اس گھٹن سے باہر نکلنے کے لیے گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا۔ آپ جانتے بوجھتے اسے گناہ کرتے دیکھتی رہیں۔

وہ تعویذ گنڈوں اور جادو ٹونے کے چکر میں اپنا اصل بھولتی جا رہی تھی۔ آپ نے اسے ذہنی طور پر بیمار کر دیا تھا۔ آپ نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا مجھے اس گھر سے نکالنے کے بعد آپ نے اسے ایک زندان میں ایک کمرے میں قید کر دینا تھا اور وہ وقت دور نہیں تھا۔ جب لالہ پر ہسٹریا کے دورے پڑنے شروع ہو جانے تھے۔ پھر اسے زنجیروں میں باندھ دینا تھا وہ مر جاتی تو آپ کی کون سی حس کو سکون میسر آنا تھا توقیر بیگم! اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ پیر ذاکر کی محبوب بیوی فیروزہ کی اولاد تھی۔ وہ آپ کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے؟" رخشندہ کے زہر میں بجھے لفظوں نے توقیر بیگم کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہاتھ میں آئینہ پکڑ کر کھڑی تھی۔ اس آئینے میں توقیر بیگم کی شکل اور بھی کریہہ نظر آ رہی تھی۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگی تھیں۔ سچ کھل گیا تھا اور وہ بھی ایک غیر عورت کے سامنے بھلا رخشندہ کو ان کے ماضی کے بارے میں کیسے خبر ہوئی؟! اس سوچ نے انہیں نیم جاں کر دیا تھا۔

"آپ نے اپنے حصے کے عذاب اس لیے لالہ رخسار کی جھولی میں ڈال دیے تھے توقیر بیگم کہ آپ خود ایک بیاہتا کنواری تھیں۔ لالہ کے باپ نے آپ کو دھتکارا تھا۔ اس لیے آپ اس کی بیٹی کو زندگی کی ہر رنگینی سے دور کر دینا چاہتی تھیں۔"

رخشندہ نے آخری زہر میں بجھا تیر پھینک کر ان کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی۔ ادھر توقیر بیگم پر گویا دورے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے جسم نے پھڑکنا شروع کر دیا تھا اور صدیقہ، رخشندہ کے ہمراہ لالہ رخسار کے لیے سنگھار کا سامان لینے چل دی تھی۔ صدیقہ اس عورت کی چیخوں سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

رخشندہ پر سارے سچ اور حقیقتوں کو کھولنے والی بھی صدیقہ ہی تھی اور اب وہ مزید توقیر بیگم کے گھٹن زدہ کمرے میں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اور توقیر بیگم مسلسل چلائے جا رہی تھیں۔

توقیر بیگم اور پیر واثق دو ہی بہن بھائی تھے۔ دونوں پیر عالی حضرت کی سگی بہن کی اولاد تھے۔ توقیر بیگم کا عقد پیر عالی حضرت نے اپنے اکلوتے بیٹے پیر ذاکر سے کر دیا تھا جبکہ پیر ذاکر اپنی خالہ زاد فیروزہ سے محبت کرتے تھے۔ ان دونوں نے چھپ کر شادی کر لی تھی۔ پیر عالی حضرت نے ذاکر کو گھر بدر کر دیا اور توقیر بیگم کے حوالے کر دی۔ توقیر بیگم رخصتی کے انتظار میں مزید دس سال بھی لٹا چکی تھیں جب ایک دن پیر ذاکر اور فیروزہ کی میتیں آ گئیں۔

ان کے مر جانے کے بعد توقیر بیگم پر بیوی کا لیبل لگا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ ان کا کام صرف پیر ذاکر اور فیروزہ کی بیٹی کا خیال رکھنا تھا جس کی صورت میں وہ اپنی سوکن کا چہرہ دیکھ دیکھ کر سلگتی رہتی تھیں۔

جو نفرت حقارت انہیں پیر ذاکر کی طرف سے ملی تھی۔ وہ توقیر بیگم بھلا نہیں سکتی تھیں۔ پیر ذاکر نے انہیں ان کی بدصورتی کی وجہ سے مسترد کیا تھا اور توقیر بیگم کو فیروزہ کی بیٹی کے حسن سے نفرت تھی۔

اس دن ان کا پورا وجود زہر زہر ہو گیا تھا جب لالہ نے اپنے منہ سے حیام کے ساتھ شادی کی بات کی تھی۔ بھلا وہ اپنے بھتیجے کا اس ڈائن کی بیٹی سے نکاح کر سکتی تھیں۔ جو ان کا سہاگ کھا گئی اور وہ سہاگ کا جوڑا اور چوڑیاں بن پہنے ہی جلا کر اور توڑ کر حجرہ نشین ہو گئیں تب انہوں نے آناً فاناً ایک متوسط گھرانے کی لڑکی سے حیام کو بیاہ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لالہ کے حسن سے متاثر ہو کر ایک دن حیام ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے۔

لالہ کے سارے حربے بے کار گئے تھے۔ وہ لالہ کو پوری طرح سے برباد کر چکی تھیں۔ جب حیام کی دلہن ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مگر وہ اسے بھی اپنی راہ سے ہٹانا فارغ کر چکی تھیں اگر حیام اسے پھر سے نہ لے آتا وہ ایک دفعہ پھر ان کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر انہیں آئینہ دکھا رہی تھی۔ اور اس کے لفظوں کے کوڑوں نے توقیر بیگم کو لہولہان کر دیا۔

"آپ اگر چاہتیں تو اپنے حصے میں آیا دیا جلا کر اپنے نام اور اپنے وجود کو امر کر سکتی تھیں۔ خود کو آنے والی نسلوں کے لیے یادگار بنا دیتیں مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی خوشیاں حاصل نہ کر سکیں مگر کسی کے خواب نوچنے کا بھی کوئی حق نہیں تھا آپ کو توقیر بیگم! میں نے اپنے حصے کی مشعل روشن کر دی ہے۔ میرا دل مطمئن ہے میرا ضمیر مطمئن ہے۔" رخشندہ کے لفظوں کے کوڑے ہر روز ان کے دماغ پر برستے رہتے تھے اور وہ ان لفظوں کے زہر سے نیل نیل ہو جاتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

جمعہ کی شب لالہ اور غنی کا نکاح ہو گیا تھا۔ اسے شہر کی مشہور ماہر بیوٹیشن نے سجایا سنوارا تھا۔ وہ بیاہ کر نوشابہ بھابھی کے گھر گئی تھی۔ وہ ان زنجیروں کی قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ حویلی توقیر بیگم نے خوب چلا چلا کر واویلا کیا تھا ان کی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ لالہ اور غنی کچھ عرصے بعد آئرلینڈ چلے گئے تھے۔ بھابھی اور بھائی بھی لائبہ کے پاس یورپ چلے گئے۔ یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا وہ چھ ماہ غنی اور لالہ کے پاس اور چھ ماہ لائبہ کے گھر رہتے تھے بھابھی کے سیاحت کے شوق بھی خوب پورے ہو رہے تھے۔

اور رہی رخشندہ تو اس نے حیام کے مجبور کرنے اور بہت دفعہ اصرار پر بھی اس حویلی کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے اس حویلی کو نئے سرے سے سجایا اور سنوارا تھا۔ رخشندہ نے اپنی خدمت گزار صدیقہ کی تین بچوں کے باپ سے شادی کروا دی تھی۔ اس حویلی کی دیواروں سے اب کسی کی سسکیاں سنائی نہیں دیتی تھیں اب ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں وسیع و عریض باغ میں رخشندہ اور حیام کے بچے کھیلتے تھے۔ توقیر بیگم کے پاس صرف پچھتاوے تھے۔

"تم نے سچ کہا تھا رخشندہ میں نے اپنے حصے کا دیا نفرت، حسد، بغض کی نذر کر دیا تھا آج اسی لیے خود بھی اندھیروں میں گم ہوں۔ اگر شمع بن کر جل جاتی تو لالہ رخسار کو روشنی کی تلاش میں سائیں جی جیسے جادوگر کی جھونپڑی میں دھکے کھانا تو نہ پڑتے انسان کو تو صرف اپنے حصے میں آئی نیکی کرنا ہوتی ہے۔ لالہ کی قسمت میں خوشیاں تھیں۔ اسے مل گئیں۔ مجھے نیکی کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے گنوا دیا وہ سوچتی رہ جاتی تھیں۔

لالہ اور غنی اپنی چھوٹی سی جنت میں مگن تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں واپس حویلی آتے تو گویا۔ ہر سو قہقہے اور ہنسی بکھر جاتی تھی اور رخشندہ اپنے ہرے بھرے باغ کی ہر شاخ پر جھولتی تتلی کو دیکھ کر دل ہی دل میں سجدہ شکر بجا لاتی تھی۔

اس نے ایک سانس لیتے اشکوں سے بھرے "وجود" کو سالوں پرانی "رسموں" فرسودہ رواجوں اور دیمک زدہ اصولوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا تھا۔

☆

http://www.pakfunplace.com

بشریٰ سعید

سفال گر

ساغرِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازارِ حیات کی "مانگ" کو مدِنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہی میرے ناول کی تفہیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں کیں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔ یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جدوجہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

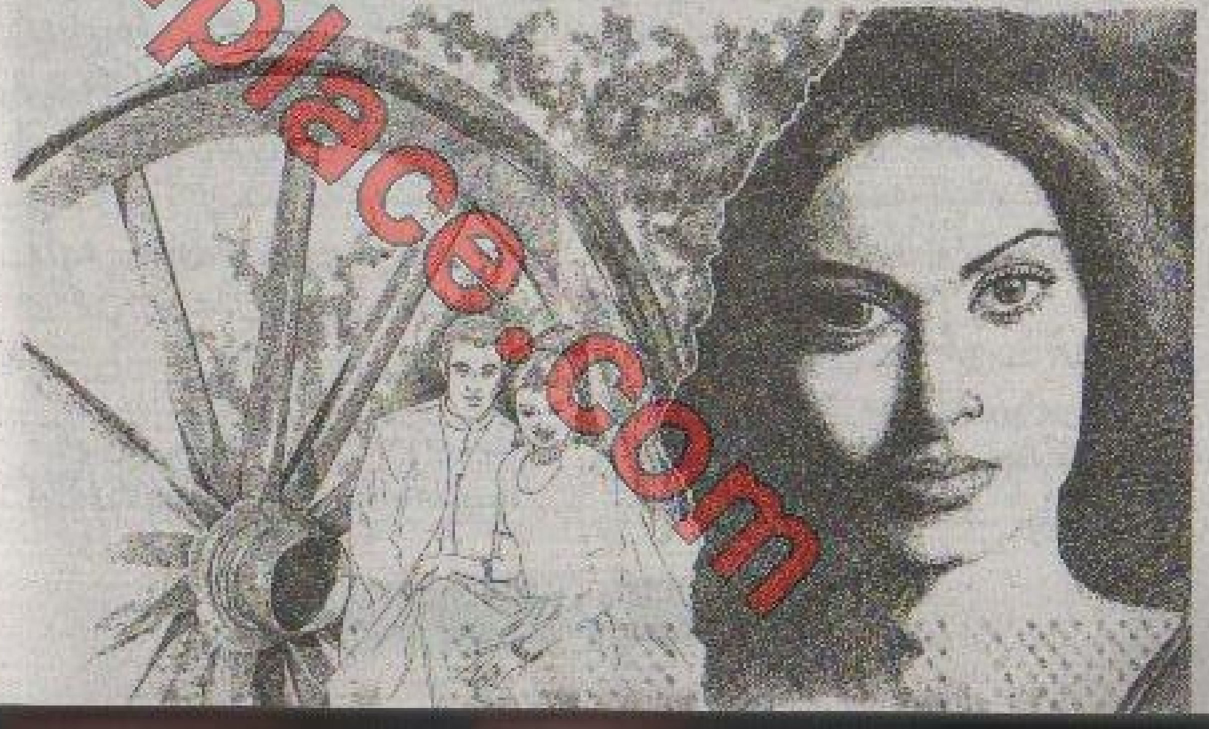

ناولٹ

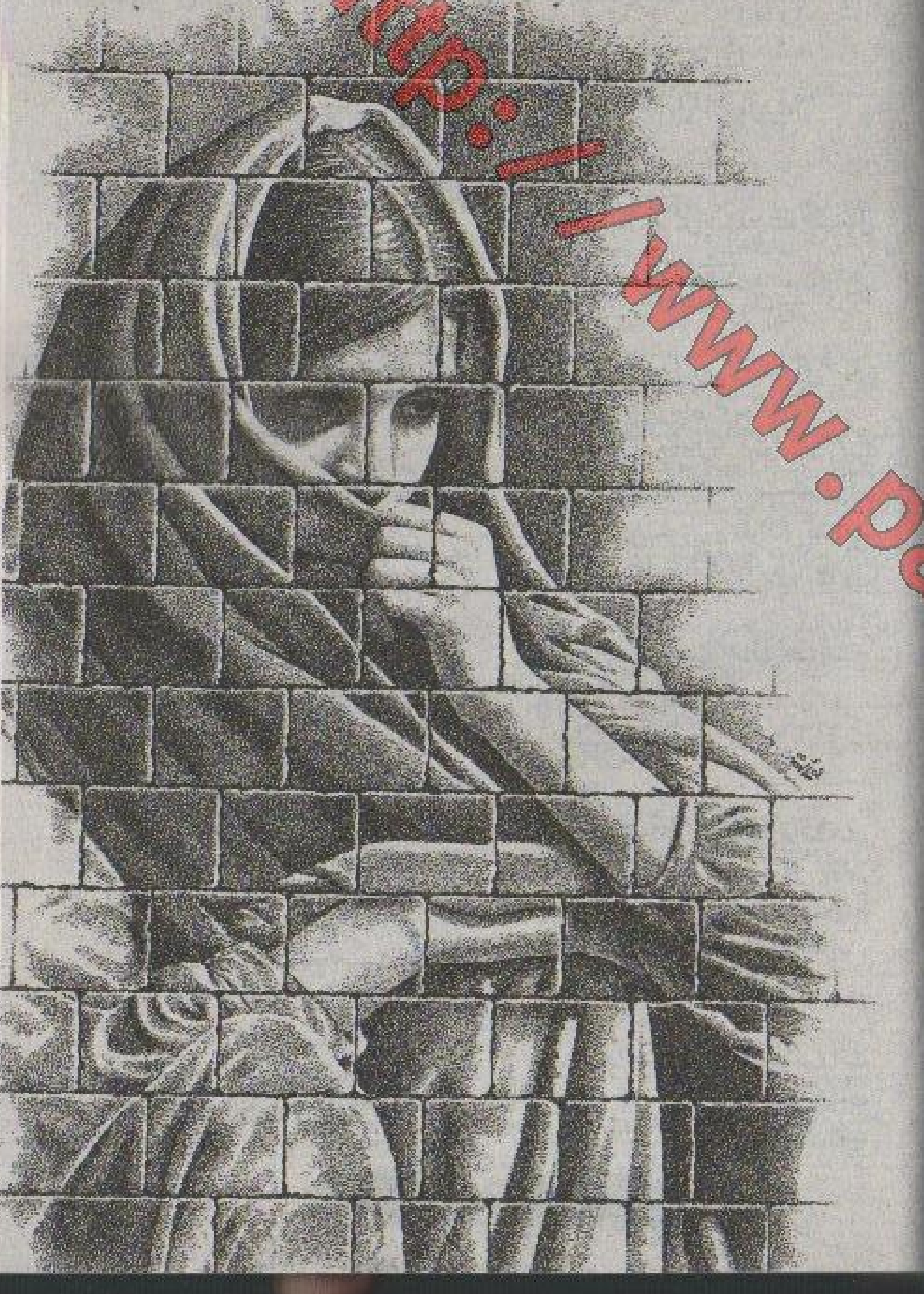

http://www.paktunplace.com

11
گیارہویں قسط

وہ اسے گھسیٹ کر کچن میں لے گیا تھا۔ سنک میں ان دھلے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور گندا پانی جمع تھا۔ کچن کے سنک کی یہ حالت کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے ایسا ہی بدحال رہتا تھا۔ اس میں برتن جمع ہوتے رہتے اور جب بے حد مجبوری ہوتی تو ضرورت کے دو چار برتن دھو کر باقیوں کو یوں ہی پڑے رہنے دیا جاتا۔

گرانٹ نے سنک میں تیرتا ہوا ایک کپ نکالا اور اس کو غلیظ پانی سے بھر کر صوفیہ کے منہ کے نزدیک کر دیا۔

"پیو۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"میں کہہ رہا ہوں اسے پیو، تمہیں سنائی نہیں دے رہا۔"

اس نے بھاگ کر کچن سے باہر جانا چاہا، مگر گرانٹ نے دروازے کے سامنے آتے ہوئے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

"جہنمیوں کو زخموں کی پیپ اور خون پینے کو دیا جائے گا۔ تم سے یہ بے ضرر پانی نہیں پیا جا رہا تو پیپ اور خون کیسے پیو گی؟"

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے میں صوفیہ کا منہ جکڑ لیا اور وہ بدبودار پانی اس کے ہونٹوں پر گرانے لگا۔ "تم اپنے ناپاک منہ سے خدا کا نام لے کر جھوٹ بولتی ہو، تم تو اس قابل ہو کہ میں تمہیں گٹر کا پانی پلاؤں۔"

اس نے اپنے بچاؤ میں بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر کچھ پانی اس کے منہ اور ناک میں گھس گیا۔ جھرجھری لے کر وہ قے کرنے لگی تھی۔ گرانٹ اس کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اب تم جھوٹ بولو گی؟ اب تم لڑکوں سے ملو گی؟ اب تم Prostitute بنو گی؟"

☆ ☆ ☆

"صوفیہ! تم نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"بہت لمبی نماز ہے، میں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہوں، آج میرے سر میں درد ہے۔"

"یہ نماز چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ابھی اٹھو اور وضو کرو۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی، مجھے بخار بھی محسوس ہو رہا ہے۔ میں آج نہیں پڑھ سکتی۔"

"میں تم پر واضح کر چکا ہوں کہ تم خدا کے وضع کیے ہوئے طریقے پر نہیں چلو گی تو تمہارے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ بستر سے نکلو، ابھی اور اسی وقت۔" گرانٹ نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ "چلو جا کر وضو کرو۔"

"نہیں۔ میں آج نہیں پڑھوں گی، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو تم اپنا فیصلہ نہیں بدلو گی؟ شاید اس کے بعد میں تم سے نہ پوچھوں۔"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" گرانٹ اسے بیرونی دروازے تک لے گیا۔ "گھر سے نکل جاؤ اور تب واپس آنا جب تم خدا کی اطاعت کرنے والی بن جاؤ۔" گرانٹ نے دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دیا۔

"میں کل سے ساری نمازیں پڑھوں گی۔"

"تو کل واپس آنا۔"

دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ گرانٹ نے واقعی اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ چند منٹ وہ خاموش کھڑی دروازہ کھلنے کی منتظر رہی، لیکن جب خاصا وقت گزر جانے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو پہلی بار اسے حقیقی پریشانی نے گھیر لیا۔ آسمان سیاہ بادلوں سے اٹا ہوا تھا، ہوا بے حد سرد تھی اور رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ کسی بھی آن بارش شروع ہو سکتی تھی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ اترنے لگی۔ ایک تو اسے بخار تھا اور دوسرے وہ گرم بستر سے نکل کر سیدھی خنک ہوا میں آ گئی تھی۔ اس کی گردن، کندھوں اور پنڈلیوں میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ گو کہ اسے امید نہیں تھی کہ گرانٹ آسانی سے نرم پڑے گا۔ پھر بھی وہ اسے آوازیں دیتی رہی۔

"مجھے اندر آنے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ باہر بہت سردی ہے، خدا کے لیے مجھے اندر آنے دو۔"

دستک دیتے ہوئے اسے الپا کا خیال آیا تھا۔ اس وقت وہ سو رہی ہو گی۔ وہ سبک قدموں سے گھر کے عقب میں آ گئی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے پہنچی تو بارش کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ یخ بستہ بوندیں اس پر گرنے لگیں۔ کھڑکی کے شیشے سے چپکتے ہوئے اس نے الپا کو متوجہ کرنے کی ہر ممکن تدابیر آزمائی، لیکن وہ ایسی بے سدھ سو رہی تھی کہ اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ یقیناً وہ کوکین کے خمار میں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر بھاگتے ہوئے وہ دوبارہ مرکزی دروازے تک آئی اور زور، زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"اب تم جیسے کہو گے میں ویسے کروں گی، میں ابھی نماز پڑھوں گی، دروازہ کھولو۔ باہر تیز بارش ہو رہی ہے۔ سردی سے میں مر جاؤں گی۔ مجھے واقعی بخار ہے۔ مجھے اندر آنے کی اجازت دے دو۔ میں اب کبھی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں ان سب چیزوں سے دور رہوں گی جن سے خدا نے روک دیا ہے۔ اگر چاکلیٹ کھانا یا سائیکل چلانا بھی گناہ ہو تو میں کبھی ان کاموں کے نزدیک نہ جاؤں۔ مجھے ایک موقع دے دو، میں پھر کوئی حکم عدولی نہیں کروں گی۔"

اب اس کے دانت شدت سے بجنے لگے تھے اور بولتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

بارش کی طوفانی بوچھاڑیں مکانوں کی چھتوں اور درختوں کی چوٹیوں پر برس رہی تھیں۔ تیز ہوا کے جھکڑ بیرونی دروازوں اور کھمبوں سے ٹکرانے پر ہولناک آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کا روئیں دار لبادہ بھیگ کر جسم سے چپک گیا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ اس نے پچھوں تلے گھس کر سر چھپایا۔ درختوں کے تنوں سے لپٹ کر جھولتی ہوئی شاخوں کی آڑ لی، مگر سب بے سود، بپھری ہوئی ہوا بوندوں کو ہر نکڑ اور ہر گوشے میں اچھال رہی تھی۔

وہ اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ ہڈیوں میں اترتی ہوئی ٹھنڈ نے اسے اس حد تک بے بس کر دیا تھا کہ رونے کے علاوہ اسے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھے زمین پر اکڑوں بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اسے خوف آ رہا تھا۔ بارش، ہوا، آوازیں، تاریکی، تنہائی، درخت، مکانوں کی روشن اور بجھی ہوئی کھڑکیاں، ساری کائنات بے مہر تھی۔ جب روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی، لیکن بارش، ہوا اور بند دروازے میں سے کوئی منظر بھی نہ بدلا تو اس نے سنجیدگی سے اپنی صورت حال پر غور کیا۔ وہ کسی ہمسائے سے مدد مانگتی تو اسے ساری کہانی بیان کرنا پڑتی۔ اس کے بعد بھی ضروری نہیں تھا کہ سننے والا اسے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے دیتا۔ آس پاس کے گھرانوں سے ان کے تعلقات ذرا بھی خوش گوار نہ تھے۔ سوچتے سوچتے اسے ایک خیال آیا تھا۔

مسز گنز امیک گریگور کے لان کے گرد کوئی دیوار نہ تھی۔ گھاس کے وسیع قطعہ کے حاشیوں پر ایک باڑ اگائی گئی تھی جس نے حد قائم کر رکھی تھی۔ باڑ کے اندر ایک گوشے میں صحرائی بید کی سدا بہار جھاڑیاں لگی تھیں۔ ان گھنی پھول دار جھاڑیوں کے حلقے میں سایہ دار جگہ پر لکڑی کے چند روغن شدہ تختوں کو جوڑ کر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائی گئی تھی۔ یہ جھونپڑی درحقیقت مسز میگ گریگور کے Landseer

http://www.pakfunplace.com

نسل کے پالتو کتے کی آرام گاہ تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اس میں لیٹ کر ستایا کرتا تھا۔

صوفیہ نے وہیں سر چھپانے کا سوچا اور گرتی پڑتی چلنے لگی۔ ہوا اس کے قدم زمین پر جمنے نہ دیتی تھی۔ وہ دائیں رخ بڑھنے کا مقصد کرتی تو ہوا مخالف سمت میں لڑھکا دیتی۔

باڑ سے تھوڑی دور رک کر اس نے آنکھوں کے گرد ہاتھوں سے ڈھال بنائی اور گھر کے رہائشی کمروں کا جائزہ لیا۔ مسز برگنڈ امیک گریگور کے سونے کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ممکن تھا وہ جاگ رہی ہوں اور انگیٹھی کے قریب آرام دہ کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔ جیسا کہ وہ اکثر کرتی تھیں۔

ان کے پاس لمبی نال والی ایک بندوق تھی جو ان کے مرحوم شوہر نے انہیں خرید کر دی تھی۔ مسز میک گریگور اسے چلانے میں مہارت رکھتی تھیں اور اگر اس وقت اتفاقاً ان کی نظر صوفیہ پر پڑ جاتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اسے چور گردانتے ہوئے وہ بنا خبردار کیے اس پر گولی چلا دیتیں۔ اس خیال نے صوفیہ کو اتنا ہراساں کیا کہ باڑ عبور کرتے ہی وہ زمین پر بارش کے پانی میں لیٹ گئی اور کہنیوں اور گھٹنوں کے بل لڑھکتی ہوئی ڈاگ ہاؤس تک پہنچی۔ اس دوران اس کے ایک پاؤں کا جوتا اتر کر کہیں کھو گیا اور پانی اس کے لبادے کی آستینوں میں بھر گیا۔

ڈاگ ہاؤس کے سامنے والے تختے پر ایک بڑی سی جھاڑی گری ہوئی تھی، جس نے دروازے کو ڈھانپ لیا تھا۔ بے جان ہاتھوں سے جھاڑی کی شاخیں ہٹاتے ہوئے وہ اندر رینگ گئی۔ جھاڑی کی وجہ سے بارش کا پانی اندر نہیں آ پایا تھا اور فرش تقریباً خشک تھا۔

تاریکی میں اس کے نتھنوں سے کسی مری ہوئی شے کی بو ٹکرائی۔ اسے بے اختیار ابکائی آئی تھی۔ دل چاہا کہ باہر نکل جائے مگر جی کڑا کر کے لیٹی رہی۔

وہ اس حالت میں تھی کہ اس کا پیٹ گھٹنوں سے ملا ہوا تھا اور سر جھونپڑی کی دیوار سے چھو رہا تھا۔ وہ نہ کروٹ لے سکتی تھی اور نہ ہی اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی۔ غنیمت تھا کہ جھاڑ نے پانی کو اندر آنے سے روک رکھا تھا۔ ڈاگ ہاؤس کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی بوندیں گونجیلی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔

جو کیلی ہوا درزوں سے آ رہی تھی وہ اس کے بھیگے ہوئے لباس کو برف کی پرتوں میں ڈھال رہی تھی۔ سانس لیتے ہوئے اس کے سینے سے سیٹی سی برآمد ہوتی اور اوپر تلے کے دانت آپس میں زور سے ٹکراتے۔ اینٹھی ہوئی گردن کو سیدھا کرنے کے لیے اس نے سر گھمایا تو اس کے گال سے کوئی نرم پردار شے چھو گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی سعی کی۔ اسے کچھ نظر نہ آ سکا۔ خاصی دیر بعد ڈرتے ڈرتے اس نے ہاتھ پھیلا کر اس مقام کو ٹٹولا۔

تھوڑی سی جانچ سے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ پردار چیز کسی مردہ پرندے کا بچا کھچا جسم تھی۔ فضا میں رچے ہوئے تعفن کا باعث بھی یہی تھا۔ شاید یہ کسی بلی کی کارگزاری تھی کیونکہ مسز میک گریگور کا کتا اتنا امن پسند اور شریف طبع تھا کہ کسی جاندار شے پر حملہ آور ہونا تو درکنار، وہ غراتا تک نہیں تھا۔ اسے تو بس گیند سے کھیلنے اور تیراکی سے شغف تھا۔ پرندے کی باقیات کو ہاتھ سے پرے اچھالتے ہوئے اس نے بوجھل سر کو زمین پر گرا دیا۔

وہ رات اتنی طویل تھی کہ کسی طور ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ تمام رات وہ ایک لمحے بھی نہیں سوئی۔ سردی، درد اور اندھیرے ہی ہوئی اس کائنات میں وہ بالکل تنہا تھی۔ اس یادگار رات نے صوفیہ کی کایا پلٹ دی۔ تمام رات وہ ایک ہی سوال کو حل کرتی رہی۔

خدا گرانٹ کو اس کے ساتھ یہ سب کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ خدا گرانٹ کے ساتھ تھا تو اس کے ساتھ کون تھا؟

جسٹن اور سلینا اسکول کے ان طلبا میں سے تھے جن کو مشہور ہونے کے لیے تعلیمی یا غیر نصابی

سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کے خاندان کا حوالہ ہی ان کی شناخت تھی۔ وہ دونوں کزن تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو پشتوں سے دولت اور نیک نامی کے خزانوں کا امین تھا۔ ان کے دادا نے فزیالوجی کے شعبے میں نوبل انعام جیتا تھا۔ ایک چچا بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار تھا' ایک خالہ سینیٹر تھی' دونوں کے باپ ایک بڑی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن تھے۔ الغرض مراتب کو تسخیر کرنا ان کے خاندان کے افراد کا مشغلہ تھا۔ جسٹن اور سلینا اپنے حلقہ احباب میں صرف ان طلبا کو شامل کرتے تھے جو خاندانی جاہ و حشمت میں ان کے ہم پلہ ہوں۔ کسی کم حیثیت والے کو وہ منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ وہ کسی کو دوستی کا مرتبہ عطا کر دیتے تو سب اس کی قسمت پر رشک کرتے۔ یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر صوفیہ سکتے میں آ گئی جب ایک روز وقفہ کے دوران ان دونوں نے اس سے گفتگو شروع کی۔

وہ ایک دور افتادہ گوشے میں کورل درختوں کے کنج کے باہر زمین پر بیٹھی انگلیوں سے مٹی پر کذھب شکلیں بنا رہی تھی کہ سلینا اور جسٹن اس کے پاس آئے اور دونوں نے اسے ہیلو کہا۔ پہلے تو اسے شک گزرا کہ وہ مخالف سمت سے چل کر آتی ہوئی کسی سے مخاطب تھے، لیکن جب جسٹن نے اس کا نام لے کر پکارا تو اسے اعتبار کرنا پڑا۔

"صوفیہ مارسیلو! کیا ہم تمہاری تنہائی میں مخل ہو رہے ہیں؟"

جسٹن کی زبان سے اپنا نام سن کر اسے فخر ہوا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کا نام جانتا ہو گا۔ سلینا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا کر زمین سے اٹھ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر لگی گرد کو دیکھا اور سلینا کا ہاتھ تھامنے سے پہلے اپنے ہاتھوں کو لباس سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کیا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ہم تمہاری دوستی سے محروم رہے۔ اگر ہمیں پہلے علم ہو جاتا کہ تم ایک فلمی اداکارہ کی بیٹی ہو تو ہم تم سے تعارف حاصل کرنے میں اتنا وقت بھی ضائع نہ کرتے۔"

جسٹن نے شائستگی سے کہا تو صوفیہ کا دل ڈوب گیا۔ وہ [illegible] کی وجہ سے اسے قابل توجہ سمجھ رہے تھے۔ [illegible] حال کی تردید یا تائید کے بجائے وہ بے بسی سے مسکرانے لگی۔

"تمہاری ماں فلم ایکٹریس ہے نا؟" اس بار سلینا نے پوچھا تھا۔

"ہاں' وہ فلموں میں کام کرتی رہی ہے مگر وہ کوئی زیادہ مشہور ہستی نہیں ہے۔" صوفیہ نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"تم بہت ہی عاجزانہ طبیعت کی مالک ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک ہالی ووڈ سلیبرٹی کی اولاد ہونے پر سارا اسکول کو اپنے پیچھے دوڑاتا۔"

اس مبالغے پر اسے شرم آئی تھی۔

"صوفیہ! ہم تمہیں اپنے دوستوں کے گروہ میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے تمہیں اعتراض نہیں ہو گا۔" اس اعزاز پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

"کل میں نے گھر پر دوستوں کو اکٹھا کرنے کی غرض سے ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔" جسٹن بتانے لگا۔ "ہم تمہیں مدعو کر رہے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف بھی کروا دیں گے۔ دوستی کا آغاز کرنے کا یہ ایک عمدہ طریقہ ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟ آؤ گی نا؟"

صوفیہ کو اقرار کرنے میں تامل تھا لیکن وہ ان دونوں سے اس قدر مرعوب تھی کہ ان کی کسی تجویز سے اختلاف کرنا اسے خلاف تہذیب لگ رہا تھا۔ مرے ہوئے دل سے اس نے ہامی بھر لی۔

"تم ضرور آنا۔ سب دوست تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" سلینا نے تاکید کی۔ "اگر تم کہو تو میں تمہیں لینے کے لیے شوفر کو بھجوا دوں؟"

"نہیں' میں خود آ جاؤں گی۔" صوفیہ نے لجاجت

http://www.pakfunplace.com

سے کہا تھا۔

زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ البا کی ذات کسی حوالے سے اس کے لیے خوشگواریت کا سبب بن رہی تھی۔

وہ دونوں رخصت ہو گئے تو صوفیہ کچھ بے یقینی کی کیفیت میں دوبارہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے یہ ماننے میں بے حد مشکل ہو رہی تھی کہ جسٹن نے حقیقتاً اسے اپنی پارٹی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب اس پر گھبراہٹ کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اسے گرانٹ کی ممکنہ مخالفت کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لینے کینیڈا گیا ہوا تھا۔ اسے کئی دوسری چیزیں پریشان کر رہی تھیں۔ اس عالی نسب گھرانے کی کسی تقریب میں پہن کر جانے کے لائق اس کے پاس کیا تھا۔ وہ طبقہ اشرافیہ میں رائج شدہ آداب و اطوار سے بھی نابلد تھی۔ کوئی خلاف تہذیب حرکت ہو جاتی تو کیسی شرم کی بات ہوتی۔

دن کا باقی وقت وہ اسی فکر میں ڈوبی رہی۔ اسکول سے آ کر اس نے اپنی سائیکل کے زنگ آلود حصوں کو رگڑ کر صاف کیا۔ سائیکل کی حالت میں کوئی نمایاں بہتری تو نہ آئی البتہ اس کی اصل رنگت دکھائی دینے لگی تھی۔

اس کا سب سے کم پرانا اسکرٹ، جسے استعمال کرتے ہوئے اسے ڈیڑھ برس ہونے کو آیا تھا، دو جگہوں سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ مارکیٹ سے اسکرٹ کے نمونے سے ملتے جلتے کپڑے پر چپکنے والے اسٹیکر لے کر آئی جن کی مدد سے اس نے ان چھیدوں کو چھپا دیا اور جوتوں کے اکھڑے ہوئے تلووں کو گلو لگا کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھ چھوڑا۔

مقررہ وقت پر وہ جسٹن کے گھر کے سامنے پہنچی تو بری طرح پچھتائی۔ اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر کے سنگین غلطی کی تھی۔ اس گھر کی دیواریں اتنی طویل تھیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھنے کے لیے گردن کو نیم دائرے میں گھمانا پڑتا تھا۔ ڈرائنگ روم، جو گھر کا سب سے بلند کمرا تھا، زمین سے کم از کم ساٹھ فٹ کی اونچائی پر واقع تھا۔ [illegible] کشادہ پورچ میں دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ ان میں سے دو لموزین تھیں، ایک مرسیڈیز، ایک رولز رائس اور باقی گاڑیاں بھی اسی معیار کی یا ان سے برتر تھیں۔ کئی گاڑیوں کے ساتھ باوردی شوفر موجود تھے جن میں سے چند پورچ میں کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے جبکہ چند گاڑیوں کے اندر براجمان تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جسٹن اور سلینا کے کافی دوست آ چکے تھے۔

جب اس نے اپنی سائیکل ان شاندار گاڑیوں کے بیچ ایک خالی جگہ پر کھڑی کی تو وہ یوں دکھائی دینے لگی جیسے کسی نے نئے اجلے کپڑوں کے ڈھیر میں ایک میلی دھجی اچھال دی ہو۔ ان روشن در و دیوار میں اسے اپنا آپ بھی ایک گدلی ناصاف شے کی مانند لگ رہا تھا۔ چمکتے ہوئے سفید فرش پر اس کے گرد آلود جوتے ایسے بھدے نظر آتے تھے کہ شرم سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ دل میں خود کو ملامت کرنے لگی۔ یہاں آ کر اس نے کتنی بڑی بے وقوفی کی تھی۔ مزید شرمندگی سے بچنے کی خاطر وہ لوٹ جانے کا ارادہ باندھ رہی تھی کہ چندن کے چھجے دار دروازے سے باہر آتی ہوئی سلینا کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"او صوفیہ! تم اب آ رہی ہو؟ کتنی دیر [illegible] دوست تمہارے ہی منتظر ہیں۔ جلدی [illegible]"

وہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے [illegible] کمرے میں ایک دم خاموشی چھا [illegible] سب ہی نظریں صوفیہ پر جم گئیں [illegible] شرم آلود مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا [illegible]۔ جسٹن اور سلینا کو ملا کر وہ کل گیارہ تھے۔ [illegible] اور سات لڑکے۔ کچھ چہروں کو وہ اسکول میں [illegible] رہتی تھی۔

"صوفیہ مارسیلو ہے جس کے بارے میں، میں تم لوگوں کو بتا رہا تھا۔ یہ ہماری نئی دوست ہیں۔" جسٹن کے جملوں سے اسے حوصلہ ملا تھا۔ وہ صوفے تک جانے کے لیے قدم اٹھا ہی رہی تھی کہ سلینا نے روک دیا۔

"تمہیں برا تو لگے گا مگر آگے آنے سے قبل تمہیں

اپنے جوتے اتارنے ہوں گے۔"

"وہ کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"قالین کی وجہ سے۔" سلینا نے جواب دیا۔

"معاف کرنا، میں سمجھی نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟" صوفیہ نے فرش پر بچھے تین انچ موٹائی کے حامل پیچیدہ گرہوں پر مبنی نمونے والے سبز اور نیلے قالین کو دیکھا۔ سب ہی لڑکے لڑکیوں نے جوتے پہن رکھے تھے۔ قالین پر کوئی بھی ننگے پیر نہیں تھا۔

"اپنے جوتوں کو دیکھو صوفیہ! یہ کتنے گندے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہو گا کہ تم ان جوتوں کے ساتھ قالین پر چلو۔ ہماری آنٹ جو [illegible] انہوں نے یہ قالین اصفہان سے منگوایا [illegible] کی قیمت کا درست اندازہ تو مجھے نہیں [illegible] بہرحال تم اسے نوادر میں شمار کر سکتی [illegible]"

صوفیہ [illegible] خود بخود اپنے جوتوں پر گئیں۔ تازہ کی ہوئی پالش پر مٹی کے بے شمار ذرات چپکے تھے۔ پھر اس نے باری باری قالین پر موجود سب جوتوں کو دیکھا۔ وہ تمام یوں چمک رہے تھے جیسے ابھی ابھی دوکان کی نمائشی الماری میں سے نکالے گئے ہوں۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی کچھ اور بوندیں نمودار ہو گئیں۔ آنکھیں فرش پر مرکوز کرتے ہوئے اس نے جھک کر جوتے اتارے اور قالین پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی ان کے درمیان آ گئی۔ جسٹن نے اسے گلے لگایا اور ایک ایک کے پاس لے جاتے ہوئے اس کا تعارف کروانے لگا۔ وہ بطور خاص البا کے اداکارہ ہونے کا ذکر کر رہا تھا۔ تقریباً سب ہی لوگ گرم جوشی سے ملے تھے۔

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اسکول کے قصے سنائے گئے۔ پسندیدہ کھلاڑیوں اور پسندیدہ اداکاروں پر تبادلہ خیال ہوا۔ دو لڑکوں اور ایک لڑکی نے مل کر گٹار کی دھن پر گیت سنائے۔ لطیفوں کا ایک دور چلا۔ صوفیہ بھی مقدور بھر گفتگو میں شریک ہوتی رہی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ جلد از جلد یہ محفل برخاست ہو اور وہ ایک لمحہ گنوائے بنا یہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔

پھر بٹلر نے آ کر انہیں کھانے کی میز پر آنے کے لیے کہا تو خوشگوار ماحول میں سب ڈائننگ ہال کی سمت چل دیے۔ [illegible] خیال اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ جوتوں کے بغیر پاؤں ذلت کی علامت تھے۔ ملائم قالینوں سے ڈھکی ہوئی غلام گردشوں میں چلتے ہوئے بلاوجہ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

کھانے کی میز پر چنے ہوئے کھانوں کی تعداد اور تنوع شاید اسے کہیں زیادہ مرعوب کرتا، اگر ایک اور مسئلہ اسے الجھا نہ دیتا۔ جب وہ لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے تو سلینا نے اشارے سے بٹلر کو قریب بلا کر کوئی ہدایت کی۔ بٹلر تفہیمی انداز میں سر کو خم کرتے ہوئے چلا گیا اور چند لمحوں بعد دوبارہ آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھی۔ صوفیہ کے سامنے پہلے سے رکھی ہوئی پلیٹ اٹھا کر اس نے وہ دوسری پلیٹ رکھ دی تھی۔ اس کے دل میں کھدبد سی ہونے لگی۔ میز پر سجی ہوئی تمام پلیٹیں سفید تھیں جو کسی ایک ہی سیٹ کا حصہ تھیں جبکہ بٹلر اس کے لیے جو پلیٹ لایا تھا، وہ سبز رنگ کی تھی۔ اس کا کنارہ ایک مقام پر ذرا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ اس امتیازی سلوک کی کوئی توجیہہ صوفیہ کے ذہن میں نہ آ سکی مگر کھانے کی اشتہا انگیز گرم خوشبو نے اس کے حواس پر اثر انداز ہونا بند کر دیا۔ اس نے اسپنیچ پزا Spinach Pizza کا ایک مختصر ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ سلینا نے اچانک اسے مخاطب کیا تھا۔

"میں شرط لگا سکتی ہوں کہ ان میں سے کئی کھانوں کو تم نے آج سے پہلے دیکھا تک نہیں ہو گا۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے بائیں ہاتھ کے قریب پڑے ہوئے نوڈلز کے پیالے کی قیمت ستر ڈالر ہے تو کہیں تم کرسی سے گر تو نہیں جاؤ گی۔"

کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ منہ کی طرف خوراک لے جاتا ہوا صوفیہ کا ہاتھ ہوا میں رک گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ہوا میں تحلیل ہو کر سب کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس کی پلکیں گالوں سے چپک گئی تھیں۔ سلینا کہہ رہی تھی۔

"تمہارے طبقے کے لوگ ایسی چیزوں کے متعلق سوچنے کی بھی سکت نہیں رکھتے۔ یہ کوئی عام نوڈلز نہیں

ہیں۔ یہ جاپانی رامن Ramen کی ایک خصوصی ترکیب ہے۔" وہ کسی سیکھے ہوئے سبق کی طرح اس کھانے کے محاسن اور فضائل گنوانے لگی۔ صوفیہ ضرور اٹھ کر بھاگ جاتی اگر تو ندیل بٹلر دروازے کے بیچ رکاوٹ بن کر کھڑا نہ ہوتا۔

وہ صوفیہ کی زندگی کا طویل ترین کھانا تھا۔ سلینا نے اس پر اور بھی کئی پھبتیاں کسی تھیں۔ برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ سر جھکائے کھانے کے جلد اختتام کی دعائیں مانگتی رہی۔ بالآخر سب لوگ کھا چکے اور جسٹن نے ایک اور کمرے کی طرف ان کی رہنمائی شروع کی تو صوفیہ نے پست آواز میں اس سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں گھر میں کہہ کر آئی تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گی۔ اب تو نو بجنے والے ہیں۔"

جسٹن نے اس کی درخواست رد کر دی۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم کوئی ننھی بچی تو نہیں ہو جسے کوئی بھی کام کرتے ہوئے گھر والوں سے پوچھنا پڑے۔ میں اور سلینا اگر پوری رات بھی گھر سے باہر رہیں تو کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ ہم سے جواب طلبی کرے۔ ابھی تم بالکل نہیں جا سکتیں۔ اس پارٹی اور آج کے دن کا سب سے اہم واقعہ تو اب پیش آنے والا ہے۔ کیا تم لوگ مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

جسٹن نے چہرہ گھماتے ہوئے باقی لوگوں سے دریافت کیا۔

"درست..... درست..... کوئی شک نہیں۔" سب نے آواز ملائی۔

صوفیہ اس بلے بازی سے کوئی مطلب اخذ نہ کر سکی۔ اس نے بے چارگی سے اپنی بات دہرائی۔ "میں اور نہیں رک سکتی۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ مجھے اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔"

"ہمارے کہنے پر تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم اس دن کو کبھی نہیں بھولو گی۔ اگر میری بات غلط ثابت ہو جائے تو تمہیں اختیار ہو گا کہ مجھے

کسی بھی برے نام سے پکارو جیسے چغد، احمق یا مسخرہ یا جو تمہارے جی میں آئے۔"

ایک بار پھر اس کے چاروں طرف ہنسی ہونے لگی۔ اس کے انکار اور احتجاج کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

وہ کمرہ ہال نما تھا۔ چھت سے ایک ہشت پہلو فانوس لٹکا تھا۔ قطاروں میں ترتیب سے کرسیاں رکھی تھیں جن کی اونچی پشتوں پر زعفرانی مخمل چڑھا تھا۔ کرسیوں کی اولین صف سے چند گز کے فاصلے پر ایک چبوترہ بنا تھا جس پر منقش لکڑی کے چوکھٹے میں ٹیلی ویژن سیٹ نصب تھا۔ سب مہمانوں کو نشستوں پر بٹھا کر جسٹن نے دروازہ مقفل کر دیا۔

پھر وہ چبوترے پر چڑھ گیا۔ چوکھٹے کے نیچے بنی ہوئی بڑی دراز کھینچ کر اس نے ایک ویڈیو کیسٹ برآمد کی۔ کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگانے کے بعد وہ چبوترے سے اتر کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اسکرین پر پہلا منظر ظاہر ہوا تو صوفیہ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ ایک پورنوگرافک فلم تھی۔ فلموں کی اس قسم سے وہ واقف تو تھی البتہ تاحال اس نے ایسی کوئی فلم دیکھی نہیں تھی۔

"میں اسے نہیں دیکھوں گی۔ ہم ابھی چھوٹے ہیں۔ ہمیں ان چیزوں سے دور رہنا چاہیے۔ مجھے اس کمرے سے باہر جانے دو۔"

اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا مگر ساتھ بیٹھی سلینا نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"میں اسے غلط تصور کرتی ہوں۔" اس نے احتجاج کیا اس بات کے جواب میں سب مل کر اس کا مضحکہ اڑانے لگے۔ مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ گھڑیاں کسی طور بیت جائیں تو وہ اس گھر سے باہر جا کر کھلی فضا میں سکھ کا سانس لے۔

"میں دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔ جیسے ہی یہ وقت گزر جائے تو میں اس عذاب سے نجات پاؤں۔"

اسے خبر نہیں تھی کہ جسے وہ عذاب گردان رہی

تھی وہ تو محض معمولی خراشوں جیسا تھا۔ ویسی خراشیں جو کسی کو سائیکل سے گرنے یا دوڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرنے سے لگ جاتی ہیں۔ اصل زخم تو اب آنے والے تھے۔

فلم چند منٹ چل چکی تھی جب ایک ایسا منظر ابھرا جس نے صوفیہ کو گندگی کے عظیم ڈھیر میں غرق کر دیا۔ اسکرین پر البا نظر آ رہی تھی اس نے پلکیں جھپک کر اپنی بصارت کو جھٹلانا چاہا مگر وہ واہمہ نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ کسی نے جلتی ہوئی راکھ کی مٹھی بھر کر اس کی آنکھوں میں جھونک دی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگ پڑی۔ قطار کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے جسٹن نے اس کے پیروں میں ٹانگ الجھا کر اسے گرا دیا۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟ یہی تو ہے وہ نامور فنکارہ جس کی تم بیٹی ہو۔ تعجب ہے اپنی ماں کو اسکرین پر دیکھ کر تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔"

جسٹن اس کے اوپر جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دوبارہ بھاگی۔ سلینا اور ایک دوسری لڑکی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی مگر خود کو ان کی گرفت سے چھڑا نہیں پائی۔ وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ٹیلی ویژن کے نزدیک لے جا رہی تھیں۔ اچانک سب لڑکے لڑکیاں بولنے اور چلانے لگے تھے۔ کون کیا کہہ رہا تھا۔ وہ آوازوں میں تمیز نہیں کر سکتی تھی۔ صرف ایک چیز اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ سب اس کے اور البا کے متعلق کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے کھینچ کر ٹیلی ویژن کے سامنے پھینک دیا گیا۔ اس سے گردن اٹھانے اور آنکھیں کھول کر اسکرین کو دیکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس نے کان کے قریب جسٹن کی چیختی ہوئی آواز سنی۔

"اپنی عظیم ماں کی اداکاری دیکھنے سے گریزاں کیوں ہو؟ میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے۔ اس دن کو تم کبھی فراموش نہیں کرو گی۔ آنکھیں کھولو..... آنکھیں کھولو۔" وہ سب یک آہنگ ہو کر نعرے لگانے لگے۔ اس نے اتنی سختی سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ

پپوٹے اور رخساروں کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔

قہقہے..... چیخیں..... ٹی وی کی آواز..... خوف، نفرت، غصہ، ذلت، بے بسی..... اس دن کے یادگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس دن کے بعد اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ گرانٹ کو اس عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ صوفیہ مستقل گھر میں موجود ہو گی تو وہ اس کی زیادہ اچھی تربیت کر سکے گا۔ اگلے دو تین برس اس نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ جب اسے موقع میسر آتا، وہ ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس چلی جاتی اور شاپنگ مالز میں گھومتی رہتی۔ وہ کسی بھی شے کو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی مگر ان قیمتی، چمکتی ہوئی چیزوں کو دیر تک گھورتے رہنا اسے دلچسپ لگتا تھا۔

ان ہی دنوں میں اس نے چیزیں چرانا شروع کر دیں۔ دو تین دفعہ اس مہم جوئی کے دوران وہ پکڑی بھی گئی تھی مگر کم عمر ہونے کی بنا پر معمولی سرزنش کر کے اسے جانے دیا جاتا۔ چاکلیٹ کی بار اور کھلونوں سے لے کر ٹائیوں اور کراکری تک وہ ہر شے پر ہاتھ صاف کرتی۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ چرائی جانے والی چیزوں کی اسے ضرورت بھی ہوتی تھی یا نہیں۔ بس اس طریقہ سے وہ اپنا غصہ نکالا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس رات البا خاصی تاخیر سے گھر آئی تھی۔ گرانٹ کہیں گیا ہوا تھا اور صوفیہ کچن کے فرش پر کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ البا کے ہمراہ ایک مرد تھا۔ جب وہ دونوں کچن کے دروازے کے سامنے سے گزر رہے تھے تو صوفیہ کو اس شخص کی ایک جھلک دکھائی دی۔ ہاتھوں پر دستانے، سر پر اونی ٹوپی تھی اور نصف سے زائد چہرہ اونی مفلر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ رات خنک تھی مگر ایسی شدید ٹھنڈ بھی نہیں تھی کہ گھر کے اندر آنے کے بعد بھی اسے دستانے اور مفلر ہٹانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

"کیا گھر میں کوئی اور ہے؟" اس کی آواز میں

http://www.pakfunplace.com

سرسراہٹ سی تھی۔ غالباً "مفلر کی اوٹ سے بولنے پر ایسا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔

"کوئی نہیں۔ اور تو کوئی بھی نہیں۔ صرف تم اور صرف میں۔ میں اور تم۔ تم اور میں۔"

اس نے الیا کو گنگناتے ہوئے سنا۔ آواز کی لنگ گواہ تھی کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

صوفیہ نے سر تک کمبل تان کر کروٹ لے لی۔ معاً "ایک درد آلود چیخ بلند ہوئی۔ خوف سے صوفیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک اور چیخ گونجی جو چیخ سے زیادہ خرخراہٹ لگتی تھی۔ الیا یوں چلائی تھی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری اور جامد خاموشی۔ صوفیہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس سے ہاتھ پاؤں بھی ہلائے نہ جاتے تھے۔

بھاری جوتوں کی تیز چاپ کچن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس نے دروازے میں سے اس آدمی کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ اس کی صورت اب بھی مفلر نے چھپا رکھی تھی۔ اس کے دستانوں اور کوٹ پر تازہ خون لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا جس کا تیز دھار پھل گاڑھے سرخ خون سے تر تھا۔ صوفیہ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر تھم گیا۔ صوفیہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں کسی فسوں کے اثر سے اسی رخ جم گئی تھیں۔

"مجھے دیکھ کر تم ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کر رہی ہو۔ تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ منہ پر کمبل ڈال لو۔"

اس سرسراتی ہوئی آواز نے صوفیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑا دیں۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے تیزی سے کمبل کو منہ اور سر کے گرد لپیٹ لیا۔

"تم ایک خوش قسمت لڑکی ہو کہ تم نے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو۔۔۔ خیر چھوڑو۔ تم ہمیشہ شکر گزار رہو گی کہ ایسا نہیں ہوا۔" وہ پرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

صوفیہ نے نل کھولے جانے اور پانی گرنے کی آواز سنی تھی۔

"شاید ہماری ملاقات نہ ہوتی کیونکہ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ادھر ادھر کے معاملات میں بالکل نہیں الجھتا مگر ہوا یہ کہ باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا تھا اور باہر جانے سے پہلے مجھے کچھ چیزوں کو دھونے کی سخت ضرورت تھی۔ میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔ میرے دماغ میں آوازیں آتی ہیں جو مجھے اکساتی ہیں۔ مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑتی ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں معاشرے کی صفائی پر مامور کیا گیا ہوں ہر کسی کو اپنے فرائض نبھانے چاہئیں میں بھی نبھا رہا ہوں۔ میں برا آدمی ہوتا تو میں تمہیں بھی۔۔۔ ہاں اتنا یاد رکھو کہ مجھے نافرمانی اور چالاکی سے نفرت ہے۔ تم صبح تک اسی جگہ ایسے ہی کمبل تانے لیٹی رہو۔ میں تمہیں سہانے سپنوں کی دعا دیتا ہوں۔"

گرتے ہوئے پانی کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ چلا گیا تھا یا وہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ سانس روکے پڑی رہی جب بہت وقت بیت گیا اور معمولی سی آہٹ بھی نہ ابھری تو اس نے نہایت آہستگی سے کمبل نیچے سرکایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ کچن سے نکل آئی اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے قدم بڑھاتی الیا کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے کمرے تک پہنچی۔ بتی روشن کرنے پر اس کے بے اختیار ابکائی آ گئی تھی۔ الیا اپنے پسندیدہ رنگ کے قالین پر چت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں مردہ مچھلی کی طرح ابلی ہوئی تھیں۔ الیا کی ناک کا بانسہ اور ٹھوڑی کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر چاقو سے کچھ حروف کھدے ہوئے تھے۔

صوفیہ نے بغور دیکھا تو اسے WHORE لکھا ہوا دکھائی دیا۔

الیا کی جلد میں گدی ہوئی اس گالی کو دیکھ کر جانے اسے کیا ہو گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی کچن میں واپس گئی اور وہاں سے صابن، پانی اور ایک رومال لے کر آ گئی۔ الیا کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے وہ تن دہی سے اس کی پیشانی دھونے لگی۔ کسی اور کی نظر پڑنے سے

قبل اسے وہ گالی مٹانا تھی۔ وہ صابن اور پانی سے مل مل کر الیا کی پیشانی صاف کرتی رہی مگر وہ اس گالی کو معدوم نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کسی قلم سے تحریر کیے ہوئے حروف نہیں تھے۔ وہ کھال کے اندر اترے ہوئے گوشت میں کھبے ہوئے لفظ تھے۔

جب گرانٹ اس کمرے میں داخل ہوا تو اس نے صوفیہ کو پاگلوں کی طرح ایک خون آلود کپڑے سے مری ہوئی الیا کا ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔

الیا کے فیونرل پر گرانٹ نے اس سے کہا تھا۔

"کبھی کبھی خدا گناہ گاروں کو دنیا میں ہی عبرت کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ اس کی نعش دوسروں کو بتا رہی ہے کہ وہ کس طرح کی عورت تھی۔ وہ قیامت کے دن بھی اپنی پیشانی پر اس نشان کے ساتھ اٹھے گی۔ اس کا حساب ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ جہنم میں جلے گی۔ وہ بدکار عورت تھی۔ تم کبھی اس جیسی بننے کی خواہش نہ کرنا۔ اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی یہ گالی ہمیشہ یاد رکھنا۔"

☆ ☆ ☆

عمر کو جس فون کال کا شدت سے انتظار تھا۔ آخر ایک دن وہ آ گئی۔

"کیا تم محمد عمر ہو؟ میں آج اپنے پرانے گھر گیا تھا اور مجھے تمہارا پیغام ملا۔ میں ڈاکٹر داؤد بات کر رہا ہوں۔"

عمر تعین نہ کر سکا کہ اس کی آواز میں قدرتی طور پر کپکپاہٹ تھی یا وہ کسی جذباتی رو کے زیر اثر تھا۔

"جی میں عمر ہوں۔" اس نے تصدیق کی۔

"میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کہ مجھے کہاں آنا ہو گا۔"

"آپ مت آئیے۔ میں خود آپ کے گھر آ جاتا ہوں۔ آپ مجھے پتا بتا دیجیے۔"

"ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔ پتا ہے چھ سو بائیس این' رابنسن اسٹریٹ 'سلور لیک ڈسٹرکٹ۔ تم آج ہی آ رہے ہو نا؟"

"ہاں میں ابھی کچھ دیر میں روانہ ہو جاتا ہوں۔" عمر نے کہا۔

"ہم لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہیں یہاں تک آنے میں اندازاً "کتنا وقت لگے گا؟ تم فوراً" آ جاؤ۔"

اس کے انداز میں بے تابی تھی۔ فون رکھنے سے قبل اس نے متعدد بار یہی بات دہرائی تھی۔ جب وہ داؤد کے بتائے ہوئے مکان پر پہنچا تو اسے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے دو افراد دکھائی دیے۔ جیسے وہ اس کا استقبال کرنے وہاں موجود تھے۔ اسے تھوڑی سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ پینتالیس چھیالیس سال کا ایک درمیانے قد کا خوش رو مرد آگے آیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ اشتیاق بھری آنکھوں سے عمر کو گھور رہا تھا۔

"میں داؤد ہوں۔ وہ گھر میرا تھا جہاں تم پیغام چھوڑ گئے تھے۔"

فربہ جسم والی بوڑھی عورت داؤد کو پرے ہٹاتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور روہانسی آواز میں بولی۔ "تم پرنیاں کے بیٹے ہو؟ میری پرنیاں کے بیٹے۔ وہ کہاں ہے؟ اسے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے؟"

داؤد نے اس عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا۔ "آنٹی! ابھی اندر چل کر تسلی سے بات کرتے ہیں۔ مجھے اطمینان کر لینے دیں کہ یہ واقعی ہماری پرنیاں کا بیٹا ہے۔"

بوڑھی عورت کو اس بات سے تکلیف ہوئی تھی۔ "اسے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں کسی پوچھ تاچھ کی ضرورت ہے؟ تمہیں اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہیں؟ رنگ اور بناوٹ میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں ہے اور یہ دیکھو اس کی گردن پر تل ہے۔ پرنیاں کی اولاد کے سوا کسی کی گردن پر ایسا تل ہو سکتا ہے بھلا؟"

اب وہ مرتعش ہاتھوں سے عمر کی گردن کو چھو رہی تھی۔

عمر اس صورت حال سے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ داؤد نے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ

http://www.pakfunplace.com

پرنیاں کی امی ہیں۔ ان کا اس طرح سے محسوس کرنا ایک قدرتی سی بات ہے۔"

تو وہ اس کی نانی تھی۔ عمر نے ایک نئی نظر سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ اگر بڑھاپے نے اس کے نقوش کو اتنا بدل نہ ڈالا ہوتا تو اس میں پرنیاں کی شباہت ڈھونڈنا آسان ہوتا۔ اس کی رنگت پرنیاں کی طرح ہی سفید تھی اور پیشانی پر بالوں سے بننے والی قوس بھی مماثل تھی۔ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر کبھی آپا کے گھر والوں سے سامنا ہوا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس وقت وہ متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ وہ آپا کے لیے خوش تھا اور خود ان سے بے گانگی محسوس کر رہا تھا۔

پرنیاں کی ماں کبھی اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرتی اور کبھی اس کے چہرے کو انگلیوں سے چھوتی۔

"یہ اپنے منہ سے انکار کردے تو بھی میں نہ مانوں کہ یہ پرنیاں کا بیٹا نہیں ہے۔ میں پہچان سکتی ہوں۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ بیٹا! میں تمہاری نانی ہوں۔ پرنیاں تم سے میرا ذکر کرتی رہتی ہوگی؟"

وہ خاموش رہا۔

داؤد نے مداخلت کی تھی۔ "وینس آنٹی! ہم لوگ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ذرا تحمل سے کام لیں۔ آؤ عمر! ڈرائنگ روم میں چلیں۔"

داؤد' وینس کو بازوؤں سے تھام کر اسے داخلی دروازے کی سمت لے جانے لگا۔ وہ مسلسل گردن گھما کر عمر کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

ڈرائنگ روم میں اسے گھر کے دیگر لوگوں سے ملوایا گیا۔ ڈاکٹر داؤد کی بیوی' اس کا بیٹا اور دو بیٹیاں' ایک پختہ عمر کا گونگا بہرا آدمی جو غالباً" دماغی لحاظ سے غیر متوازن تھا۔ داؤد نے اس کے بارے میں عمر کو بتایا کہ وہ اس کا ماموں گونی تھا۔

"کیا پرنیاں امریکہ میں ہے؟ کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟"

داؤد کے اس سوال پر فضا میں امید کروٹیں لینے لگی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ ساکت بن گئے تھے۔

"نہیں۔ وہ پاکستان میں ہیں۔ لاہور میں رہتی ہیں۔"

"لاہور میں کب سے رہتی ہے؟"

"شاید پچھلے انیس بیس سال سے۔"

وینس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ "وہ مجھ سے چند سو میل دور رہتی تھی اور میں اسے ڈھونڈ نہ سکی۔ کیسی بدقسمت ہوں میں۔"

"لاہور میں کس کے پاس رہتی ہے؟" داؤد نے اگلا سوال کیا۔

"اکیلی رہتی ہیں۔ وہ ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔"

"تمہیں میرے گھر کا پتا کیسے ملا؟ کیا اس نے تمہیں میرے پاس بھجوایا ہے' کیا اب وہ ہم لوگوں سے ملنا چاہتی ہے؟"

انہیں مایوس کرکے عمر کو دکھ ہوتا لیکن اس نے صاف گوئی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

"میرا نہیں خیال کہ وہ آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے گھر والوں سے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ آپا کے علم میں نہیں ہے کہ میں آپ لوگوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ سراسر میرا اپنا ہے۔ میں مکمل یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے ملنے پر راضی ہوں گی یا نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ان سے کوئی غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ آپ سب سے شرمندہ ہیں۔"

"نہیں۔ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔" وینس نے تڑپ کر کہا۔ "وہ غلطی مجھ سے ہوئی بیٹا! سارا قصور میرا ہے۔ جب ہم نے اس کی شادی طے کی تو وہ پہلے ہی ایک مسلمان آدمی سے نکاح کرچکی تھی۔"

اس جملے نے عمر کو ساکت کردیا۔ اس کا باپ مسلمان تھا۔ یہ وہ غلطی تھی جس نے آپا کو دربدر کردیا تھا۔

وینس رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بول رہی

تھی۔ "وہ سرکش نہیں تھی۔ اس میں بغاوت نہیں تھی۔ وہ محبت میں مجبور ہوئی ہوگی۔ وہ کم عمر تھی' بچی' ناسمجھ تھی۔ اس نے مجھ سے حقیقت بیان کردی تھی مگر میں خود غرض بن گئی۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ میں نے اسے اتنا عاجز کردیا کہ گھر سے بھاگ جانے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ بچا۔ وہ شرم کے مارے مجھے یہ نہ بتا سکی کہ وہ پریگننٹ تھی۔ جو وہ کرچکی تھی وہ کیسے لوٹتا؟ میں چاہتی تو اسے معاف کردیتی۔ میں چاہتی تو اس کی مدد کرتی۔ میں نے نہیں چاہا۔ میں نے معاف نہیں کیا۔ وہ اور کیا کرتی؟ جب اس کی ماں ہی کوئی لچک دکھانے پر آمادہ نہیں ہوئی تو وہ کس سے کہتی؟ اور کس سے مدد [illegible]" آنسوؤں کی تندی سے وینس کی آواز [illegible]

داؤد کے ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

عمر نے جیب سے پرنیاں کا لکھا ہوا خط نکال کر داؤد کو دے دیا۔ "یہ ایک روز اتفاقاً" ان کے ٹرنک میں سے مجھے ملا تھا۔"

داؤد سے پہلے وینس نے اسے پڑھا تھا۔ پڑھتے ہوئے بار بار وہ گالوں پر بہتا ہوا پانی پونچھ رہی تھی۔ پھر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے رونے لگی۔

"مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں مناؤں گی اسے۔ ماں سے بھی کوئی چھپتا ہے کیا۔ یہ کوئی ہر روز مجھے مارتا ہے۔ کئی دفعہ اتنے زور سے کہ میرے جسم پر نشان پڑ جاتے ہیں اور یہ کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ میری پرنیاں نے اپنے لیے اتنی کڑی سزا تجویز کرلی۔ اتنی شرمندہ ہے کہ تمام زندگی اپنی ماں سے آنکھ ملانا نہیں چاہتی۔ مجھے اس کا فون نمبر بتاؤ' میں ابھی اس سے بات کروں گی۔ میری آواز سن کر......" اس سے آگے وینس سے بولا نہ گیا۔

داؤد خط پڑھ چکا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر وینس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"آنٹی! ہم جلد ہی اس سے بات کریں گے لیکن مجھے خوف ہے کہ وہ پھر کہیں روپوش نہ ہوجائے۔ عمر اس کی مرضی کے بغیر یہاں نہیں آیا۔ پرنیاں کے گلٹ نے اسے اس حد تک خود اذیتی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گی' کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اس خط کو پڑھ کر آپ کو لگتا ہے کہ وہ آسانی سے ہم سے ملنے پر تیار ہوجائے گی؟ ہمیں اس بارے میں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔"

وینس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ برستی آنکھوں سے عمر کی صورت دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد آنسوؤں کی روانی میں کمی آئی تو وہ بولی۔

"میں کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہر قیمت پر کچھ بھی کرو اسے میرے سامنے لے آؤ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔ کسی بھی طرح اسے مجھ سے ملوا دو۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" داؤد نے اسے حوصلہ دیا تھا۔

پھر وہ دونوں عمر سے سوال پوچھنے لگے۔

اس کی تربیت پرنیاں نے کی تھی تو وہ مسلمان کیوں تھا؟ اس کے پورے نام محمد عمر سے داؤد کو اس بات کا دھیان آیا تھا۔

وہ پرنیاں کو آپا کیوں کہتا تھا؟ کیا پرنیاں نے کبھی اس کے باپ کے متعلق کچھ بتایا تھا؟ وہ کیسی زندگی بسر کر رہی تھی؟ اس کی صحت کیسی تھی؟ کیا اس کے پاس پرنیاں کی کوئی حالیہ تصویر تھی؟

ان کے ہونٹوں پر سوال ہی سوال تھے۔

☆ ☆ ☆

"آپا کی ماں اور بھائی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ وینس آنٹی علاج کے سلسلے میں آتی ہیں۔"

پچھلے دنوں ہی ان کی ہارٹ بائی پاس سرجری ہوئی ہے۔"

"آپ کزن ہیں آپا کے؟"

اس کے پوچھنے پر داؤد اداسی سے مسکرایا۔ "کزن کہہ سکتے ہو ویسے ہمارے درمیان کوئی قریبی رشتہ داری نہیں ہے۔ ہم دونوں کی گریٹ گرینڈ مدر ایک ہیں۔ پریناں کے ابو اور میرے ڈیڈی میں شروع سے ہی بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ ایک اسکول اور ایک کالج سے پڑھے تھے۔ وہ سگے بھائیوں سے زیادہ قریب تھے۔ پریناں میرے ڈیڈی کو چچا اور میری مدر کو چاچی کہا کرتی تھی۔ اسی بنا پر میرے اور پریناں کے درمیان ___" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "میں اسے پسند کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا' وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہے۔ میں غلط تھا۔ اس کی شادی مجھ سے ہونے والی تھی۔"

عمر کو اپنے سوال پر ندامت ہوئی۔ میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب اٹھا کر وہ بلا مقصد اس کے اوراق پلٹنے لگا۔

"آپ کو یہ تو علم ہو گا کہ وہ میرے فادر سے کہاں ملی تھیں۔ امریکہ میں یا پاکستان میں؟" اس نے بدستور صفحے الٹتے ہوئے کہا۔

"پریناں نے اپنی زبان سے تو کبھی کچھ نہیں بتایا' البتہ میں سب جانتا ہوں' مجھے ان کی ایک ایک ملاقات کا احوال معلوم ہے۔ وہ ایک مفلوک الحال شخص تھا۔ وہ میساچوسٹس سے ہالی وڈ اسٹار بننے کا عزم لے کر لاس اینجلس آیا تھا۔ یہاں ایک پارک میں اس کی پریناں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہیں سے ان کے بیچ پسندیدگی کا سلسلہ شروع ہوا۔"

"آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟"

"کیونکہ میں تمہارے باپ کو جانتا ہوں عمر!"

اس نے کتاب بند کرتے ہوئے داؤد کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

"وہ کون ہیں؟ کیا آپ کبھی ان سے ملے ہیں؟ وہ کہاں ہیں؟ آپ ان کے متعلق کیا جانتے ہیں؟" وہ مضطرب ہو کر کرسی پر آگے کھسک آیا۔

"یہ سب باتیں خود اسی نے مجھے بتائی ہیں۔ اس سے نکاح کرنے کے ایک دن بعد پریناں اور ہم سب پاکستان چلے گئے کیونکہ تمہارے نانا بستر مرگ پر تھے اور مرنے سے پہلے میری اور پریناں کی شادی کے خواہش مند تھے۔ اس دوران پریناں اور تمہارے باپ احمد عمس کا اسکرین نیم ایڈم گرانٹ ہے۔ ان دونوں کی فون پر بات ہوتی رہی۔ اس نے پریناں سے وعدہ کیا کہ شادی کی تاریخ سے قبل اسے لینے پاکستان پہنچ جائے گا۔ جب وہ پاکستان جانے کی تیاری مکمل کر چکا تو اس کی ایکس گرل فرینڈ البا نے بلیک میل کر کے اسے روک لیا۔ دراصل اس نے معاشی حالات سے مجبور ہو کر ایک پورنوگرافک رسالے کے لیے کام کیا تھا۔ اسی کو بنیاد بنا کر البا نے اسے پاکستان جانے نہیں دیا۔

ان دنوں اسے ایک بڑی امپورٹنٹ فلم میں لیڈ رول ملا تھا۔ اگر البا ڈائریکٹر یا اسٹوڈیوز کو وہ میگزین دکھا دیتی تو اسے بلیک بال کر دیا جاتا۔ پریناں کو علم ہوا کہ وہ پریگننٹ ہو چکی ہے تو وہ کسی کو بتائے بغیر گھر سے کہیں چلی گئی۔ اس نے پھر گرانٹ سے کانٹیکٹ کیا اور اپنے پریگننٹ ہونے کی خبر سنائی مگر البا کی بلیک میلنگ سے ڈر کر اس نے پریناں سے کہہ دیا کہ ان کے نکاح کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد پریناں کا کچھ پتا نہیں چلا۔ بعد میں گرانٹ کے ہاتھ سے وہ فلم بھی چلی گئی۔ وہ ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے لگا۔ ادنیٰ سے کردار اور [illegible] پروڈکشنز وہ اور البا کئی سال ایک [illegible] رہے۔ البا کا مرڈر ہو گیا تو اس [illegible] کی گرانٹ نے پرورش کی۔ وہ [illegible] کرتا ہے۔ میرے منع کرنے [illegible] پاکستان گیا پریناں کو تلاش کرنے [illegible] ملی۔ ہم لوگ ہر جگہ ڈھونڈ چکے تھے۔ [illegible] پریناں کے نام بے شمار خطوط لکھے۔ ظاہر ہے ان کا بھی جواب نہیں آیا۔ پریناں کہاں رہی اور کس حال میں رہی ہمیں کچھ پتا نہیں۔"

لیکن عمر کو پتا تھا کہ آپا کس حال میں رہی تھی۔ محبت نے اسے کتنا خوار کیا تھا۔ پورنوگرافک رسالے اور فلموں کا تذکرہ سن کر اس کا سر گھومنے لگا تھا۔ اس نے اپنی نظر پر اعتبار کیا تھا' آپا کے آنسوؤں پر نہیں۔

اس کے ذہن کے پردے پر دیوانہ وار آگ بجھاتی ہوئی آپا کا عکس نمودار ہوا۔

"انہیں نہ جلاؤ' تمہیں خدا کا واسطہ' ایسا نہ کرو' میں تمہیں ان کے متعلق سمجھا سکتی ہوں۔"

اسے کوئی چیز چبھ رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کو یہ باتیں کیوں بتاتے رہے۔ جبکہ آپ دونوں کے درمیان Rivalry (رقابت) ہونی چاہیے تھی۔ پھر آپ لوگوں میں ایسے مراسم کیسے بن گئے کہ وہ انتہائی ذاتی چیزیں آپ سے شیئر کرتے [illegible]" اس نے صدمے سے سنبھل کر کہا۔

داؤد ہاتھ کی [illegible] کنپٹی کو سہلا رہا تھا۔ "شیئر کرنے کو [illegible] اور تھا ہی نہیں۔ پریناں کی باتیں کرنے کے لیے صرف میں ہی دستیاب تھا تو اس نے مجھ ہی پر اکتفا کر لیا۔ پریناں کی گمشدگی کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں پریناں تک جانے کا کوئی راستہ دکھا سکوں۔ پھر ہم وقتے وقتے سے ملتے رہے۔ میں اس سے پریناں کی بابت پوچھتا اور وہ مجھ سے سوال کرتا۔ ہم دونوں میں ایک عجیب سا تعلق استوار ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری ملاقاتوں کا درمیانی وقفہ بڑھتا رہا' پھر بھی ہم ایک دوسرے سے مکمل غافل نہیں ہوئے اور عمر! میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔"

اس کا جسم تن گیا۔ گھٹنے پر دھری ہوئی کتاب پھسل کر فرش پر جا گری تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ ایڈم گرانٹ ہے۔" داؤد نے بیڈ پر لیٹے ہوئے ایک دبلے اور نحیف شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا۔

عمر بے ساختہ اس کے قریب چلا گیا۔ پھر اس کے قدم یوں رک گئے جیسے کسی چابی بھرے کھلونے کی چابی گھوم کر چکر مکمل کر چکی ہو۔ وہ جیسے کسی آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ عکس تیس سال بعد والے عمر کا تھا۔ اس [illegible] کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک ایک ایک عضو میں عمر کو اپنا آپ دکھائی دیا۔ اگر وہ اس سے پہلے کہیں ملا ہوتا تو کسی کے بتائے بغیر اسے پہچان لیتا۔ وہ بھی عمر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی حلقہ زدہ آنکھوں میں الجھن اور ناگواری تھی۔ پھر اس کی توجہ داؤد کی جانب مبذول ہوئی۔

"داؤد فرینڈ! تم کل پورا دن نہیں آئے۔ میں آدھی رات تک اسٹاف سے پوچھتا رہا۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تمہیں میری تنہائی پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ اگر تم مصروف تھے تو کم از کم تمہیں پیغام بھجوانا چاہیے تھا۔ جب تمہیں پتا ہے کہ تمہارے علاوہ یہاں کوئی نہیں آتا تو تم اتنی لاپروائی کیوں برتتے ہو؟" بولتے ہوئے وہ ہانپ رہا تھا۔

"میں تمہاری تنہائی کا بندوبست کر کے لایا ہوں۔ اب ایک اور مہمان بھی تم سے ملنے آیا کرے گا۔ اس سے ملو' یہ تمہارا بیٹا ہے عمر۔" داؤد نے عمر کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بدکا جیسے کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو۔

"تم کتنے برے مذاق کرتے ہو ڈاکٹر! میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اپنی بیوی کو تو میں نے مار دیا تھا۔ پریناں کو قتل کر دیا تھا۔ پھر بیٹا کہاں سے آ گیا۔" وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

"لیکن مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے پریناں کو قتل نہیں کیا تھا۔ کسی اور کو کیا تھا' کسی کو جان سے مارا تو ضرور تھا مگر وہ تھا کون؟"

عمر نے تشویش سے داؤد کو دیکھا۔ جواباً اس نے سر کو اس انداز سے جنبش دی جیسے اسے انتظار کرنے کو کہہ رہا ہو۔

"گرانٹ! یہ پریناں آرک کا بیٹا ہے۔ تمہارا اور پریناں کا بیٹا۔ پاکستان سے تمہیں تلاش کرنے آیا ہے۔ تم اس سے بات تو کرو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ۔" داؤد نے رسان سے گرانٹ کو سمجھایا۔

http://www.paktunplace.com

"میں نہیں مانتا۔ میں یہ بات تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔" گرانٹ درشتی سے بولنے لگا۔ "میں تو اکیلا ہوں صحرا میں اگنے والے کسی تھوہر کی طرح میری یادداشت اتنی بھی خراب نہیں ہوئی کہ میں اپنے بیٹے کو بھول جاؤں۔ ریزیاں نے کہا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مگر اس بات کو زمانے گزر گئے۔ میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ اسے میرے پاس ضرور بھیجتی۔ وہ مجھ سے لاکھ نفرت کرتی ہو میرے بیٹے کو کبھی مجھ سے دور نہ رکھتی۔ اس کا دل ایسا سخت ہے ہی نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔ ان دنوں تو اتنی کثرت سے کہ میں کچھ اور سوچ ہی نہیں پاتا۔ اول تو تم آتے نہیں داؤد اور اگر آتے ہو تو میری بے بسی کا مذاق اڑاتے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ اور اس لڑکے کو بھی لے جاؤ۔"

اس نے ایک ناراض نگاہ عمر پر ڈالی اور کروٹ لے کر رخ بدل لیا۔

داؤد نے ایک اسٹول کھینچ کر عمر کو بیٹھنے کے لیے کہا اور اس کے شانوں پر ہاتھوں سے ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ عمر کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس شخص سے کیا بات کرے۔ وہ چپ چاپ اس کی ابھری ہوئی ہڈیوں والی پشت کو دیکھتا رہا۔ وہ کسمسا رہا تھا اور دھیرے دھیرے دیوار کی سمت کھسکتا جاتا تھا۔ جیسے وہ بہت بے چینی محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے آہستگی سے گردن موڑی اور پیچھے دیکھا۔ عمر کو وہیں بیٹھے دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔

"تم مجھے کیوں ستا رہے ہو؟ کیا تمہیں ایک بوڑھے بیمار آدمی کی بے چارگی کا تماشا دیکھ کر مزہ آتا ہے۔"

اس نے پھر سے دیوار کی طرف چہرہ گھما لیا اور تب عمر کو اس کی پنڈلی پر اور سرکے ہوئے میلے پاجامے سے کچھ نشان نظر آئے تھے۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور اس کی نگاہ داؤد کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکنے لگی۔ وہ راہداری کے موڑ پر ایک ادھ کھلے دروازے میں ایستادہ نظر آیا تھا۔ وہ کسی شخص کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ اس نے بھی عمر کو دیکھ لیا اور اشارے سے اسے قریب بلایا۔ اسے لے کر وہ دفتری طرز پر سجے ہوئے ایک کمرے میں آ گیا۔

"تم کچھ پینا چاہو گے؟ چائے یا کافی۔"

داؤد کے پوچھنے پر اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔

"ان کو کیا بیماری ہے؟ میں نے ان کے جسم پر Leisons (چھالے) دیکھے ہیں۔ کیا ان ہی کی وجہ سے وہ زیر علاج ہیں؟"

داؤد کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا ہوئے جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ چند لمحے وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسائے انہیں چٹخاتا رہا۔

"یہ ایک قسم کا کینسر ہے۔"

عمر کو افسوس ہوا تھا۔ ویسا ہی افسوس جیسا کسی مصیبت زدہ انسان کے بارے میں جان کر ایک حساس دل رکھنے والا دوسرا انسان محسوس کرتا ہے۔

"اس کا علاج ممکن ہے؟ میرا مطلب ہے کیا ان کے صحت یاب ہونے کی امید ہے؟" داؤد نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کو ترتیب دیتے ہوئے دھیرے سے سر ہلایا۔ "علاج تو ممکن ہے۔ لیکن گرانٹ کے کیس میں یہ ناممکن ہے۔ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ایسا کیوں ہے؟" عمر نے تعجب سے پوچھا۔

"اصل میں...." اس نے گہری سانس لیتے ہوئے گردن کی پشت کو ہاتھ سے دبایا۔ "ایڈز ہے۔"

عمر کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

عمر کو اس شخص پر رحم آ رہا تھا۔ وہ زندگی میں ایک ایسے مقام پر اس کے روبرو ہوا تھا جب اس سے قلبی وابستگی ہونے کے امکانات ناپید نہیں تو محدود ضرور تھے۔ گرانٹ کی نذر کرنے کے لیے اس کے خزانے میں ہمدردی سے زائد مالیت کا کوئی سکہ نہ تھا۔

"اس کی یادداشت کا بھی مسئلہ ہے۔ کبھی کبھار تو وہ اپنا نام تک یاد نہیں رکھ پاتا۔ وہ اندھیرے میں راہ

بھولے ہوئے انسان کی مانند خوف زدہ اور تنہا ہے۔" داؤد مزید کہہ رہا تھا۔ "تم اگر اس سے ملنے آ جایا کرو تو اسے اچھا لگے گا۔ اس کی تنہائی کم ہو جائے گی۔"

عمر نے خود کو یاد دلایا کہ اس کا کام یہیں ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کی اسے چاہت تھی نہ حاجت۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کے لیے وہ جو کر سکتا تھا' اس نے کر دیا تھا۔ جہاں تک گرانٹ کا تعلق تھا تو عمر اور اس کے مابین چھلکے اور گودے والا معاملہ تھا۔ ایک بار دونوں الگ ہو جائیں تو لاکھ یکجا کیے جائیں پھر سے پھل نہیں بنتا۔ اس نے طے کیا کہ یہاں سے جانے کے بعد دوبارہ گرانٹ سے نہیں ملے گا۔

معذرت طلب لہجے میں داؤد کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ "میں کوشش کروں گا البتہ وعدہ نہیں کرتا۔ فرصت ملی تو آؤں گا۔"

اسے کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر داؤد کی آنکھوں میں مایوسی در آئی۔ "تم جا رہے ہو؟ ڈینس آنٹی تو بضد ہیں کہ تم جب تک امریکہ میں ہو' ہمارے پاس رہو۔ میری بھی یہی خواہش ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے عمر!"

"یہ مناسب نہیں لگتا۔"

"اس میں غیر مناسب کیا ہے؟ ہم تمہارے اپنے ہیں' کوئی غیر تو نہیں۔" داؤد نے اصرار کیا۔

وہ کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ داؤد کے اجازت دینے پر ایک میل نرس نے اندر آ کر کہا۔ "ڈاکٹر فرڈیننڈ! کمرہ نمبر تیرہ کا مریض آپ کو بلانے پر اصرار کر رہا ہے اور وہ بری طرح چیخ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔"

نرس کے جانے کے بعد داؤد دروازے کی جانب بڑھا تو عمر اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "اچھا تو پھر میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا۔"

داؤد گردن ٹیڑھی کر کے اسے دیکھتے ہوئے عجیب انداز سے مسکرایا۔ "وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ مجھے بلانے کے لیے اس نے کبھی یہ حربہ نہیں اپنایا۔"

"کون صاحب؟"

"یہی چیخنے چلانے والا۔"

جب وہ گرانٹ کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ غضب ناک آنکھوں سے عمر کو گھورنے لگا۔ "ادھر آؤ' یہاں میرے قریب آؤ۔" اس نے چلا کر حکم دیا۔

عمر نے اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔

"سچ سچ بتاؤ تم نے یہ کیوں کہا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ تمہیں میرے بارے میں معلوم کیسے ہوا کہ میری کوئی ایسی اولاد بھی ہے جس سے میں کبھی ملا ہی نہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی اس منصوبے میں تمہارا ساتھی ہے؟ تم دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنانے کا سوچا ہے۔ کیا یہ خیال کسی فلم کو دیکھ کر آیا ہے؟"

عمر اس افتاد سے گھبرا گیا تھا مگر اس نے نرمی سے کہا۔ "میں فلمیں نہیں دیکھتا۔"

"وہ بھی نہیں دیکھتی تھی۔ میری خاطر اس نے دیکھنا شروع کر دیں۔" گرانٹ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"آپ کی خاطر تو وہ اب بھی دیکھتی ہیں۔" عمر کی زبان سے بے اختیار پھسل گیا۔

"میرے ساتھ یہ خوف ناک مذاق کیوں کر رہے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا غلطی ہے میری جس کی سزا دینے تم آئے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ عمر کو اس کے ہونٹوں پر سرخ بلبلے پھوٹتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بستر پر دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

داؤد تیزی سے آگے آیا اور ایک ہاتھ سے گرانٹ کا سر تھام کر دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر سہلانے لگا۔

"چیخو مت۔ کوئی تمہارے خلاف سازش نہیں کر رہا۔ کوئی تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا۔" وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

گرانٹ نے داؤد کے بازو کی اوٹ سے عمر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

http://www.pakfunplace.com

"اس کی آنکھیں۔ لو خدا اس کی آنکھیں۔"

وہ بے دم ہو کر داؤد کے بازوؤں میں جھول گیا۔

"عمر! میں امید رکھوں کہ جلد ہی تم گرانٹ سے دوبارہ ملنے آؤ گے۔" کمرے سے باہر آکر داؤد نے اپنی بات دہرائی تھی۔

عمر خاموشی سے اس کے پہلو میں چلتا رہا۔

"میں تمہاری ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تمہیں آنا چاہیے۔"

"میرا ویزا مختصر مدت کا ہے۔ جانے میں وقت نکال پاؤں یا نہیں۔" اس نے پھر معذرت کی تھی۔

"گرانٹ کے پاس بھی بہت کم وقت باقی ہے۔ تمہیں زیادہ دن نہیں آنا پڑے گا۔"

داؤد نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حکیم بیگم نے استری کیے ہوئے کپڑے ترتیب سے الماری کے خانے میں رکھے پھر چارپائی پر پڑی ہوئی بستر کی چادریں تہ کر کے دوسرے خانے میں اوپر تلے جمانے لگی۔ پٹ بند کر کے وہ تھوڑی دیر کمر سیدھی کرتی رہی اور مڑ کر پرنیاں کو دیکھا جو بیڈ کی پشت کے سہارے نیم دراز ایک کتاب پڑھتے ہوئے اونگھ رہی تھی۔ الماری کے زنگ کھائے ہوئے قبضوں سے برآمد ہونے والی چرچراہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ کتاب بند کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

حکیم بیگم بولی۔ "مجھے کپڑوں پر لوہا کرنے دی جاچ نئیں ہے دھیئے! اینیں دھوبی دا خرچا بچ جاتا (مجھے کپڑے استری کرنے کا طریقہ نہیں آتا) ورنہ دھوبی کا خرچ بچ جاتا۔)"

پرنیاں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کل سانجھ سے چھوٹی دا جوائی آئے گا مجھے پنڈ لے جانے کے لیے۔ ہن تو ٹھیک ہے۔ اپنے چھوٹے موٹے کم آپ کر سکتی ہے۔ میں صالحہ اور مزمل [illegible] بڑی اوور گئی ہوں۔ جے تو روکی [illegible] جاتی۔ کی مرضی ہے تیری؟" (کل صبح چھوٹی کا داماد آئے گا مجھے پنڈ جانے کے لیے۔ اب تو ٹھیک ہے۔ اپنے چھوٹے بڑے کام آپ کر سکتی ہے۔ میں صالحہ اور مزمل کے لیے اداس ہو گئی ہوں۔ اگر تو روکتی ہے تو میں نہیں جاتی۔ کیا مرضی ہے تیری؟) حکیم بیگم نے نزدیک آتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں ہفتہ دس دن ٹھہر کے فیر پھیرا مار جاؤں گی۔"

(میں ہفتہ دس دن بعد پھر چکر لگاؤں گی)

"آپ بے فکر ہو کر جائیے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آپ سے کہنے ہی والی تھی کہ بہت دن ہو گئے۔ آپ کو گاؤں جانا چاہیے۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی ارادہ کر لیا۔" پرنیاں نے کہا۔

"میں ٹیلی فون تے خیر مہر پوچھتی رہوں گی۔ تجھے اک بھور پریشانی آئے، مجھے بلا لینا۔ میں کجھ کھان پین لئی لے آؤں۔ کسی شے کو جی کرتا ہے آج؟"

(میں فون پر خیریت پوچھتی رہوں گی تجھ کو ذرا سی بھی پریشانی ہو تو مجھے بلا لینا۔ میں کچھ کھانے پینے کے لیے لاؤں کس چیز کو دل چاہتا ہے آج؟)

پرنیاں نے انکار کر دیا۔ "ابھی تھوڑی دیر تو ہوئی مجھے کھانا کھائے ہوئے۔ شام کو میں خود کوئی چیز پکا لوں گی۔"

"لے دس، کچا روٹی تے چار دانے دال دے کھا کے تیرا رج ہو گیا؟ کھا پی کر تیرے جسم میں ذری جان آئے۔" (لو بتاؤ۔ ذرا سی روٹی اور دال کے چار دانے کھا کر تیرا پیٹ بھر گیا؟ کھا پی کر تیرے بدن میں ذرا جان آئے)

"ابھی مجھے بھوک نہیں [illegible] ہو گی تو میں کھاؤں گی۔ میں زیادہ وقت [illegible] رہتی ہوں اس لیے بھوک کم لگتی [illegible]" پرنیاں نے کہا۔

"[illegible] تیری مرضی۔ میں ویڑے دا کھلار انیر کے آئی ہوں۔ (میں صحن کا پھیلاوا سمیٹ کر آئی ہوں۔) تو سوچ لے آج ہانڈی کی پکانی ہے۔" حکیم بیگم صحن میں چلی گئی اور جھاڑو سے گرد سمیٹنے لگی۔

چند لمحے پرنیاں اسے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پچھلے کئی روز سے حکیم بیگم اس کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ ایک ماں، نرس اور خادمہ کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اکتائے بغیر، کچھ جتائے بغیر۔ مسز سوزین نے اسے مدد کی پیشکش کی تھی۔ مگر حکیم بیگم کے ہونے سے اسے بہت آرام تھا۔ کوئی اور شاید اس طریقے سے اس کا خیال نہ رکھ پاتا۔ کلائیوں کے زخم اب مندمل ہو چکے تھے۔ بائیں ہاتھ میں بے حسی تھی تاہم وہ کسی حد تک اس سے کام لینے پر قادر ہو گئی تھی۔

وہ آہستگی سے بستر سے پاؤں اتارتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ہلکی سی نقاہت باقی تھی مگر وہ قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ [illegible] سے چلتی ہوئی وہ صحن میں آئی اور حکیم [illegible] سے جھاڑو لے لی۔

"مجھے [illegible] چلنے سے ہی میرے بدن کی توانائی [illegible] ہو گی۔ آپ ذرا آرام کر لیں۔"

"[illegible] فرق نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر وی کہتا تھا کہ [illegible] تو چھیتی ٹھیک ہو جائے گی۔"

(ڈاکٹر بھی کہتا تھا چلنے پھرنے سے تو جلدی ٹھیک ہو جائے گی)

جھک کر جھاڑو دینے کی مشقت سے جلد ہی اس کا سانس پھول گیا۔ وہ رک رک کر ستاتے ہوئے صفائی کرتی رہی۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو حکیم بیگم باورچی خانے کے دروازے میں کرسی پر بیٹھی چاولوں سے کنکر چن رہی تھی۔

"آج یخنی والا پلاؤ بنا لیتی ہوں۔ کرارا (تیکھا) کر کے بناؤں گی۔ بے سوادے مشلوے کھانے کھا کے تیرا منہ بھسا ہو گیا ہے۔" (بے مزہ پھیکے کھانے کھا کے تیرے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے)

اس کے متوجہ ہونے پر حکیم بیگم مسکرائی تھی۔

کیسی بے ریا مسکراہٹ تھی۔ اس میں کوئی بھید نہیں تھا۔ کوئی دکھاوا نہیں تھا۔ وہ کل صبح واپس جا رہی تھی۔ پرنیاں نے سوچا کہ اب وہ کہہ ڈالے جو مدتوں پہلے اسے کہہ دینا چاہیے تھا۔ وہ لفظ جو اس پر قرض تھے انہیں حکیم بیگم کے سپرد کرنے کا موقع شاید اس کے بعد کبھی نہ آتا۔ وہ کمرے سے ایک کرسی گھسیٹ کر باہر لائی اور حکیم بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔ گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر آنکھیں جمائے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

"میں نے کبھی آپ سے شکریہ کا ایک لفظ نہیں کہا۔ حالانکہ میں لاکھ بار بھی شکریہ کہتی تو کم ہوتا۔ آپ نے اس وقت میرے لیے اپنے گھر کا دروازہ کھولا، جب مجھ پر سب در بند کر دیے گئے تھے۔ آپ نے تب میری مدد کی، جب کوئی دوسرا یہ کام کرنے پر تیار نہیں تھا۔ آپ نے میری خاطر اپنی برسوں کی کمائی ہوئی نیک نامی کو داؤ پر لگا دیا۔ آپ نے لوگوں کی ملامت سہی، اپنوں کی ناراضی برداشت کی اور ایک لمحے کے لیے بھی احسان نہیں جتایا۔ کوئی صلہ وصول نہیں کیا۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ آپ انسان ہیں تو میں آپ کو فرشتہ کہتی۔ میں خاک بن کر آپ کے پیروں میں بچھ جاؤں تو بھی آپ کی نیکی کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔

اگر عمر کی تربیت میں نے کی ہوتی تو بھی اسے اتنا اچھا نہ بنا سکتی۔ آپ نے جیسی تربیت کی، میں کبھی ویسی نہ کر پاتی۔ اس نے اپنی ہر اچھی عادت آپ سے لی ہے۔ وہ اچھا انسان ہے، اچھا مسلمان ہے۔ جو بھی خوبی اس میں ہے، وہ آپ کی وجہ سے ہے۔ مجھے عمر کی ماں ہونے پر فخر ہے۔ وہ میرا بیٹا ہونے پر شرمسار ہے تو اس میں اس کی غلطی نہیں۔ میں نے اس کی زندگی مشکل بنانے میں کیا کسر چھوڑی؟ کون سا ایسا قصور ہے جو مجھ سے نہیں ہوا؟ مجھے اس پر حق جتاتے ہوئے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔

آپ کے لیے اس کا پیار دیکھ کر مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ وہ آپ سے علیحدہ ہو کر کتنا ناخوش تھا مگر میں ضد پر اڑی رہی۔ جب میں اسے آپ سے مانگنے گئی تو آپ کے ماتھے پر ایک شکن تک نہیں آئی۔ ایسا حوصلہ کہاں سے لیا ہے آپ نے؟ اپنا دل نکال کر خود اپنے ہاتھوں سے کون کسی کو دیتا ہے؟

مجھے کسی نے ایک چڑیا کا بچہ پالنے کے لیے دیا ہوتا اور دس دن بعد آکر مجھ سے واپس مانگتا تو میں کبھی نہ دیتی۔ آپ نے اٹھارہ سال عمر کو پال پوس کر میرے

http://www.pakfunplace.com

ایک بار مانگنے پر اسے مجھے دے دیا۔ میرا مذہب مختلف ہے لوگ اس فرق کو لے کر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ آپ نے اپنے خلوص میں تعصب کا ایک تنکا تک شامل نہیں ہونے دیا۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم کسی Saint (ولی) سے ملی ہو تو میں بلا جھجک آپ کا نام لے دوں گی۔"

حکیم بیگم کو اب لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اس کے ہاتھ محض چاولوں کو بکھیرنے اور سمیٹنے میں مصروف تھے۔ پرنیاں نے نظر اٹھائی تو ان دونوں کی آنکھیں ملیں۔ حکیم بیگم کی آنکھوں میں نمی تھی۔ گلوگیر آواز میں وہ بولی۔

"میری صفتاں کر کے میرے دل وچ تکبر نہ پیدا کر۔ میرے پلے کجھ وی نئیں۔ میرے اللہ دا کرم نہ ہوتے میں پیر پیر تے منہ بھار ڈھے جاواں۔ سب اسی دی رضا ہے۔ بندے دی ڈور اس دے ہتھ وچ ہے۔"

(میری تعریفیں کر کے میرے دل میں تکبر نہ پیدا کر۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ میرے اللہ کا کرم نہ ہو تو میں قدم قدم پر منہ کے بل گروں۔ سب اس کی رضا ہے۔ بندے کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔)

پرنیاں اپنے کمرے سے سنہری غلاف میں لپٹی ہوئی ایک ضخیم کتاب لے کر آئی اور احتیاط سے اسے حکیم بیگم کے حوالے کیا۔

"میں آپ کو کوئی تحفہ دینا چاہتی تھی۔ میں نے بہت غور کیا اور اس سے بہتر کوئی تحفہ میرے ذہن میں نہیں آسکا۔ یہ قرآن میں نے آپ کے لیے منگوایا ہے۔"

حکیم بیگم نے قرآن کے غلاف کو بوسہ دے کر اسے سینے سے بھینچ لیا اور اٹھ کر پرنیاں کا ماتھا چوم لیا۔

"میں صدقے، میں واری تیری سیانف توں اللہ تیری اس نیکی دا اجر دے گا۔ تیری ہر مشکل، ہر اوکھیائی دور ہو گی۔ عمر دے دور جان دا غم نہ کر۔ وہ آپ تیرے کول آئے گا۔ تیری دلجوئی کرے گا۔ تیرا درد ونڈائے گا۔"

(میں صدقے تیری اس سمجھ داری کے۔ تیری اس نیکی کا اللہ اجر دے گا۔ تیری ہر مشکل، پریشانی دور ہو گی۔ عمر کے دور جانے کے غم نہ کر۔ وہ خود تیرے پاس آئے گا۔ تیری دل جوئی کرے گا۔ تیرا درد بانٹے گا۔)

پرنیاں کے ہونٹوں پر بجھی ہوئی راکھ جیسی مسکراہٹ آگئی۔ "شاید آجائے، شاید نہ آئے۔ وہ بھی تو تقدیر کا مارا ہوا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ گزارہ کر رہا تھا۔ وہ ضرور رہ لیتا اگر تقدیر اسے رہنے دیتی۔ جانے اس نے آپ کو مجھ سے متنفر ہونے کی وجہ بتائی یا نہیں۔ اسے میرے سامان میں غیر اخلاقی تصاویر والا ایک رسالہ ملا تھا۔ وہ اسے میرے کردار کی پستی کا ثبوت سمجھا ہو گا۔ دراصل اس رسالے میں اس کے باپ کی تصویریں تھیں۔ میں نے کچھ دوسری یادگاروں کے ساتھ اسے بھی سنبھال رکھا تھا۔ جب عمر روٹھ کر جا رہا تھا تو میرا دل چاہا کہ میں وضاحت کر دوں، اپنی صفائی پیش کروں۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس کا باپ اس کی نظر میں ذلیل ہو جائے گا۔ ماں پر تو اسے کبھی فخر تھا ہی نہیں، باپ بھی نظر سے گر جاتا تو اس کی تکلیف اور بڑھ جاتی۔ میرے بے عزت ہونے سے اس کی اذیت کم رہتی تھی تو میرا بے عزت ہونا ہی اچھا تھا۔"

حکیم بیگم کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

☆ ☆ ☆

سڑک کے کنارے، جہاں تک نظر جاتی تھی۔ سنبل کے سیدھے تنوں والے اونچے پیڑ صف آرا تھے۔ چمک سے محروم روئی سفید چونے کی چھینٹوں کی مانند سیڑھی کے فرش پر پھیلی تھی۔ سوکھے ہوئے پیلے پتوں کی ایک ڈھیری ہوا کی ٹھوکر سے بکھری اور کئی پتے اس پر آ گرے۔ ہوا تھم تھم کر بہہ رہی تھی۔ جب بھی کوئی جھونکا آتا، اس پر کچھ پتے اور تنکے اچھال دیتا۔ وہ اپنے بالوں اور لباس میں لٹکنے والے ان تنکوں کو جھاڑتی نہیں تھی۔ اب یہ بھی خیال نہیں تھا کہ اس کی چادر شانوں سے پھسل کر نیچے گر چکی تھی اور چادر کا پلو سیڑھیاں اترتے چڑھتے لوگوں کے پیروں

تلے روندا جا رہا تھا۔

اسی عالم میں چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اسے کئی گھنٹے بیت گئے تھے۔ سروس شروع ہونے سے بہت پہلے وہ آ کر وہاں بیٹھ گئی تھی۔ عبادت میں شریک ہونے کے لیے آنے والے لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ کسی نے ہمدردی سے، کسی نے لاتعلقی سے، کسی نے حیرت سے۔ لیکن وہ سب گزر گئے تھے اس کے پاس رکے بغیر، منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر۔

اب جب کہ سروس اختتام پذیر ہو گئی تھی اور لوگ گھروں کو لوٹنے لگے تھے تب بھی وہ اسی کھوئی ہوئی کیفیت میں اسی جگہ موجود تھی۔

وہ چرچ سے باہر آنے والوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ ان میں سے بعض چہرے آسودہ تھے۔ بعض [illegible] اور بعض عبادت کی پاکیزگی سے دمکتے ہوئے۔ ان سب میں ایک خاصیت مشترک تھی۔ وہ سب خدا کی قربت سے سرفراز تھے۔ ان سب پر خدا کی مہربان نگاہ تھی۔

ہر چہرے کو دیکھنے کے بعد اس کی یاسیت اور ملال میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ وہ ٹکٹکی باندھے ان عبادت گزاروں کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہی حتیٰ کہ سب چلے گئے۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں خالی رہ گئیں۔ ان کا لمس سرد تھا اور تواتر سے اس کے بدن میں اتر رہا تھا۔ دھوپ کے دھبے اب اس کے پیروں پر چڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک ہاتھ کا دباؤ اسے اپنے شانے پر محسوس ہوا۔ اس نے گردن گھماتے ہوئے پہلو میں دیکھا تھا۔

مسز سوزین اس کے برابر زینے پر بیٹھ رہی تھی۔

"میں نے نو بجے کے قریب تمہیں یہاں دیکھا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ تم تب سے اسی جگہ بیٹھی ہوئی ہو اور عبادت میں شامل نہیں ہوئیں۔ کیا میرا شک درست ہے؟"

جھوٹ بولنے کی خواہش کے باوجود اس نے اقرار کر لیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"ایسا کیوں پرنیاں! تم کیوں اس طرح راستے میں بیٹھی ہوئی ہو؟" مسز سوزین پریشان ہو گئی۔

"یہ کوئی عام راستہ تو نہیں ہے۔ کیا مجھے چرچ کی سیڑھیوں میں بیٹھنے کا بھی حق نہیں ہے؟"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ سیڑھیوں میں کیوں؟ اندر کیوں نہیں جاتیں تم؟"

مسز سوزین اس کے بالوں میں الجھے ہوئے پتے چننے لگی۔

"مجھے اندر جانے کا اذن نہیں۔ دہلیز پر بیٹھ جاؤں، غنیمت ہے۔" اس نے سنبل کے پیڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے اندر جو چھپائے پھرتی ہو، اسے ظاہر کر دو۔ بوجھ اتار دو۔ تم تھک چکی ہو۔" وہ درختوں کے تنوں کو گھورتی رہی۔

"میں نے اپنی مرضی سے خدا کو چھوڑا تھا۔ اب وہ مجھے چھوڑ دے تو مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

مسز سوزین نے اس کی چادر اٹھا کر جھاڑی اور اسے اوڑھاتے ہوئے بولی۔ "خدا ایسا نہیں کرتا۔ ایسا تو دنیا کرتی ہے۔ دھوپ کو دیکھو، وہ ہر شے پر اتر رہی ہے۔ بلا تخصیص سب کو نواز رہی ہے۔ کسی کو حرارت اور روشنی سے محروم نہیں کر رہی۔"

پرنیاں کی بے تاثر نظریں ہوا میں معلق تھیں۔

"دھوپ پیڑ پر اترتی ہے تو وہ پھول اور پھل دیتا ہے اور کسی پتھر پر سو برس دھوپ پڑتی ہے، وہ کیا دے گا۔ بے فیض، ناشکرا پڑا رہے گا جوں کا توں۔ یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔"

مسز سوزین کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ چند ثانیے خاموش رہ کر وہ آہستہ سے بولی۔

"ہم دنیا کو تھامے رکھنے کی خاطر ہلکان ہو جاتے ہیں۔ دنیا چلی نہ جائے، دنیا چھوٹ نہ جائے۔ اس ڈر سے اتنی زور سے مٹھیاں دبائے ہیں کہ ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں، کلائیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اگر ہم مٹھیاں کھول کر دنیا کو جانے دیں تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹے گی۔ صرف ہماری تکلیف کم ہو جائے گی۔ ہمیں اس بیگار

سے نجات مل جائے گی۔ میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ تمہیں اس بارے میں سوچنے کو کہا ہے۔ آج پھر کہہ رہی ہوں سنجیدگی سے غور کرو۔ دنیا کو چھوڑ دو۔ خداوند کی مہربان پناہ میں آجاؤ۔"

پرنیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ سسٹر سوزین نے تشویش سے پر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دنیا تو وہ چھوڑے جس کے پاس دنیا ہو۔ میں تو خالی ہاتھ ہوں۔ خدا اور دنیا دونوں طرف سے کوری ہوں۔ آپ ایک مفلس سے دولت لٹانے کو کہہ رہی ہیں؟"

وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

"پرنیاں! تمہاری حالت پر میرا دل کڑھتا ہے۔ تمہارے رنج کی کوئی حد ہی نہیں۔ تم کیوں خود کو برباد کر رہی ہو؟ اگر دنیا نے تمہاری قدر نہیں کی تو خدا کے پاس آجاؤ۔ تمہیں دروازہ کھلا ملے گا۔ کتنی ہی ننز کو میں جانتی ہوں جو ہر رشتے سے مایوس ہو کر سکون ڈھونڈتی ہوئی آئیں اور آج وہ چین سے ہیں۔ ان کا اضطراب دور ہو چکا ہے۔ کیونکہ خدا نے اپنا مسیحا ہاتھ ان کے غمگین دلوں پر رکھ دیا ہے۔"

پرنیاں کی ہنسی تھم گئی۔ اس نے سنگ مرمر کے قدمچے کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے ایک نظر سسٹر سوزین کو دیکھا۔

"ہم تب خدا سے رجوع کرتے ہیں، جب دنیا ہمیں رد کر چکی ہوتی ہے۔ تمام دروازوں سے دھتکارے جانے کے بعد ہم خدا کے در پر دستک دیتے ہیں۔ خدا ہمیشہ ہمارا سیکنڈ آپشن کیوں ہوتا ہے؟ ہماری اولین ترجیح ہمیشہ دنیا ہوتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ ہم اس پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ترتیب کے ردوبدل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتنی بڑی بھول ہے۔ ترتیب ہی تو اصل شے ہے۔ کون پہلے آتا ہے کون بعد میں۔ کھیل کا یہ بنیادی اصول ہی نظر انداز کر دیا تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ صرف بھگدڑ اور بدحواسی۔"

وہ اٹھ کر سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ سسٹر سوزین چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

ٹیلی فون کے ریسیور سے پھوٹتی آواز نے اسے پتھر کا بنا دیا تھا۔ کیا کسی آواز میں اتنی طاقت ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے بدن سے روح کھینچ لے۔ کم از کم اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔

"پرنیاں! بولو۔ اب بول پڑو اور کتنا انتظار کرواؤ گی؟ تم نے کبھی پلٹ کر دیکھا ہوتا! ایک بار تو میرا حال پوچھ لیا ہوتا۔" وینس رونے لگی تھی۔

وہ اس کی ذہنی اختراع نہیں تھی۔ وہ حقیقت میں وینس کی آواز تھی۔ اس میں بڑھاپے کا ضعف آگیا تھا پھر بھی اسے شناخت کرنے میں پرنیاں کو مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بے جان ہاتھ میں ریسیور تھامے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے اندر سینکڑوں آوازیں شور مچا رہی تھیں لیکن انہیں لفظوں میں کیسے ڈھالنا تھا۔ پرنیاں کو یہ ہنر بھول گیا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے گونگی ہو۔ پھر وہ آوازیں اس کی آنکھوں کے راستے باہر آنے لگیں۔

پہلا آنسو گرتے ہی ان پر چھایا ہوا جمود ٹوٹ گیا۔ اس کا وجود کسی زلزلے کی زد میں آگیا۔ وہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔

"امی! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میں آپ کو دکھ دے سکتی ہوں کیا؟ ... آپ جانتی ہیں مجھے۔ میں ایسی ہوں بھلا؟"

اس کا دل پگھل پگھل کے رسنے لگا تھا۔

"تم مجھ سے اتنی دور چلی گئیں۔ اتنا دور تو آخر تک بھی نہیں۔ ... کی قبر پر تو جا سکتی ہوں۔ وہاں رو سکتی ہوں۔ ... نے تو کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا۔ پرنیاں! تم نے مجھے اندھا کر دیا۔"

"میں نے ابو کو نہیں مارا۔ ان میں تو میری جان تھی۔ میں انہیں کیسے مار سکتی ہوں۔ آپ بتائیں امی! کیا میں انہیں مار سکتی ہوں؟"

وہ بے خودی میں ریسیور کے ساتھ یوں گال رگڑ رہی تھی جیسے اس کا چہرہ وینس کے چہرے سے مس ہو رہا ہو۔

"میں نے غصے میں کہہ دیا اور تم نے پلو میں گرہ دے لی۔ میری بس ایک بات یاد رہ گئی تمہیں؟ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ 'پرنیاں! تم خدا کا تحفہ ہو۔' میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری ہنسی اور تمہارے آنسوؤں کے سوا دنیا میں کسی شے کی حقیقت نہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ ان میں سے کوئی بھی بات تمہیں یاد نہیں رہ گئی؟ تم مجھ سے کیوں چھپ گئیں؟ کیوں اوجھل ہو گئیں؟"

وینس کا سانس چڑھا ہوا تھا جیسے وہ دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔

"میں آپ کو اپنی شکل کیسے دکھاتی؟ کیسے آپ کا سامنا کرتی؟ مجھ سے اتنی بڑی خطا ہو گئی۔ میں کیا کرتی امی!"

"وہ خطا تو میں نے معاف کی لیکن یہ غلطی میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا ظلم کیا۔ رات کے اندھیرے میں چھپ کر گھر سے چلی گئیں اور پھر کبھی میری خبر نہیں لی۔ جب میں نے آخری بار تمہیں دیکھا تو تم بیس سال کی تھیں۔ آج اکتالیس سال کی ہو۔ تم نے کبھی سوچا کہ درمیان کے اکیس سال میں نے کیسے گزارے ہوں گے۔ تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تاکہ میں رو رو کر ختم ہو جاؤں۔ اگر میں تمہیں تلاش نہ کرتی تو تم کبھی میرے پاس نہ آتیں۔ یہی نیت تھی نا تمہاری۔"

"نہیں امی! میں آپ سے دور رہ کر کتنی تکلیف میں رہی کیسے سمجھاؤں۔ مجھ پر جو گزر گئی۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ نہیں امی! میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی تھی لیکن ہو گیا۔ سب غلط ہو گیا۔"

وہ اور بھی شدت سے رونے لگی تھی۔ وینس کی ہچکیوں کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

پھر ریسیور کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

"کیسی ہو پرنیاں؟ میں داؤد بات کر رہا ہوں۔"

کیا آپ جانتے ہیں معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
Emale: id@khawateendigest.com

2011
لعل دیوتا کے پجاری
اسلم راہی
سحر زادی
سبطان راشد
فولاد
ایم اے راحت
مسٹر لومڑ
احمد صغیر صدیقی
پراسرار شکاری
ایم الیاس
خاموش رات
ایس ایم ہاشمی
درس گاہ
محسن علی
رنگ جنوں
ایم اے راحت
ستمبر 2011 کا شمارہ آج ہی خرید لیں
http://www.pakfunplace.com

ورنہ بھی بتاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کون تھا۔
"میں کیسی ہو سکتی ہوں۔"
"تو پوچھو گی نہیں کہ ہم تم تک کیسے پہنچے۔"
بھیگی آواز میں کیے گئے اس سوال پر اسے خیال آیا کہ یہ بات اب تک اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ شاید یہ بھی تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔
"تم خود ہی بتا دو۔" اس نے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"یہ عمر کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔"
اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ داؤد عمر کو کیسے جانتا تھا۔
"ایک خط جو تم نے لکھ کر پوسٹ نہیں کیا، وہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔" داؤد اسے تفصیل بتانے لگا۔
اس نے عمر سے کبھی یہ امید نہیں کی تھی کہ وہ اس کی خاطر اتنا تردد کرے گا۔ اس نے الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر کھینچا تھا۔ اور الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔ اس کے دل نے عمر کا احسان تسلیم کیا۔ وہ اپنی ماں سے بہتر تھا۔ وہ اپنی ذات سے آگے دیکھنے کی ہمت رکھتا تھا۔
وہ دیر تک ونیس اور داؤد سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اکیس سال کی کہانی کو ایک فون کال میں بیان کرنا چاہتے تھے۔ داؤد کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ چچا اور چاچی دونوں اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ گونی کے سر کے تمام بال سفید ہو گئے تھے۔ ونیس نے اسے گونی کی بے معنی آوازیں بھی سنوائیں۔ پھر داؤد بولا۔
"جب ہم دونوں کی شادی طے کی جا رہی تھی تب تم نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میں نے جواب میں جو کیا۔۔۔ سچ مانو تو اس میں میرا اتنا بھی قصور نہیں تھا۔ میں ایک رومان پسند، جوشیلا نوجوان ہی تو تھا۔ لیکن میں آج بھی اپنے رویے پر نادم ہوں۔ میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو سال ہاتھ سے پھسل گئے، انہیں تو میں واپس نہیں لا سکتا، البتہ میں کچھ ایسا کر سکتا ہوں کہ تمہارے دل پر بنے ہوئے سالوں کے نشان مٹ جائیں۔

میں تمہیں ایڈم گرانٹ سے ملواؤں گا۔"
ان کے بیچ خاموشی کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا۔ دوسرے سرے پر داؤد کو اس کے تنفس کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہ نام سن کر اس کا گم صم ہو جانا کچھ ایسا خلاف توقع بھی نہیں تھا۔ بالآخر پرنیاں کے حلق سے پھنسی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔
"میں اس سے مل کر کیا کروں گی؟ کوئی اور بات کرو داؤد!"
"وہ بیمار ہے، سچ تو یہ ہے کہ وہ مر رہا ہے۔ تمہیں آخری بار اس سے ضرور ملنا چاہیے۔"
"روزانہ لاکھوں لوگ مرتے ہیں۔ یہی قانون قدرت ہے۔ کسی کے مر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ نہ زمین پھٹتی ہے، نہ آسمان گرتا ہے۔"
"اس کی حالت افسوس ناک ہے۔"
"مجھ سے زیادہ افسوس ناک نہیں ہوگی۔"
"اسے ایڈز ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں، وہ کس اذیت سے دوچار ہے۔"
"داؤد! تم۔۔۔" وہ اٹک گئی۔ "پہلی بار کسی ایڈز پیشنٹ سے واسطہ پڑا ہے؟ کیا سارے ڈاکٹر تمہاری طرح جذباتی ہوتے ہیں؟ خیر جانے دو۔ تمہاری زندگی میں کیا چل رہا ہے؟"
"پرنیاں! میں تمہیں امریکہ بلوا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ پیپرز مجھے میل کرنا ہوں گے۔ میں کل سے ہی بھاگ دوڑ شروع کرتا ہوں۔ بس میری دعا ہے کہ گرانٹ کے مرنے سے پہلے تم یہاں آ جاؤ۔"
وہ ساری رات جاگتی رہی اور اٹھ اٹھ کر آسمان پر سپیدی کے آثار ڈھونڈتی رہی۔ مٹیالے سرمئی پروں والے کبوتر۔۔۔ سا آسمان تاریکی کا ایک ایک دانہ چگتا تھا۔ سیاہ دانوں کا انبار لگا تھا اور کبوتر کی چونچ میں ایک ہی دانہ سماتا تھا۔ اس انبار کا حجم گھٹنے میں ہی نہ آتا تھا۔
صبح کے انتظار سے عاجز آ کر وہ صحن میں ٹہلنے لگی۔
"میں جاؤں گی۔" وہ بڑبڑائی۔
"مجھے جانا ہی چاہیے۔ ایک بار تو اسے ویسے ہی ٹھوکر ماروں، جیسے اس نے مجھے ماری تھی۔ ایک بار تو

اسے اپنے مقابلے میں بے بس دیکھوں۔ ایک بار تو اس کی لاچاری پر قہقہہ لگا کر ہنسوں۔ اس کا ویسا ہی تماشا بناؤں جیسا اس نے مجھے دنیا کے سامنے بنایا تھا۔ اسے ایڑیاں رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھنا کیسا تجربہ ہوگا؟ اسے آخری چوٹ میرے ہاتھوں ہی لگنی چاہیے۔ کہیں اس سے پہلے وہ مر نہ جائے۔ میں نے اسے ہر روپ میں دیکھا ہے۔ لیکن کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ کسی فلم میں بھی نہیں۔ اسے روتے ہوئے دیکھنا کتنا ضروری ہے۔ میں نے اس بارے میں کبھی سوچا کیوں نہیں؟"
وہ چلتے چلتے تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس نے جونہی کمرے میں قدم رکھا گرانٹ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جھلملاہٹ تھی۔
"آؤ جلدی آؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ تم دوبارہ نہ آئے تو کیا ہوگا۔"
اس کا پلٹ نے عمر کو حیران کر دیا۔ "آپ ٹھیک ہیں؟ کل آپ کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔" اس نے بیڈ کے قریب رکھے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔
"میں ساری رات تمہارا نام پکارتا رہا۔ مجھے چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس لیے میں بار بار تمہارا نام لیتا رہا تاکہ مجھے بھولے نہیں۔ بڑا ہی خوب صورت نام ہے تمہارا۔ یہ اس نے رکھا ہے؟"
اس کی مراد یقیناً "پرنیاں" سے تھی۔
عمر خاموشی سے اس کی بدلی ہوئی کیفیت پر غور کرتا رہا۔
"اس نے تمہیں مجھ سے ملنے کو کہا ہے؟ کیا تم اسے ہماری ملاقات کے بارے میں بتا چکے ہو؟" امید اور اندیشوں میں گندھا لہجہ۔
جواب دینے سے قبل عمر چند لمحے سوچتا رہا۔
"نہیں۔ میں نے انہیں نہیں بتایا۔ آپ کہیں گے تو

میں۔۔۔"
"نہیں۔" اس نے جملہ قطع کیا۔ "اچھا ہے، اچھا ہے۔ اس کا لاعلم رہنا ہی اچھا ہے۔ اس کی نفرت سہنے کی طاقت نہیں ہے مجھ میں۔"
اس کی حرکت الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔
"اچھا تو تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟" اس کا جواب اجنبیت والا اور انداز اپنائیت بھرا تھا۔
کچھ دیر عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "میں آپ کی کہانی سننے آیا ہوں۔ آپ کی زندگی کہاں سے شروع ہوئی۔ میساچوسٹس میں آپ کا بچپن کیسا گزرا؟ آپ کے ماں باپ کون تھے؟ جو بھی آپ سنانا چاہیں۔"
اس کی بات نے گرانٹ پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ "ہاں ضرور۔ کیوں نہیں اس سے پہلے کیا تم مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو گے۔"
عمر نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا۔ ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اس نے گلاس لوٹا دیا اور بولا۔
"میرا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ مجھے اس کی شکل یاد نہیں آ رہی۔ کاش میرے پاس اس کی کوئی تصویر ہوتی تو میں تمہیں دکھا سکتا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ اس نے میرا نام احمد ابراہیم رکھا تھا۔ کتنا اچھا نام ہے؟"
اس نے عمر سے تائید چاہی۔
"پتا نہیں کیوں میں نے اسے بدل کر نیا نام اپنا لیا۔ میرا موجودہ نام یعنی ایڈم گرانٹ، یہ میں نے کسی مشہور فلمی اداکار سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ اس اداکار کا نام کیا تھا۔ بہرحال اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے نام میں گرانٹ آتا تھا۔۔۔۔۔ ہاں تو میں تمہیں اپنے باپ کے متعلق بتا رہا تھا اس کی موت بہت ہی اذیت ناک طریقے سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ مرا کیسے تھا؟ مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا ہے۔" وہ جھنجلا کر ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا۔
"مونا اسٹوکر ایک نن تھی۔ وہ مجھے پسند کرتی تھی حالانکہ میں اس سے چھوٹا تھا۔ میری عمر پندرہ سال

http://www.paktfunplace.com

کے قریب تھی۔ لیکن تھو... میں نے درست نہیں جانا۔ وہ نن نہیں تھی البتہ اسے نن بننے کی تمنا تھی۔ مجھے اختلاف تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ وہ رہبانیت اختیار کرے۔ پھر میں نے اس کا رستہ روک دیا۔ اسے خدا سے دور کر دیا۔ مگر میں نے ہمیشہ خدا کے قریب ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی ناراضی سے بچنا چاہا ہے۔ میں جب جوائنٹ (جیل) میں تھا تو ساری نمازیں باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ دعا مانگا کرتا تھا۔ وہاں یہ سب کرنا آسان نہیں تھا۔ کچھ قیدی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مجھے مذہبی جنونی کہا کرتے تھے۔ میں پروا نہیں کرتا تھا۔ خدا پھر بھی مجھ سے راضی نہیں ہوا۔"

وہ ناخن چباتے ہوئے دیوار کو گھورنے لگا۔

اس کے خیالات غیر مربوط تھے۔ وہ کہیں کا ٹکڑا اٹھا کر کہیں جوڑ دیتا تھا۔ اس کی الجھی ہوئی سوچوں سے جو نقش تشکیل پا رہے تھے 'وہ بے ڈھب اور مہمل تھے۔

عمر نے اسے ٹوکا نہیں۔ وہ چہرے پر اشتیاق اور آنکھوں میں تجسس بھرے اس کی لایعنی باتیں سنتا رہا اور اس دوران اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا۔ جیسے اس کی گردن تلے تکیے کی سلوٹوں کو نکالنا' اسے سوپ پلانا اور بستر پر اس کے سوجے ہوئے پیروں کی جگہ تبدیل کرنا۔

جب اس نے جانے کی اجازت طلب کی تو گرانٹ پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟"

عمر نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔ کیا وہ اتنی جلدی بھول گیا تھا؟

"ڈاکٹر داؤد نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں کون ہوں۔"

"ہاں! اس نے بے شک بتایا تھا مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

جواب دیتے ہوئے عمر کی آواز بکھری تھی۔ "میں آپ کا... بیٹا ہوں۔"

"شکریہ۔ شکریہ۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ بات کتنی خوش کن ہے۔" اس نے یوں تشکر کا اظہار کیا جیسے عمر نے اس پر کوئی عظیم احسان کیا ہو۔

"کیا میں تمہیں بیٹا کہہ سکتا ہوں؟"

"اگر آپ چاہیں تو... میں اعتراض نہیں کروں گا۔" عمر نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

گرانٹ نے اطمینان بھری سانس لی۔ "کل کتنے بجے آؤ گے؟"

"میں کوشش کروں گا۔"

"نہیں ایسا مت کہو۔ میں نے تو ابھی سے تمہارا انتظار شروع کر دیا ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔"

اگلی شام اسے ایک اسائنمنٹ تیار کرنا تھی جس کی وجہ سے وہ ہسپتال نہیں جا سکا۔ مزید دو دن پڑھائی کی مصروفیت نے اسے سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ وہ چاہ کر بھی گرانٹ سے ملنے کا وقت نہ نکال پایا۔ چوتھے دن جب وہ ہسپتال پہنچا تو اسے گرانٹ کا قہر جھیلنا پڑا۔

"تم اب بھی کیوں آئے ہو؟ میرے مرنے تک رک کیوں نہیں گئے؟ تم مجھ سے اپنی ماں کا بدلہ لے رہے ہو۔ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ میری بے بسی سے تم حظ اٹھاتے ہو۔"

وہ چیخ چیخ کر ادھ موا ہو گیا تھا۔

اس دن کے بعد عمر باناغہ ہسپتال آنے لگا۔ اسے جتنا بھی فارغ وقت میسر ہوتا وہ گرانٹ کے ساتھ گزار دیتا۔ عموماً اس کی آمد گرانٹ پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی تھی تاہم کبھی کبھار وہ اسے پہچاننے سے منکر ہو جاتا۔

"داؤد فرڈیننڈ یہ ہسپتال ہے کوئی عوامی تفریح گاہ نہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر دوڑا چلا آتا ہے۔ تم میرے کمرے میں اجنبیوں کو کیوں آنے دیتے ہو؟ یہ لڑکا کیوں آیا ہے؟ اسے جلدی بھگاؤ۔ میرے کمرے سے باہر نکال دو۔"

وہ ہنگامہ مچا دیتا۔ عمر بددل ہو کر لوٹ جاتا اور خود کو سمجھا بجھا کر اگلی شام پھر آ جاتا۔

ایک رات وہ گرانٹ کے کمرے سے متصل باتھ روم میں واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے کسی لڑکی کی آواز اس کی سماعت سے

ٹکرائی۔ وہ ایک نامانوس آواز تھی۔ وہ ہسپتال کے عملے کے ان افراد میں سے کسی کی آواز نہیں تھی جن سے اب عمر بخوبی واقف ہو چکا تھا اور اس کے کانوں میں اترنے والے الفاظ نے شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ وہ اسٹاف میں سے نہیں تھی۔

"تم ابھی تک زندہ ہو گرانٹ! یہ جان کر مجھے انتہا خوشی ہوئی ہے۔ تم بھی اتنے ہی خوش ہو گے جب میں تمہیں اپنے آنے کا مقصد بتاؤں گی۔ ڈاکٹر نے مجھے یقین دہانی کروا دی ہے کہ تمہارے کان بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ تمہاری سننے کی صلاحیت ہی میرے لیے سب سے اہم ہے۔ لیکن اگر تم آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو تو اس ملاقات کا لطف دوگنا ہو جائے۔ کیا تم نے ابھی تک یہ ہی نہیں سیکھا کہ آنکھیں بند کرنے سے سنائی دینا بند نہیں ہوتا۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی اور اس انداز میں گرانٹ سے کیوں مخاطب تھی؟ عمر نے نل بند کیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

"جس جہنم سے تم ساری زندگی مجھے ڈراتے رہے' اب خود وہاں جا رہے ہو تو کیسا لگ رہا ہے۔" وہ رک گیا۔ آنے والی یقیناً گرانٹ کو تنہا خیال کر کے اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ وہ شش و پنج میں گرفتار دروازے کی اوٹ میں ٹھہر گیا۔

"تم اس بات سے خوف کھاتے رہے کہ کہیں میں Prostitute نہ بن جاؤں۔ میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔ تمہاری پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ہو گئی ہے۔ میرے گندے خون نے مجھے کچھ اور بننے ہی نہیں دیا۔ آج میں اس کام کی ابتدا کرنے جا رہی ہوں اور آئندہ تمام زندگی میں اسی پیشے سے وابستہ رہنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہوں۔ آج پہلا دن ہے تو میں نے سوچا تم سے بڑھ کر اس خوش خبری پر کس کا حق ہے۔"

عمر نے کمرے میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ جس نوع کی باتیں کر رہی تھی اگر اسے علم ہو جاتا کہ گرانٹ کے سوا کوئی اور بھی اس کا سامع تھا تو اس کی خجالت کی کوئی حد نہ ہوتی۔ عمر سامنے آ کر اسے شرمسار نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی گفتگو نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"میں ایک جز وقتی ملازمت بھی کر رہی ہوں۔ اسی بار میں جہاں تم نے مجھے کام کرنے سے منع کیا تھا۔ تمہیں وہاں کا ناپاک ماحول پسند نہیں تھا۔ میں نے پچھلے ہفتے اپنی شفٹ کی تمام ویٹرسز سے زیادہ ٹپ اکٹھی کی پتا ہے کیوں؟ دراصل میں مرد گاہکوں کو بے تکلف ہونے سے کبھی نہیں روکتی۔ میرا ذرا سا التفات ان کی جیبوں کو مجھ پر کشادہ کر دیتا ہے۔ تصور کرو کہ جب میں کھل کر میدان میں اتروں گی تو کیسا طوفان اٹھاؤں گی۔ میری کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔"

گرانٹ اب تک کچھ نہ بولا تھا۔ شاید صدمے نے اس کے ہونٹوں پر قفل لگا دیے تھے۔ عمر کو کسی حد تک اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کون تھی۔ اس نے ایک قدم آگے آتے ہوئے احتیاط سے کمرے میں جھانکا۔ وہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ
خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا
750/-
کھانا خزانہ
250/-
800/-
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32216361

اس نے سرخ اور سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اسی مناسبت سے گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ گرانٹ پر نظریں مرتکز کیے زہر اگل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ وہ بے حد پرکشش تھی۔ اس کے حسین ہونے کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن یہ عمر کے ششدر ہونے کا باعث نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ اگر وہ خود اسے بولتے ہوئے نہ سن لیتا تو کبھی اعتبار نہ کرتا کہ وہ الفاظ اس کی زبان سے برآمد ہوئے تھے۔ وہ گویا لکھے ہوئے مکالمے کسی اناڑی اداکارہ کی طرح غلط تاثرات کے ساتھ ادا کر رہی تھی۔ وہ اتنا ہی حیران ہوا جتنا کوئی خرگوش کو غراتے دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ پلکیں جھپکائے بنا وہ اس عجیب امتزاج کو دیکھتا رہا۔

"کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے میں نے اب تک خود کو روکے رکھا۔ میری واہیات ماں اپنا اپارٹمنٹ تمہارے نام کر گئی۔ تم نے اس چیز کو میری کمزوری بنائے رکھا۔ میں تمہاری منشا کے خلاف چلتی تو تم مجھے بے دخل کر دیتے۔ اب یہ خطرہ ٹل چکا ہے۔ میں نے تمہارے اٹارنی سے مل کر اطمینان کر لیا ہے۔ وہ بھی تو مرد ہے۔ میری مسکراہٹ کا جواب بے رخی سے دینا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ تمہاری وصیت کے مطابق تمہاری موت کے بعد جو جلد ہی متوقع ہے' وہ اپارٹمنٹ مجھے مل جائے گا اور بالفرض محال اگر مرنے سے قبل تمہیں موقع مل جاتا ہے اور تم وصیت میں تبدیلی کر دیتے ہو تو تمہاری موجودہ دماغی حالت کو کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ میری طنابیں تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہیں۔ مجھے جانے کی اس قدر جلدی نہ ہوتی تو میں دیر تک تمہاری تکلیف کا تماشا دیکھتی۔ تم بتاؤ گے نہیں کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو۔"

گرانٹ کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

"میں وہ سب کرنے جا رہی ہوں جس سے مجھے روکتے روکتے تم پاگل پن کی سرحد پر آپہنچے ہو۔"

عمر کو وہ لڑکی پاگل لگ رہی تھی۔ "اگر وہ حسینہ" یہ سب کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو اس کے پاگل ہونے میں کیا شک تھا۔

"میں سڑکوں پر آوارہ گھوموں گی۔ گناہ میرا اوڑھنا بچھونا ہوگا۔ میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتی۔ تمہیں تخیل سے کام لینا زیادہ اچھا لگے گا۔"

وہ جانے کے لیے مڑی۔ پھر دروازے کے پاس ٹھہر گئی۔ "مجھے تم سے گلہ ہے گرانٹ! تمہیں اتنا تو بتانا چاہیے کہ آج مجھے کون روکے گا۔ تم یا تمہارا خدا۔ خیر یہ معاملہ تم خدا کے ساتھ طے کر لو۔"

عمر کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ اس لڑکی کے باہر نکلتے ہی وہ عجلت سے گرانٹ کے سرہانے پہنچا اور اسے پکارنے لگا تھا کہ آواز حلق میں دب گئی۔

وہ سو رہا تھا! صوفیہ مارسیلو بچپن سے اس کی مصاحبت میں رہی تھی۔ کیا وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ نیند میں اکثر گرانٹ کی آنکھیں نیم وا رہتی تھیں۔

اسے یقین تھا' وہ صوفیہ مارسیلو ہی تھی۔ داؤد اور گرانٹ کی زبانی وہ اس کے متعلق اتنا کچھ سن چکا تھا کہ اسے پہچان لینا دو جمع دو چار کرنے سے بڑھ کر سہل تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر گرانٹ کے خوابیدہ چہرے کو دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کاریڈور سنسان پڑا تھا۔ صوفیہ اسپتال سے نکل چکی ہوگی۔ اس نے اندازہ لگایا۔ وہ ایڈمن بلاک کی طرف رخ کر کے تیزی سے چلنے لگا۔ کاریڈور کے موڑ تک پہنچتے پہنچتے وہ تقریباً بھاگنے لگا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

انیسہ سلیم

"اتنی لوڈشیڈنگ کے بعد بھی یہ پانچ ہزار چھ سو کا بل کہاں سے بھریں گے تمہارے ابو۔ سن رہے ہو میری بات؟" رخشندہ نے اپنے بیٹے سے کہا جو موبائل میں مصروف تھا۔

"بجلی کٹوا دیں امی۔" شہباز نے پل بھر کو نظر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر اس کی نظریں اسکرین پر دوڑنے لگیں۔

"سوچ تو اب میں بھی یہی رہی ہوں' تم بتاؤ۔ بجلی نہیں ہوگی تو گزارا کر لو گے تم؟" شہباز کے اس بیان پر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

"اب بھی تو بجلی کے بغیر ہی آدھا دن اور آدھی رات گزرتی ہی ہے۔" وہ کوئی آنے والا میسج پڑھ کر مسکرایا تھا۔

"پانی بذریعہ ڈول نکالنا پڑے گا۔ ٹینک سے' نکال لو گے؟"

"یہ تو بڑا ہی رسکی آئٹم ہوگا۔" وہ اب جوابی میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

"ٹھنڈا پانی نہیں مل سکے گا پینے کو۔"

"اب کون سا مل جاتا ہے' ہر وقت تو لائٹ جاتی رہتی ہے' ہم مٹکا رکھ لیں گے گھر میں۔" شہباز نے ایک ہاتھ سے چٹکی بجاتے مسئلہ حل کر دیا تھا۔ ایک ہاتھ بدستور موبائل پر تھا۔

"پنکھا بھی نہیں چلے گا' سوچ لو۔" رخشندہ تو شاید سب ہی کچھ سوچے بیٹھی تھی۔

"چھت ہے نا۔۔۔ اور یہ بھی۔" اس نے برق رفتاری سے جواب ٹائپ کرتے ہوئے سامنے رکھا اخبار اٹھایا اور رخشندہ کو جھلا۔

"گوشت' مرغی' مچھلی کچھ بھی اسٹور نہیں ہو سکے گا۔"

"جب ضرورت ہوگی' میں لادوں گا۔" اس کا انگوٹھا تیزی سے کی پیڈ پر چل رہا تھا۔

"اور سبزیاں؟"

"وہ آپ روز کے روز ٹھیلے والے سے لے لیجیے گا۔" ٹوں ٹوں' ایک اور میسج آگیا تھا۔

"یہ ایک فریج' یہ جوسر' یہ ٹوسٹر' یہ الیکٹرک کیٹل' سینڈوچ میکر۔" رخشندہ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے بے کار ہو جانے والی اشیاء کے نام گنوا رہی تھیں۔

"اوہ امی۔۔۔ زندگی جتنی سادہ ہوگی' اتنی ہی

پرسکون۔۔۔ اور لگتا ہے چند سال بعد سب ہی کو بجلی کے بغیر رہنا پڑے گا۔ دور اندیشی تو یہ ہے کہ ہم ابھی سے بجلی کے بغیر رہنا سیکھ لیں۔"

میسج بھی ساتھ ساتھ ٹائپ ہوتا گیا تھا۔

"تمہاری پڑھائی کا حرج تو نہیں ہوگا؟" رخشندہ کو اس کی پڑھائی کی بہت فکر تھی۔

"میں دن میں پڑھ لوں گی۔" اس کی نظریں موبائل کا لکھا پڑھ رہی تھیں۔

"ڈور بیل بھی نہیں بج سکے گی۔"

"اب بھی تو لائٹ جانے پر دھڑ دھڑانا ہی پڑتا ہے دروازہ۔" موبائل اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے دروازے کو دیکھا۔

"شیک بن سکے گا نہ مسالے پس سکیں گے۔" رخشندہ اسے مزید آگاہی دے رہی تھی۔

"جب بل داخل نہ کروانا پڑے گا تو پانچ ہزار چھ سو بچ جائیں گے ہمارے تو شیک ہم باہر سے پی لیں گے اور مسالے پیکٹ کے آجائیں گے۔" شہباز اب اپنا ان بکس چیک کر رہا تھا۔

"کپڑے تو چلو ہاتھ سے دھل جائیں گے' استری کا مسئلہ ہوگا۔"

"میں تو جینز پہنتا ہی اسی لیے ہوں کہ استری نہ کرنا پڑے۔ آپ بھی دادی اماں کی طرح کپڑے تہ کرکے تکیے کے نیچے رکھ لیجیے گا۔ ہاں۔۔۔ ابو کے کپڑے ڈرائی کلین کروالیں گے۔ پیسے تو ہوں گے نا۔۔۔ بل نہ دینے کی وجہ سے۔"

آخری جملہ اس نے ذرا رخشندہ کی جانب جھک کر اسٹائل سے کہا تھا۔

"کوئی ہمارے گھر رات ٹھہرنے کے لیے نہیں آئے گا۔"

"اچھا ہے نا۔ رات جو پہلے ہی کالی ہوتی ہے اور کالی کیوں ہو۔" موبائل اب اس نے سامنے رکھ دیا تھا۔

"یہ مائیکرو ویو۔ سوچ لو۔ ختم ہو جائیں گے سب چونچلے۔" گھر میں وہ ہی سب سے زیادہ مائیکرو ویو استعمال کرتا تھا' اس لیے رخشندہ نے خاص طور سے اس سے پوچھا تھا۔

"ان الیکٹرونک مشینوں کی وجہ سے ہی تو کینسر اور ہیپاٹائٹس پھیل رہا ہے۔ پتا نہیں کیسی کیسی خطرناک شعاعیں کھانوں میں شامل ہو جاتی ہیں ان کی وجہ سے۔" بات کرکے اس نے موبائل اٹھالیا۔ ایک اور میسج آگیا تھا۔

"ٹی وی نہیں چلے گا بجلی نہیں ہوگی تو۔"

"موبائل میں آجاتا ہے اب سب کچھ۔" وہ موبائل ہی میں دیکھ رہا تھا۔

"اور نیٹ۔۔۔؟" رخشندہ نے پوچھا۔

"سب ہی کچھ ہے اس میں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو تھپتھپایا۔

"یعنی تمہیں کوئی اعتراض نہیں صبر سے رہ لوگے نا۔" رخشندہ نے ایک بار پھر اس سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔" "ٹی ٹی ٹوں۔" موبائل سے آواز آئی۔ اس کی چارجنگ ختم ہوگئی تھی۔

"ذرا چارجر اٹھائیے گا۔۔۔ لائٹ نہ چلی جائے۔" شہباز فکر مندی سے بولا۔

"بجلی نہیں ہوگی تو تمہارا موبائل بھی چارج نہیں ہو سکے گا۔" رخشندہ نے چارجر اس کی سمت بڑھایا۔

"پلیز۔۔۔ امی۔۔۔ بجلی مت کٹوائیے گا۔ ہم بجلی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔" شہباز نے پوزیشن بدلنے میں ایک پل بھی نہیں لگایا تھا۔

"واشنگ سے پانی نکالنا آسان تھوڑی ہے۔ میری پڑھائی ہی رات بارہ بجے کے بعد شروع ہوتی ہے' نیم پاگل ہو جاؤں گا میں۔ فریج نہیں ہوگی تو۔ گوشت' مرغی' مچھلی کی تو ایک طرح سے جان ہے۔ ابو ہی لاتے ہیں ہفتے بھر کا۔ اور آپ کی اتنی قیمتی الیکٹرونک مشینری۔۔۔ استعمال نہیں رہے گی تو جام ہو جائے گی۔۔۔ آپ ہاتھ سے کپڑے دھونے لگیں گی تو بیمار پڑ جائیں گی امی۔۔۔ پانچ ہزار چھ سو بچانے کے چکر میں چھ ہزار پانچ سو اور نہ لگ جائیں۔۔۔ پلیز امی! بجلی مت کٹوائیے گا۔۔۔"

☆

سیلاب

پانی پانی کے اک شور میں کتنی چیخیں ڈوب گئیں
پہلے کچھ آوازیں ابھریں، آخر سانسیں ڈوب گئیں

کون سدھائے بپھرا پانی، کون اسارے مٹی کو
دریاؤں پر پشتے باندھنے والی باہیں ڈوب گئیں

پانی کا عفریت اچھل کر شہ رگ تک آ پہنچا تھا
بچے جس پر بیٹھے تھے اس پیڑ کی شاخیں ڈوب گئیں

بستی میں کہرام مچا تھا، آدم روزی مانگے تھا
رازق رازق کہتے کہتے سب کی نبضیں ڈوب گئیں

پتھر کوٹنے والے ہاتھوں میں بچوں کے لاشے تھے
شہر کو جانے والی ساری کچی سڑکیں ڈوب گئیں

نیر جگ کی اونچ نیچ نے پانی کا رخ موڑ دیا
تیری مل تو وہیں کھڑی ہے، میری فصلیں ڈوب گئیں

شہزاد نیر

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

دیس پردیس کیا پرندوں کا
آب و دانہ ہی آشیانہ ہے

عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے

ندا فاضلی

سُنا ہے
جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سُنا ہے
شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ
حملہ نہیں کرتا
سُنا ہے ہوا کے تیز جھونکوں میں
مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوّے کے انڈوں کو پیروں میں
تھام لیتی ہے
سُنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
سُنا ہے سیلاب آجائے تو لکڑی کے تختے پر
سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
منصفو! میرے ملک میں بھی
اب جنگلوں کا ہی کوئی دستور لے آؤ
آج کل جو خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے
وہ ختم کرو
جنگل کا دستور لے آؤ

زہرہ نگاہ

کانچ کو خالص ہیرا سمجھے ساری بھول ہماری تھی
اک صحرا کو دریا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی

اک سرمستی کی خواہش میں موت سے ہم آغوش ہوئے
ہم زہراب کو صہبا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی

چارہ گر جانا قاتل کو، رہبر مانا رہزن کو
اک جھوٹے کو سچا سمجھا ساری بھول ہماری تھی

طفل تسلی دینے والا، جھوٹے وعدے کرنے والا
اُس کو قول کا پکا سمجھے، ساری بھول ہماری تھی

کتنی خوش فہمی تھی ہم کو اُن کی [illegible] کردانا
وہ کیا بولے ہم کیا سمجھے ساری بھول ہماری تھی

اور محسن [illegible] فاتح لوٹ کے محفل جانے والے
خود [illegible] یکتا سمجھے ساری بھول ہماری تھی

ظہور احمد فاتح

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا ابو امامہ (یعنی حارثی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
"جو شخص مسلمان کا حق مارے، قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا۔"
ایک شخص نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر وہ تھوڑی چیز ہو تو؟"
[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگرچہ پیلو کی ایک [illegible] ہی ہو۔"

(صحیح مسلم)

اچھی باتیں،

- جب کبھی تم کو اپنے رزق میں کمی نظر آنے لگے تو کچھ مال اللہ کی راہ میں دے کر "اللہ" کے ساتھ تجارت کر لیا کرو۔
(حضرت عمرؓ)
- لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام اس طرح بنا لو کہ مر جاؤ تو تمہارے لیے دعا کریں اور زندہ ہو تو تم سے ملنا پسند کریں۔
(حضرت علیؓ)
- ہر بلا و مصیبت کے پس منظر میں رحمت و نصیحت ہے۔
(حضرت امام حسینؓ)

صبا افضل بٹ۔ دینا الخورد

لیو ٹالسٹائی نے کہا،

ٹالسٹائی نے اپنے کتابچے "مذہب کی روشنی" میں لکھا
"اگر یہ کتاب القرآن دنیا کے سامنے موجود ہوتی اور کوئی مصلح یا پیغمبر نہ آیا ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ یہی کتاب انسانی ہدایات اور فلاح کے لیے کافی تھی۔"

فائقہ اکبر۔ ڈگری کالج گدو

غم،

غم عنایت ازلی ہے۔ یہ بڑے لوگوں کو ملا کرتا ہے۔ غم دل بنانے والا ایمرجنسی کیش ہے۔ غم کے اندر جو سمٹ گیا اور اطاعت میں چلا گیا، وہ فوری طور پر اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ غم میں پریشان نہ ہونا۔ غم میں گھبرانا نہیں بلکہ غم کو پہچانو، غم کو محسوس کرو۔ غم تقرب الٰہی ہے۔ یعنی غم اللہ کے قرب کا اعلیٰ مقام ہے۔

(واصف علی واصف)

فرمائش،

ہوائی جہاز میں پہلی مرتبہ سفر کرنے والے ایک صاحب کو الٹیاں آنے جا رہی تھیں۔ آخر ایئر ہوسٹس ان کے قریب آئی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔
"سر! میں آپ کے لیے کچھ لاؤں؟"
"ہاں۔" ان صاحب نے ہانپتے اور کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے لیے ایک ایئرپورٹ لے آؤ۔"

عجب طرح سے سوچا ہے،

- کبھی راکھ پر محل تعمیر ہو جاتے ہیں اور کبھی چٹانوں پر محض جھونپڑیاں بن پاتی ہیں۔
- انسان جب کبھی مشکل سے گزر کر آتا ہے تو اس کا مزاج بدل چکا ہوتا ہے۔
- ہر وا محبت کے آنگن کی ایک شق ہے۔
- ہر انسان کا ایک نہ ایک روپ آپ سے

http://www.pakfunplace.com

چھپا ہوا ضرور ہوتا ہے۔ ورنہ آپ کسی کے خاص رویے پر چونکتے نہیں
• جذبات، تصورات اور مفروضات کی دھند چھٹ جائے تو حقیقت کا اصل روپ نظر آتا ہے۔
• آپ اپنا کام کرتے جائیں، وقت آپ کے لیے دوستیاں اور محبت خود پیدا کرے گا۔

شبنم شمشاد۔ بزمان

ہری مرچیں،

• بچوں کی زندگی کے ابتدائی بارہ مہینوں میں والدین انہیں چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں اور

اگلے بارہ برس تک انہیں نچلا بیٹھنے اور خاموش رہنے کے لیے کہتے رہتے ہیں۔

(فائلس ڈلر)

• ہر چیز مضحکہ خیز ہے، جب تک وہ کسی اور کے ساتھ ہو۔ (ول راجرز)
• کیا آپ نے غور فرمایا۔ جتنے لوگ اسقاط حمل کے حامی ہیں وہ خود تو پیدا ہو چکے ہیں۔

(بینی ہل)

• زندگی کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ جیتے جی اس سے نجات نہیں پا سکتے۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

مصائب،

• مصائب گناہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور گناہگار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مصیبتوں کے نزول کے وقت واویلا کرے۔

(امام ابوحنیفہؒ)

شکم سیری،

ایک دفعہ ابلیس حضرت یحییٰؑ کے سامنے ظاہر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے پاس ہر قسم کے لشکن ہیں۔ پوچھا کہ ابلیس یہ لشکن کیسے ہیں؟"

وہ کہنے لگا۔ "یہ دنیا کی لذتیں ہیں جن میں میں فرزند آدم کو مبتلا کرتا ہوں۔"

حضرت یحییٰؑ نے پوچھا۔ "اس میں میرے لیے بھی کچھ ہے؟"

بولا۔ "جب آپ شکم سیر ہوتے ہیں تو نماز کا پڑھنا آپ پر گراں کر دیتا ہوں اور ذکر الٰہی آپ پر بار ہو جاتا ہے۔"

حضرت یحییٰؑ نے کہا۔ "خدا کی قسم میں اب ہرگز پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاؤں گا۔"

مہوش سوداگر۔ گوجرانوالہ

ہر مصیبت کا علاج،

تین افراد حسین بن علیؓ کے پاس آئے۔ ایک نے بارش کی قلت کی شکایت کی کہ کافی عرصے سے بارش نہیں ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔

"کثرت سے توبہ و استغفار کرو۔"

دوسرے نے کہا۔ "میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ میں اولاد کا خواہش مند ہوں۔"

فرمایا۔ "کثرت سے استغفار کرو۔"

تیسرے شخص نے شکوہ کیا۔ "زمین میں قحط پڑ گیا۔ غلہ پیدا نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے۔" اس پر بھی فرمایا۔

"کثرت سے استغفار کرو۔"

آپ کے پاس جو لوگ بیٹھے تھے، عرض گزار ہوئے۔

"نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! تینوں افراد مختلف شکایات لے کر آئے مگر آپ نے ایک ہی جواب دیا۔" فرمایا۔

"کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں پڑھا ہے۔

اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا۔ تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ (نوح۔ 10۔ 12)

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ایک حکایت،

کہا گیا ہے کہ ایک بڑھیا نے بھیڑیے کا ایک چھوٹا بچہ پکڑا اور اسے بکری کے دودھ سے پالنے لگی۔ بچہ جب بڑا ہو گیا تو اس نے بڑھیا کی بکری کو مار ڈالا۔ بڑھیا یہ اشعار پڑھنے لگی۔

"تو نے میری ننھی بکری کو مار ڈالا اور میرے دل کو تکلیف پہنچائی جبکہ تو میری ہی بکری کا پرورش کیا ہوا ہے۔ تجھے اس کے دودھ سے غذا دی گئی

اور تو نے اس سے غداری کی۔ تجھے کس نے بتایا کہ تیرا باپ بھیڑیا تھا۔ جب طبیعت اور فطرت ہی بری ہوتی ہے تو نہ ادب فائدہ مند ہوتا ہے نہ ادب سکھانے والا۔

حنا اسلم۔ ٹنڈو جان محمد

حقیقتا

ہمارے ایک دوست ایک دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ انگریزی سے والہانہ محبت کے باوجود بدقسمتی سے اس زبان سے متعارف ہونے کی سعادت سے محروم ہیں مگر مجال ہے کہ اپنی یہ محرومی کسی پر ظاہر ہونے دیں۔ چنانچہ جب کوئی انگریزی میں درخواست لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے تو وہ درخواست ہاتھ میں پکڑتے ہیں۔ عینک لگاتے ہیں اور پانچ دس منٹ تک پوری توجہ سے اس کے نفس مضمون پر غور کرتے ہیں۔ بالآخر وہ درخواست میز پر رکھتے ہیں۔ عینک اتارتے ہیں اور میز پر کہنیاں ٹکا کر درخواست گزار سے کہتے ہیں۔

"درخواست میں نے پڑھ لی ہے اب مختصراً مجھے یہ بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟"

(عطاء الحق قاسمی۔ تجاہل کا ملانہ سے)

ذکیہ غفار۔ اوچ شریف

ناقابل یقین،

1956ء میں ایک بحری جہاز غالباً تیل لے کر سمندر میں جا رہا تھا کہ کسی چٹان سے ٹکرایا اور ڈوب گیا۔ تاہم عملے کو بچا لیا گیا۔ جب تفتیش شروع ہوئی کہ حادثہ کیسے پیش آیا تو کپتان نے بتایا۔

"میں جہاز چلا رہا تھا کہ اچانک بارش کے ساتھ ایک بھینس گری اور جہاز ڈوب گیا۔ آسمان پر بادل دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔" تفتیش کرنے والوں نے سرزنش کی اور بار بار پوچھا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا کہ "نہیں ایسا ہی ہوا تھا۔"

انہوں نے ماہر نفسیات کے سامنے اسے پیش کیا۔ انہوں نے بہت سر کھپانے کے بعد فیصلہ دیا کہ کپتان جھوٹا ہی نہیں پاگل بھی ہے۔ کپتان کو پاگل خانے بھیج دیا گیا جہاں وہ سچ مچ پاگل ہو گیا۔

کافی عرصے بعد ایک پائلٹ نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ ایک واقعہ اس نے لکھا کہ ایک جنگل میں آگ لگ گئی۔ اور کنٹرول نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ ایئر فورس سے مدد لی گئی۔ ان کے پاس ایسے جہاز تھے جو قریبی جھیل یا دریا میں سے پانی اٹھا کر جنگل میں ڈال سکتے تھے۔ اس پائلٹ نے ایک جھیل سے پانی اٹھایا اور جنگل کی آگ پر چھوڑ دیا۔ ایک بار اسے لگا کہ پانی حرکت کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے جہاز کا توازن بگڑ رہا ہے۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں جنگل میں پہنچنے سے پہلے جہاز گر نہ جائے۔ اس نے پانی وہیں چھوڑ دیا۔ پائلٹ نے لکھا کہ جھیل کے پانی کے ساتھ ایک بھینس آ گئی تھی جو اچھل مچا رہی تھی۔ اسے نہ گراتا تو جہاز گر جاتا۔

یہی وہ بھینس تھی جو 1956ء میں حادثے کا شکار ہونے والے بحری جہاز پر گری تھی اور یہی وہ بارش تھی جو دور دور تک بادلوں کا نشان نہ ہونے پر بحری جہاز پر ہوئی۔

بحری جہاز کا کپتان پاگل خانے میں پاگل ہو کر مر گیا... نہ وہ جھوٹ بول رہا تھا نہ وہ پاگل تھا۔

عائشہ اسلام۔ کراچی

http://www.pakfunplace.com

خواتین کی ڈائری

امت الصبور

کرن شبیر کی ڈائری سے

انسانی زندگی غم و الم، سوز و گداز سے عبارت ہے۔ ناصر کاظمی کی آواز میں بھی سوز بھی غم نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں ایسی اثر انگیزی اور سحر آفرینی ہے جو ایک نامانوس سی خوشبو سے ذہن کو مہکا دیتی ہے۔

پھر لہو بول رہا ہے دل میں
دم بہ دم کوئی صدا ہے دل میں

تاب لائیں گے نہ سننے والے
آج وہ نغمہ چھڑا ہے دل میں

چشم تر ہی نہیں محوِ تسبیح
خوں بھی سرگرم دعا ہے دل میں

کہیں چہرہ، کہیں آنکھیں، کہیں ہونٹ
ایک صنم خانہ کھلا ہے دل میں

اسے ڈھونڈو وہ کہیں بھی نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں، یا ہے دل میں

کوئی دیکھے تو دکھاؤں ناصر
وسعتِ ارض و سما ہے دل میں

شازیہ ملک کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر جاوید اختر کی یہ نظم آپ سب قارئین بہنوں کی نذر۔

میں بھول جاؤں تمہیں
اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے، کیا کہوں

کم بخت
بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں
وہ اک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ اک بات
جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

عروسہ شہوار کی ڈائری سے

زندگی کا سفر مسلسل اداسی سے لپٹا ہو تو۔ تھکا دیتا ہے اور جب کوئی اپنا دور ہو تو اداسی سوا ہو جاتی ہے۔ اداسی کے رنگ لیے ہوئے احمد فراز کی یہ غزل

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
ترے گلاب سے چہرے پہ زر اداسی کا

میرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہربان میرے
کہ تو علاج نہیں ہے مری ہر اداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا ہے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اداسی کا

صبا افضل بٹ کی ڈائری سے

خواب گھروندے ٹوٹتے ہیں تو خواب یوں بکھرتے ہیں کہ ان کو سمیٹنا بس میں نہیں رہتا مگر پھر بھی لڑکیاں ہنرمندی کے ساتھ اپنے دکھوں کو اپنے دلوں میں چھپا کر ہنستی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کے دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں اور سکھ بھی عجیب۔
سلمان قیصر کی یہ خوبصورت نظم لڑکیوں کے جذبات کی ترجمان ہے۔

ہنستے ہنستے رو پڑتی تھی
کتنی پاگل وہ لڑکی تھی
اُس کے ہونٹ تو چپ رہتے تھے
آنکھوں سے باتیں کرتی تھی

چھت پر دھوپ میں بیٹھے بیٹھے
دن بھر وہ سپنے بنتی تھی
الجھی یادیں سلجھانے میں
ساری رات گنوا دیتی تھی

کتنا ٹھہراؤ اس میں
لیکن وہ کتنی گہری تھی
اک دن چلتے چلتے اس نے
مجھ سے کوئی بات کہی تھی

اور پھر رستہ ایک نہیں تھا
اُس کی منزل اور کوئی تھی
بالکل ویسے پھول کھلے ہیں
جیسے وہ ہنستی رہتی تھی

اب بھول گیا ہوں شاید
اس پر ایک غزل لکھی تھی

تبسم شمشاد کی ڈائری سے

اگست کا مہینہ ہم پاکستانیوں کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس مہینے ہم نے اپنا پیارا وطن پاکستان حاصل کیا۔ امجد اسلام امجد کی یہ نظم اس بچے کے نام جس نے پوچھا "ماں! پاکستان کتنی دور ہے؟" اور وہ پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی ہندوؤں کے ظلم کا شکار ہو گیا۔

وہ دن

چھیاسٹھ سال پہلے ایک دن ایسا بھی آیا تھا
جب اک سورج نکلنے پر
چمکتی دھوپ پھیلی تھی تو منظر جگمگایا تھا
اگرچہ میں نے وہ منظر بچشم خود نہیں دیکھا
مگر جب یاد کرتا ہوں تو سانسیں گنگناتی ہیں
کئی صدیوں سے صحرا میں بکھرتی ریت کی صورت
کروڑوں لوگ تھے جن کا
نہ کوئی نام لیتا تھا نہ کچھ پہچان تھی باقی
ہر اک رستے میں وحشت تھی
ہر اک آنکھوں میں حسرت تھی
نہ آباء کی ہنرمندی نہ اگلی شان تھی باقی
کھلا سر پر جو اس اعلان کا خوشبو بھرا سایہ
ہلالی سبز پرچم کا وہ ٹھنڈا دلربا سایہ
تو ان کی جاں میں جاں آئی

لہو میں روشنی جاگی، دہن میں پھر زباں آئی
چھیاسٹھ سال پہلے کا وہ اک احسان، مت بھولو
خدا کی خاص رحمت ہے یہ پاکستان، مت بھولو

http://www.pakfunplace.com

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

گُل نازش ———— لاہور

تو کسی طرح سے یہ احساں مگر اتارے گا
عطا کرے گا جو دستار، سر اتارے گا
نہ مانگ ایک بھی لمحہ خوشی کا دُنیا سے
یہ قرض وہ ہے جسے عمر بھر اتارے گا

راحت امتیاز ———— کھروڑپکا

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں
میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے
تو جو چاہے تو ترے واسطے دریا رولوں

صدف جلال ———— مورو سندھ

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

عزیزہ وسیم ———— ساہیوال

عرضِ غم کبھی اُس کے روبرو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے گفتگو بھی ہو جائے
زخم ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتے ہیں دل رفو بھی ہو جائے

ملائکہ کوثر ———— بسم اللہ پور

اُس کی بات بات کا غم
ایک ساری کائنات کا غم
لاکھ رنجش ہو پھر بھی ہوتا ہے
دل کو ترکِ تعلقات کا غم

ستیدہ ثوبیہ سجاد ———— کھروڑپکا

وہ جو نکلا نہیں تو بھٹکتے رہے ہیں مسافر کئی
اور لٹتے رہے ہیں کئی قافلے چاند کو کیا خبر

زینت عمر ———— گاؤں لاکھوڑی

اُس آخری نظر میں عجب درد تھا
اُس کے جانے کا رنج مجھے عمر بھر رہا

ثمرہ، اقراء ———— کراچی

سرِ صحرا مسافر کو ستارہ یاد رہتا ہے
میں چلتا ہوں مجھے چہرہ تمہارا یاد رہتا ہے
بہت سے ہیں دلوں کو پکڑا ڈوبنے والوں کے ہاتھوں نے
یہی بس ایک دریا کا نظارہ یاد رہتا ہے

عائشہ، تحریم ———— گوجرہ

وہ جنگل کے پھولوں پر کیوں مرتا ہے
اُس کو اچھے لگتے ہیں ویرانے کیوں
محسن جب بھی چوٹ نئی کھا لیتا ہوں
دل کو یاد آتے ہیں یار پرانے کیوں

ثوبیہ ربانی ———— قاضیاں محلہ بالا

پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدو مرجان

تیرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہیں تیرا انتظار کرتے ہوئے
مجھے خبر ہی نہیں ہے کہ وقت لوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

سدرہ وزیر ———— خوشاب (چیل)

بچھڑ کے ملنے لگیں تو اُس شخص سے کم کم ملنا
ایسے موسم میں ہی محبت پہ زوال آتا ہے

فوزیہ ربانی ———— گجرات

جب زندگی ہے اک کڑی دھوپ کا سفر
پھر برگدوں کی چھاؤں میں کیا ڈھونڈتے ہو تم
جتنے حسین چہرے تھے شہروں میں بس گئے
اب اُداس گاؤں میں کیا ڈھونڈتے ہو تم

امینہ وہاب ———— گھارو

میں خاندان کے سر پر ہوں بادلوں کی مثال
سو بجلیوں کی طرح خاندان سر پر ہے
جلا کے خاک ہی کر دے یہ چیختا سورج
مگر دعاؤں کا اک سائبان سر پر ہے

امامہ حبیب ———— عبدالحکیم

نہ ہونا بے مروت نہ بے رُخی دکھانا
بس سادگی سے کہنا تم بوجھ بن گئے ہو

عظمیٰ، نادیہ ———— کراچی

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدو مرجان

جو آ نا چاہو تو ہزار راستے، نہ آ نا چاہو تو عذر ہزار
مزاج برہم، طویل راستہ، برستی بارش، خراب موسم

فوزیہ ربانی ———— اسلام آباد

بے صدا مکانوں سے مجھ کو خوف آتا ہے
جب طیور ہیتے ہیں، پیٹر چھپاتا ہے
بوجھ ہیں جو دھرتی کا خوب سوچ لیں شبنم
بے سبب نہیں آتا، زلزلہ جب آتا ہے

ندا کاشان ———— لاہور

آئینہ دشمن صورت کی طرح سامنے ہے
وہم اک زندہ حقیقت کی طرح سامنے ہے
کل جو ہو گا، وہ سمجھنا کوئی دشوار نہیں
آج جو کچھ ہے، علامت کی طرح سامنے ہے

عندلیب امجد ———— اٹک

خود نماؤں میں گھر گیا ہوں میں
کن خداؤں میں گھر گیا ہوں میں
کوئی پہچانتا نہیں مجھ کو
آشناؤں میں گھر گیا ہوں میں

شازیہ اسلم ———— ہری پور

مجھے آ کے مُلے کوئی ہمسفر ہی یونہی رات بھر بڑی دیر تک
مجھے روشنی میں سمٹ سکا یونہی رات بھر بڑی دیر تک
یہ بھی ہوا کہ ہے عجب سماں کبھی خود پسند کبھی خود نما
کسی بے قرار کو نہ مل سکا کوئی چارہ گر بڑی دیر تک

شمائلہ عنایت چغتائی ———— لڈن ٹاؤن

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں
بھول جاتے ہیں مت برا کہنا
لوگ پتلے خطا کے ہوتے ہیں

شاہدہ شبیر رانا ———— رحمان گڑھ

طلسمِ عشق تھا سب، اُس کے ساتھ ہونے تک
خیال درد نہ آیا نجات ہونے تک
وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی
میں اپنی جیت سمجھتا تھا مات ہونے تک

اُم عمیرہ ———— نوشیہ گلباز

آج پھر بجھ گئے جل جل کے امیدوں کے چراغ
آج پھر تاروں بھری رات نے دم توڑ دیا
ہائے آدابِ محبت کے تقاضے ساغر
لب ہلے اور شکایات نے دم توڑ دیا

ثمرہ، اقراء ———— کراچی

کنارہ کھینچ لے گا اپنی جانب
کہا تو ہے کہ دریا پار مت کر
محبت تیرا میرا مسئلہ ہے
زمانے کو شریک کار مت کر

پارس ———— ڈگری کالج ڈہرکی

شیشہ کیا ہے، پتھر پانی ہو جاتا ہے
قائم رہنے والا فانی ہو جاتا ہے
مرتے انسانوں کا قصہ پڑھنے والا
آخر خود بھی ایک کہانی ہو جاتا ہے

اعتذار

بہن رفعت ناہید سجاد کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر "چراغ آخر شب" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ ان کے ناول کی قسط شاملِ اشاعت نہیں آئندہ ان شاء اللہ بہنیں قسط پڑھ سکیں گی۔

http://www.pakfunplace.com

خبریں و خبریا

غزل ثوبان

یہ عالم خوشی کا

برصغیر پاک و ہند میں موروثی سیاست کے ساتھ ساتھ فلم انڈسٹری میں بھی یہ روایت بھی مستحکم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اورنگ زیب' گلوکار عالمگیر کے "ہونہار بروا" (ہونہار پوت) ہیں جو "ازی" کے نام سے زیادہ پکارے جاتے ہیں۔ ازی نے ورجینیا کی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔ اپنے والد کی طرف سے موسیقی ان کے خون میں شامل ہے اور آپ جلد یا بدیر انہیں پرفارم کرتا دیکھ سکیں گے۔

ازی کی پیدائش کو عالمگیر اپنی زندگی کا سب سے خوش کن لمحہ قرار دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں۔

"اس وقت میں کراچی کے ایک معروف فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقدہ ایک بہت بڑے شو میں پرفارم کررہا تھا۔ لوگ بہت شوق سے سن رہے تھے۔ ان کا ذوق و شوق دیکھ کر میں بھی جھوم رہا تھا۔ گویا محفل اپنے عروج پر تھی۔ اچانک میں نے ایک ویٹر کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ میرے بالکل قریب آگیا۔ میں سمجھا وہ کسی گانے کی فرمائش کے لیے آیا ہے۔ میں اس کی بات سننے کے لیے اس کی طرف جھکا تو اس نے مجھے بتایا کہ "آپ کے گھر سے فون آیا ہے' آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔" عالمگیر کہتے ہیں کہ "یہ سننا تھا کہ میں خوشی سے بے قابو ہوگیا۔ میں نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں مائیک پر اعلان کیا کہ "میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ آپ مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہی میں خوشی سے اچھلتا کودتا اسٹیج سے اتر گیا۔ مجمع میں سے مبارک باد کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں مگر اس وقت کسے ہوش تھا کہ شکریہ ادا کرتا۔ میں تیزی سے بھاگتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا۔ وہاں ایک ٹیکسی جارہی تھی۔ میں نے فورا" اسے ہاتھ دیا اور اس میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گیا۔ ازی کو دیکھنے اور اسے پیار کرلینے کے بعد میں تھوڑا سکون ہوا۔ گھر واپسی کے لیے اسپتال سے باہر آیا تو پارکنگ میں اپنی گاڑی تلاش کرنے لگا۔ نہ ملی تو گارڈ سے معلوم کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "آپ تو ٹیکسی میں آئے تھے۔" اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں اپنی گاڑی تو ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں چھوڑ آیا ہوں۔ بعد میں جاکر میں نے گاڑی لی۔

اس "بے قابو خوشی" کی وجہ بتاتے ہوئے عالمگیر نے کہنا کہ "ازی سے پہلے میرا ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جو صرف چند روز ہی زندہ رہ سکا تھا پھر اس کے بعد کافی عرصے تک ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لہٰذا جب کافی منتوں مرادوں اور انتظار کے بعد ازی پیدا ہوا تو میں بے تحاشا خوشی کے عالم میں سب کچھ بھول گیا مجھ پر صرف یہ ہی دھن سوار تھی کہ بس جلدی سے اپنے بیٹے کو دیکھ لوں۔"

اس اطلاع کے بعد کہ اورنگ زیب گلوکاری کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں' شائقین موسیقی اور خاص طور پر عالمگیر کے پرستاروں کو انہیں پرفارم کرتا

دیکھنے کا شدید انتظار ہوگا۔

خود کو جو خدا سمجھیں

بے تحاشا خوشی ہو یا غصہ' انسان عجیب و غریب حرکتیں کر ہی بیٹھتا ہے۔ خوشی میں تو خیر خاصی دلچسپ حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں' جنہیں بعد میں یاد کرکے انسان محظوظ ہوتا ہے' لیکن ٹینشن اور غصے میں بعض وقت اس کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو دوسروں کا دل دکھا دیتی ہیں۔ جیسے ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا یہ واقعہ ہمیں کچھ ایسا ہی احساس دلاتا ہے۔

چند سال قبل ایک نجی چینل کا ایک ڈرامہ شوٹ ہورہا تھا۔ ان دنوں موسم بے حد گرم تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر شوٹ رکھی گئی تھی۔ منظر کچھ یوں تھا کہ معروف اداکارہ روبینہ اشرف کو ایک صندوق لیے ٹرین سے اتر کر ایک رکشے میں بیٹھنا تھا۔ جب سین شروع کیا گیا تو پتا چلا کہ معاون ہدایت کار صندوق لانا بھول گیا ہے۔ چونکہ اس سے قبل اس صندوق کے ساتھ ریکارڈنگ ہوچکی تھی۔ لہٰذا اسی صندوق کی موجودگی ضروری تھی۔ جب روبینہ کو پتا چلا تو موسم کی ساری شدت ان کے مزاج میں در آئی۔ شائستہ اور دھیمے مزاج کی حامل نظر آنے والی روبینہ نے اسے وہ بے نقط سنائیں اور ایسی بے عزتی کی کہ وہ بے چارہ مرد ہو کر بھی رو پڑا اور اسی وقت دل برداشتہ ہو کر ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اگلے دن نیا اسسٹنٹ تلاش کرکے شوٹنگ کی گئی۔

غالبا" اسی لیے ہمارے مذہب میں غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ روبینہ جی! آپ تو شاید یہ بات بھول گئی ہوں گی۔

توبہ تمہارے یہ نخرے

کسی "فلمی ہیروئن" کا نام سنتے ہی ذہن میں فورا" نخرے دکھاتی کسی خوب صورت سی لڑکی کا تصور ابھرتا ہے گویا فلمی ہیروئن اور نخرے لازم و ملزوم ہیں' لیکن جناب یہ ماضی بعید کی بات تھی کہ جب نخرے اور ادائیں صرف فلمی ہیروئنوں تک ہی محدود تھے۔ اب تو "چھوٹی اسکرین" کی ہیروئن کے بھی "بڑے" نخرے ہوگئے ہیں۔ عائشہ عمر ہی کو دیکھ لیجیے۔

http://www.pakunplace.com

رمضان المبارک کے مہینے میں عائشہ ایک ٹی وی ڈرامے کی ریکارڈنگ میں مصروف تھیں۔ اب کام کا دباؤ تھا' سخت گرمی یا کوئی اور وجہ عائشہ نے روزہ نہیں رکھا۔ اس کے باوجود وہ سیٹ پر خاصی دیر سے تشریف لائیں اور آتے ہی پانی طلب کیا۔ ان کے لیے منرل واٹر کی بوتل کا انتظام پہلے سے کرلیا گیا تھا' مگر پانی کی بوتل دیکھتے ہی عائشہ آگ بگولہ ہوگئیں کہ "اتنا گرم پانی پیوں گی؟ ٹھنڈا پانی لاؤ۔" حکم ملنے کی دیر تھی کہ فوراً "ٹھنڈے پانی کی تلاش میں کچھ لوگ دوڑا دیے گئے۔ چونکہ رمضان کی وجہ سے دکانیں بند تھیں لہٰذا پانی کی دستیابی میں مشکلات کا سامنا تھا۔ پانی آنے تک عائشہ نے شوٹ کرانے سے انکار کردیا۔ پانی کے انتظار کی کوفت مٹانے کے لیے وہ اس دوران عملے کو سخت سست سناتی رہیں۔ کافی تلاش بسیار کے بعد "ٹھنڈا پانی" آیا اور ان کے مزاج کی گرمی بھی ختم ہوگئی۔ پیاس بجھی تو تھوڑی دیر بعد عائشہ کو بھوک ستانے لگی اور عائشہ نے پھر عملے کو ستایا۔ یوں نچلا عملہ بے چارہ ایک بار پھر بھاگ دوڑ میں مصروف ہوگیا۔ کھانا دیکھ کر بھی انہوں نے وہی کچھ کیا جو پانی کی دفعہ کرچکی تھیں۔ ہاتھ پیر جوڑ کر انہیں کھانا کھلایا گیا۔ افطار کا وقت ہوا تو سارے دن کی "بھوکی پیاسی" عائشہ روزہ داروں سے بھی پہلے افطاری پر موجود تھیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں کہ

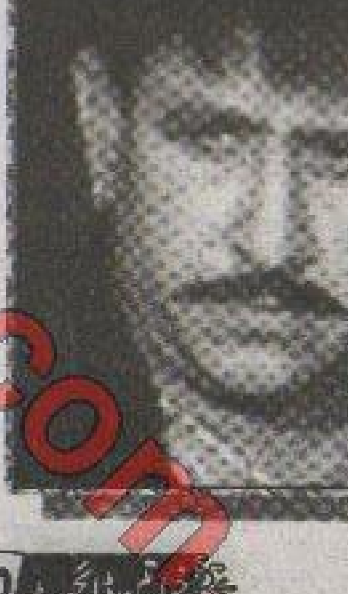

روزہ داروں کو تو روزے نے صبر اور حوصلہ دیا ہوگا۔ مگر عائشہ بے چاری تو سارا دن "گلوبیں" ہی بھوکی پیاسی رہی تھیں نا۔

اکثر لوگ کسی نہ کسی وجہ سے روزے نہیں رکھتے۔ ہمیں ان کے روزہ نہ رکھنے پر اعتراض نہیں کہ یہ خدا اور بندے کا براہ راست معاملہ ہوتا ہے۔ مگر ماہ رمضان اور روزہ داروں کا احترام لازم ہے۔

زہریلا

معروف اداکار شفقت چیمہ کو کون نہیں جانتا۔ یہ بات ہے ان دنوں کی جب وہ ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔ فلم کے پروڈیوسر اور ہدایت کار عمر شریف تھے۔ شفقت چیمہ کے کردار کا نام "زہریلا" تھا۔ جو ہر وقت خطرناک سانپوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے عمر شریف نے دو سو سانپ منگوائے۔ سپیرا بوریوں میں بھر کر سانپ لے آیا۔ اس نے جیسے ہی شفقت چیمہ کے سر پر دونوں بوریاں الٹیں۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اندھیرا ہوتے ہی سب لوگ سانپوں سے خوف زدہ ہوکر سیٹ سے بھاگ کھڑے ہوئے' تاہم وہ سپیرا اور شفقت چیمہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ لائٹ آنے کے بعد سب لوگ واپس آئے۔ مگر اس دوران چند سانپ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر چھپ گئے تھے' لہٰذا ان سانپوں کی تلاش شروع ہوئی۔ تیرہ سانپ تو گرفتار ہوگئے مگر دو سانپ آج تک مفرور ہیں۔ ہر جگہ تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں نہ ملے۔ شفقت چیمہ کا کہنا ہے کہ اس واقعے کے بعد سے سب لوگ ایک خوف کے عالم میں ریکارڈنگ کرتے رہے۔ کہیں کوئی ہلکی سی بھی سرسراہٹ سنائی دے جاتی تو سیٹ پر ایک بھگدڑ مچ جاتی۔

آپ لوگوں نے اسٹوڈیو کا کونا کونا تو چھان مارا' تاہم بہتر ہوتا کہ سب کی آستینیں بھی چیک کرلیتے کہ فی زمانہ سانپ اکثر آستینوں ہی میں بسیرا ڈالتے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی "دو" سانپ تھے اور آستینیں بھی "دو" ہی

ہوتی ہیں جناب!

یہ بیان کالمانہ

☆ افغان تنہا تھے۔ باقی ساری دنیا یا تو ان کے در پے تھی یا کچھ حصہ غیر جانب دار تھا۔ 100 ممالک کی فوج نے ان پر یلغار کی۔ امریکہ نے تیسری جنگ عظیم کے لیے جو اسلحہ چھپا کر رکھا تھا۔ وہ بھی افغانوں پر استعمال کیا۔ افغان سرزمین پر بارود کی ایسی بارش ہوئی کہ حساب و خواب سے باہر۔ اور پاکستان بھی ان کے خلاف صف آرا ہوگیا۔ لیکن افغانوں نے تن تنہا یہ جنگ جیتی۔

(عبداللہ طارق سہیل۔۔۔ وغیرہ وغیرہ)

☆ جب لاقانونیت' کھلی دہشت گردی' سرعام قتل و غارت گری اور معصوم انسانوں کے خون ناحق کا حساب لینے اور قانون شکنوں پر ہاتھ ڈالنے والی کوئی اتھارٹی باقی نہ رہے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو اس وقت کراچی میں ہو رہا ہے۔

(عرفان صدیقی۔۔۔ نقش خیال)

☆ تبری بھیجیے مشرف کی ایمان داری کی قسمیں کھانے والے نمک خواروں پر' جس شخص نے بحیثیت کیڈٹ چند سو روپے کے کل اثاثوں کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ آج اربوں روپے کی جائیداد کا مالک ہے۔ مشرف کی جائیداد کا سلسلہ پاکستان سے لے کر امریکہ' برطانیہ' دبئی اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے۔

(ڈاکٹر صفدر۔۔۔ محمود صبح بخیر)

☆ امریکی ایجنڈے کے تحت لسانی تعصبات کو ہوا دی جارہی ہے۔ کراچی میں اس کارڈ کو چلادیا گیا۔

(سلیم صافی۔۔۔ جرگہ)

☆ قومیت اور لسانیت کا جذبہ وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے لوگوں کو بڑی آسانی کے ساتھ ورغلایا اور استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مشرف نے کراچی میں جو لسانی تفریق پیدا کی تھی' وہ محض اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے تھی۔ اسی طرح بلوچستان میں اس نے جو وحشیانہ آپریشن شروع کیا تھا اس کا تعلق بھی محض اقتدار سے تھا۔ وہ امریکہ سے خدا جانے کیا کیا وعدے وعید کرچکا تھا' جن پر اب بھی بڑی حکمت اور پرکاری سے عمل کیا جارہا ہے۔

(عبداللہ طارق سہیل۔۔۔ وغیرہ وغیرہ)

جائیداد ضبط

ہمارے کچھ فنکاروں کے خیال میں بھارت میں دودھ شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی صلاحیتیں کیش کروانے وہاں کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں "اصلیت" کا علم ذرا کھل کر ہوتا ہے۔ اب عدنان سمیع خان کو ہی لیجیے۔ جنہوں نے "بھارتی" بننے کے لیے ہر جتن کروالے۔ لیکن پھر بھی "پاکستانی نژاد" ہونے کے باعث معتوب ٹھہرائے گئے۔ حال ہی میں بھارتی حکومت نے فارن ایکسچینج ایکٹ کے تحت ممبئی میں ان کی 13 جائیدادیں ضبط کرلیں۔ جس کی مالیت ڈھائی کروڑ روپے بتائی جاتی ہے۔ اور ایسا صرف پاکستانی ہونے کے ناتے ان کے ساتھ ہوا ہے۔ بے چارے عدنان کو اپنی نئی بیگم روبا فاریابی کے ساتھ دربدری سہنا پڑی۔ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ اداکار دیو آنند نے اپنے پالی ہل والے بنگلے میں انہیں رہنے کی پیش کش کی ہے۔ عدنان سمیع خان ابھی تک اس کشمکش و پیچ میں ہیں کہ آخر یہ ناانصافی کیوں ہوئی؟ حالانکہ جو صورت حال وہاں کے مسلمانوں کو "بھارتی" ہونے کے باوجود درپیش ہے اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بہتری یہاں ہے کہ وہاں۔

http://www.paktunplace.com

آپ کا باورچی خانہ

صبا سحر

یوں تو باورچی خانے کا نام لیتے ہی انواع اقسام کے غذائیت سے بھرپور کھانے اور اشتہار انگیز خوشبوئیں بھوک بڑھانے لگتی ہیں اور نت نئی ترکیبیں ذہن میں آجاتی ہیں اور چونکہ یہ عید کا موقع ہے' سو دعوتوں کا بھی ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر خاتون خانہ کے ذہن میں صرف یہ ہی بات ہوتی ہے کہ "کس کی دعوت میں کیا پکانا ہے۔" یہ ایک اہم مسئلہ ہے مگر اس سے پہلے جو ضروری بات ہے وہ باورچی خانے کی صفائی اور سجاوٹ ہے' جس پر اکثر خواتین کی واجبی سی توجہ ہوتی ہے' جبکہ باورچی خانہ آپ کے گھر کا وہ حصہ ہے جہاں آپ دن کا بیشتر وقت گزارتی ہیں اور عید تہوار کے موقعوں پر تو تقریباً سارا ہی دن یہاں صرف ہو جاتا ہے' اس لیے اپنے باورچی خانہ کو محض کھانا پکانے کی جگہ نہ سمجھیں۔ اسے اپنے سگھڑاپے اور سلیقہ مندی کی دلیل بنائیں۔

نیچے دی گئی ہدایتوں کی مدد سے اپنے باورچی خانہ کو سنواریں اور صاف ستھرے' نکھرے باورچی خانہ کے ساتھ عمدہ کھانوں سے اپنی عید کا مزا دوبالا کریں۔

1 سب سے پہلے چھت اور دیواروں سے جالے اچھی طرح صاف کرلیں۔ اگر باورچی خانہ کی دیواریں سادہ ہیں اور آپ سفیدی کرنا چاہیں تو دو کلو چونا لا کر آپ خود بھی رنگ کر سکتی ہیں' کم خرچے میں باورچی خانہ نکھر جائے گا' پھر کیبنٹس صاف کرکے اس میں کوئی پھول دار کاغذ (گفٹ ریپر) بچھالیں۔ مسالوں کے ڈبے دھولیں۔

2 باورچی خانے کے فرش کو بلیچ یا تیزاب سے دھولیں' تاکہ دیواروں کے ساتھ ساتھ فرش بھی چمک جائے۔ اس کے بعد فینائل کا پونچھا بھی لگالیں۔

3 باورچی خانہ کی ایک خالی دیوار پر (اگر کیبنٹس نہ بنے ہوئے ہوں تو) کوئی بڑی سی تصویر لگالیں تو اس سے باورچی خانہ میں ایک اچھا تاثر ابھرے گا۔ عام طور پر سبزیوں اور پھلوں کی تصویر (یا پوسٹر) مناسب رہے گی۔

4 اگر باورچی خانہ میں کوئی اضافی سلیب ہو یا کاؤنٹر پر اتنی جگہ ہو کہ کھانے پکانے کے دوران تنگی نہ ہو تو چھوٹا سا پھولوں کا گلدان بھی رکھ سکتی ہیں یا اگر رکھنے کی جگہ نہ ہو تو دیوار گیر گلدستہ بھی لٹکا سکتی ہیں۔ نیز کھڑکی میں کانچ کی بوتل لگا کر آپ منی پلانٹ لگا کر بھی سجاوٹ کر سکتی ہیں۔

پھولوں سے ماحول میں ایک خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے اور پھول پودے صرف صحن یا ڈرائنگ روم کے لیے ہی مخصوص نہیں ہیں' انہیں باورچی خانہ میں مناسب جگہ پر اچھے انداز میں لگا کر آپ اپنے باورچی خانہ کو بھی ایک نئی رونق دے سکتی ہیں۔

5 اگر باورچی خانہ میں کوئی کھڑکی ہے تو سب سے پہلے اس کی جالیاں بھی بلیچ وغیرہ سے دھو کر صاف کرلیں۔ پھر اگر آپ پردہ لگانا چاہیں تو دیواروں کی رنگت کو مد نظر رکھتے ہوئے پردوں کے رنگ کا انتخاب کریں۔ ہلکے رنگ کے پردے باورچی خانہ کو کشادگی کا تاثر دیں گے۔ ہلکے رنگ کے پردوں سے سورج کی روشنی بھی مکمل طور پر پہنچ سکے گی۔ اس کے برعکس گہرے رنگ کے پردے جلد میلے بھی ہوں گے۔ تاہم ان سے باورچی خانہ کی کشادگی میں قدرے فرق پڑے گا' لیکن اگر باورچی خانہ بڑا ہے تو پھر نہایت موزوں ہیں۔

لیجئے! اس طرح آپ کا باورچی خانہ بھی عید کے لیے تیار ہے۔ اس عید پر صرف اپنے عمدہ کھانوں پر ہی نہیں' صاف ستھرے اور دلکش باورچی خانہ پر بھی داد وصول کیجئے۔

دعوت کا مینو بنانا بھی ایک مشکل امر ہے' سو آپ کی آسانی کے لیے چند ڈشز مع ترکیب کے پیش ہیں۔

اصفہانی چکن

2 عدد پیاز باریک کاٹ کر تیل میں ہلکی گلابی تل لیں۔ اسی دیگچی میں ڈیڑھ کلو چکن اور 2 کھانے کے چمچے لہسن' ادرک کا پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ ایک الگ برتن میں آدھا پاؤ دہی میں آدھی گڈی دھنیا اور 10 سے 12 ہری مرچیں کاٹ کر ڈال دیں۔ حسب ذائقہ نمک اور 3 عدد ٹماٹر باریک کاٹ کر مکس کریں۔ پھر چکن میں ملا دیں اور ہلکی آنچ پر 25 سے 30 منٹ تک پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب روغن اوپر آجائے تو سمجھیں اصفہانی چکن تیار ہے۔ تل والے نان کے ساتھ پیش کریں۔

شاہجہانی پلاؤ

آدھا کلو گوشت میں ایک درمیانی پیاز' ادرک' لہسن کا پیسٹ 2 چمچے اور حسب ضرورت پانی ڈالیں اور پکا کر یخنی تیار کرلیں۔ الگ برتن میں 3 کھانے کے چمچے تیل گرم کرکے آٹھ' دس (کم از کم) دانے بادام اور کشمش کے ڈال کر فرائی کرلیں' پھر تیار کی ہوئی یخنی شامل کردیں۔ ایک ابال آجائے تو آدھا کلو چاول دھو کر ڈال دیں اور دم لگا دیں۔ ایک الگ پتیلی میں تقریباً" آدھا پاؤ پیاز تل لیں۔ پھر اس میں ایک کپ دہی' آدھا کلو ٹماٹر' ایک چائے کا چمچہ گرم مسالا' آدھا چائے کا چمچہ سرخ پسی مرچ' ہلدی' حسب ذائقہ نمک' 5 ہری مرچیں اور آدھی گڈی ہرا دھنیا کاٹ کر ڈالیں پھر گوشت شامل کرکے بھون لیں۔ اب ایک ڈش میں چاول نکالیں اور ایک طرف گوشت مسالا رکھیں۔ سائیڈ میں ابلے ہوئے انڈے اور آلو سلائس میں کاٹ کر سجا دیں۔

لیمن جوس میکرونی

ایک پیکٹ میکرونی ابال لیں۔ 4 کھانے کے چمچے گھی میں 2 کھانے کے چمچے میدہ بھون لیں۔ اب اس میں 2 کپ دودھ' نمک اور ایک چائے کا چمچہ سفید مرچ پاؤڈر ڈالیں اور چمچہ چلاتی رہیں۔ گاڑھا ہونے پر اگر پسند کریں تو 4 کھانے کے چمچے مکھن ملا دیں۔ اب اس میں میکرونی ڈال کر ڈش میں نکال لیں۔ 2 لیموں کے رس میں 4 کھانے کے چمچے چینی گھول کر میکرونی پر چھڑک دیں اور پیش کریں۔

http://www.paksociety.com / www.pakfunplace.com

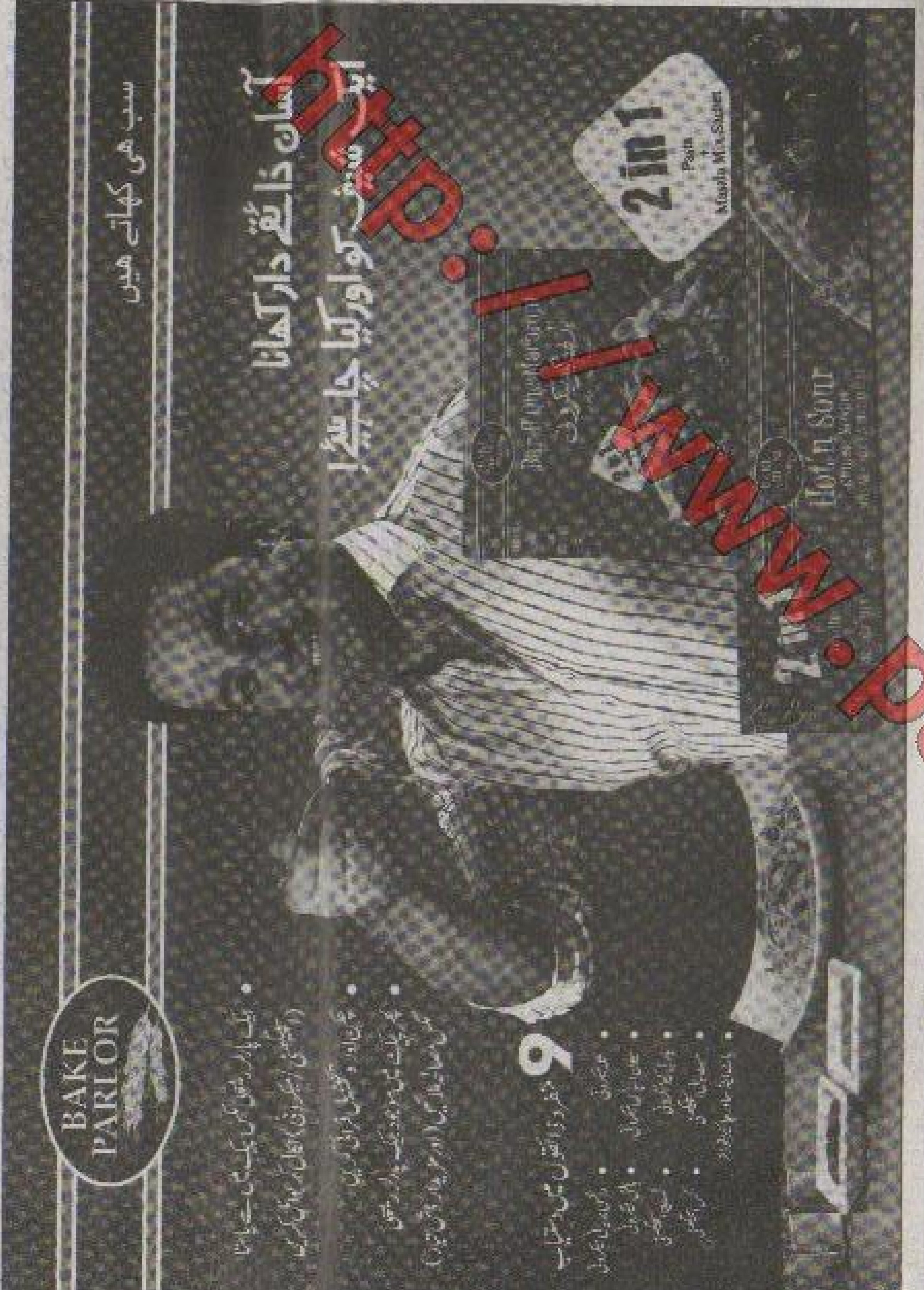

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

شکارپوری کباب

اشیا :

قیمہ	ایک کلو
لونگ (پاؤڈر)	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی (پاؤڈر)	ایک چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی (پاؤڈر)	ایک چائے کا چمچہ
جاوتری	ایک چٹکی
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک ' لہسن	چار کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
ہری مرچ	آٹھ عدد
ہرا دھنیا	آدھی گڈی
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
لہسن	دس جوے
پیاز	دو عدد
کشمش	دس عدد

ترکیب :

ایک برتن میں قیمے کے ساتھ لونگ ' دار چینی ' چھوٹی الائچی ' جاوتری ' سرخ مرچ ' لہسن ' ادرک کا پیسٹ اور نمک ملا کر گلالیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد پیس کے ان کی چھوٹی چھوٹی گیندیں بنالیں۔ کشمش سمیت باقی ہرا مسالا پیس کر ان گیندوں میں بھرلیں اور انڈے میں ڈبو کر تل لیں۔ پودینے کی چٹنی اور نان کے ساتھ پیش کریں۔

سفید گوشت

اشیا :

مٹن	ایک کلو (درمیانے پیس)
پیاز	دو عدد
لہسن ' ادرک	کٹے ہوئے 1/2 چمچہ
لونگ	8 عدد
دار چینی	ایک بڑا ٹکڑا
کالی مرچ	15 دانے
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	4 عدد
تیل	ایک کپ

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کریں اور اس میں گوشت ڈال کر اس کی بو ختم کرلیں۔ تقریباً پانچ منٹ کے وقفے سے اس میں چار گلاس پانی ڈال دیں۔ پیاز کے چار ' چار ٹکڑے کرلیں ' ہری مرچ ' نمک ' لہسن ' ادرک ' لونگ ' دار چینی اور کالی مرچ گوشت میں ڈال دیں۔ تیز آنچ پر 10 منٹ پکائیں ' پھر آنچ ہلکی کرلیں اور دیگچی پر وزن رکھیں۔ تقریباً دو گھنٹے تک پکنے دیں۔

مزے دار سفید گوشت تیار ہے ' سادہ پلاؤ اور شامی کباب کے ساتھ نوش فرمائیں۔

آلو کوفتہ بریانی

اشیا :

قیمہ	250 گرام
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن ' ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا کٹا ہوا	ایک چوتھائی کپ
ہری مرچیں کٹی ہوئی	3 عدد
زیرہ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ

http://www.pakfunplace.com

پیاز (کٹی ہوئی)	ڈیڑھ کپ
سیلا چاول	آدھا کلو
گوشت کی بوٹی	250 گرام
آلو	2,3 عدد
تیل	ایک کپ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	ایک چوتھائی کپ
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پیا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
زردہ رنگ	2 چٹکی

ترکیب :

قیمہ کو چوپر میں پیس کر نمک' مرچ' ہرا دھنیا' زیرہ پاؤڈر' پیاز باریک کر کے لہسن ادرک کا پیسٹ اور ہری مرچیں ڈال کر مکس کرلیں اور کوفتے بنالیں۔

ایک کڑاہی میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز سنہری کرلیں۔ نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' ثابت گرم مسالا' لہسن' ادرک پیسٹ اور دہی ڈال کر بھونیں۔ کوفتے ڈالیں۔ 5 منٹ بعد ابلی ہوئی بوٹیاں اور آلو بھی ڈالیں اور ایک کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ آلو گل جائیں تو ہری مرچیں' ہرا دھنیا' گرم مسالا ڈالیں۔

دیگچی میں چاولوں کی آدھی مقدار ڈالیں' کوفتے' بوٹی' آلو مسالہ ڈال کر باقی چاول ڈالیں اور زعفرانی رنگ ڈال کر دم پر لگائیں۔

نوڈل پکوڑے

اشیا :

نوڈلز	2 پیکٹ
بیسن	100 گرام
پنیر	200 گرام
سبز مرچ	باریک کٹی ہوئی 3 عدد
بند گوبھی	باریک کٹی ہوئی 1/3 کپ
پیاز	باریک کٹی ہوئی 1/3 کپ
سرخ مرچ	پسی ہوئی ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

نوڈلز کو دو منٹ تک ابلتے پانی میں ابالیں۔ ٹیسٹ میکر ڈالیں اور الگ رکھ لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پیاز' مرچ' گوبھی' شملہ مرچ اور دیگر اجزا نوڈلز میں شامل کرلیں۔ الگ برتن میں نمک ڈال کر بیسن گھول لیں۔ اب نوڈلز اور دیگر اجزاء کا آمیزہ اس میں ڈال دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرلیں۔ پھر پکوڑے تلیں براؤن ہونے پر نکال لیں۔

شیر خرما

اشیا :

سویاں	ایک چوتھائی پیلٹ
دودھ	دو کلو
چینی	3 پاؤ
بادام	حسب مرضی
کھوپرا	حسب مرضی
چھوہارے	ایک پاؤ

ترکیب :

دودھ اچھی طرح گرم کرلیں' چھوٹی الائچی کوٹ کر ڈال دیں۔ جب دودھ اچھی طرح پک جائے تو چینی اور چھوہارے ڈال دیں۔ (چھوہاروں کو 2 گھنٹے قبل گرم پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور جب دودھ میں ڈالنے لگیں تو گٹھلی نکال کر 2 ٹکڑے کریں۔) چھوہارے نرم ہو جائیں تو باقی میوہ بھی ڈال دیں۔ اب سویاں ڈال کر پکائیں۔ ہلکا گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔

☼

[illegible]

بعض لوگ اپنے اوپر مایوسیاں طاری کرلیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ مایوسیوں سے چھٹکارا پائیں اور زندگی کے صحیح رخ کی جانب سوچیں۔ ہماری زندگی میں تکلیفیں بھی ہیں۔ بعض اوقات کئی تکلیفیں ایک ساتھ گھیرتی ہیں۔ ان سے گھبرا کے یا خوف زدہ ہونے کے بجائے ان کے حل کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سے چھٹکارے کے بارے میں سوچنی چاہیے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس پر کبھی کوئی تکلیف نہ آئی ہو اور آخر کار اس پر اس نے قابو نہ پالیا ہو یا خود بخود حالات ایسے نہ پیدا ہو گئے ہوں کہ اس تکلیف سے چھٹکارا مل گیا ہو۔ اس لیے یقین رکھنا چاہیے کہ جس طرح ماضی میں آپ نے تکلیفوں اور مصیبتوں سے چھٹکارا پالیا' اسی طرح موجودہ یا آنے والی تکلیفوں یا مصیبتوں سے بھی نجات حاصل کرلیں گے۔

ش۔و۔ع

ہمارے مذہب نے نامحرم کے لیے کچھ فاصلے رکھے ہیں۔ ان کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ بعض اوقات ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ حالات بگڑ جاتے ہیں' خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے رشتوں میں جہاں بے تکلفی ہوتی ہے اور ایک ہی گھر میں رہتے ہیں' وہاں پر عورتیں بہت لاپروائی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اور نتیجہ یہی نکلتا ہے جو آپ کے معاملے میں ہوا۔ اس سلسلے میں سراسر بے قصور آپ بھی نہیں۔ آپ کے شوہر لاپروا تھے۔ آپ میں دلچسپی نہیں لیتے تھے چنانچہ آپ نے بھی دیور میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ میری یہ بات اگرچہ آپ کو کڑوی لگے گی لیکن خود کو ٹٹول کر دیکھیں تو آپ محسوس کریں گی یہ حقیقت ہے کیونکہ آپ کو یہ بھی احساس تھا کہ آپ خوبصورت ہیں آپ کے دل کا چور اس سے بھی ظاہر ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ کہیں مجھے اس سے محبت نہ ہو جائے۔ میری نظر میں مناسب یہ ہے کہ آپ اسے اپنے چھوٹے بھائی یا بیٹے کی طرح دیکھیں۔ مجھے تو آپ اس معاملے میں مجرم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ کے دیور اپنے پیروں پر کھڑے ہیں تو ساس کو مشورہ دیں کہ اس کی شادی کردیں۔ آپ کی ساس اگر سنجیدہ اور بردبار طبیعت کی مالک ہیں تو انہیں بتادیں۔ اور خود کوشش کریں کہ دیور سے ایک مناسب انداز میں فاصلہ رکھ کر بات کریں۔ اور انہیں احساس دلائیں کہ وہ آپ کے بھائی یا بیٹے کے طور پر ہیں بصورت دیگر گناہ کے ساتھ ساتھ تباہیاں اور بربادیاں آپ کا مقدر بن جائیں گی اور اس وقت پچھتانے سے حاصل کچھ نہ ہوگا۔

☼ ☼ ☼

http://www.pakfunplace.com

ل۔ ت

اچھی بہن! صورت حال یہ ہے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بڑے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ علیحدہ ہو چکے ہیں۔ والد صاحب کی دوسری بیگم صاحبہ آپ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ والد صاحب نے کبھی بھی آپ کو کوئی پیسہ نہیں دیا۔ تو ان حالات میں آپ کو خود ہی ہمت کرنا پڑے گی۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ آپ ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہیں' کہیں نہ کہیں اچھی جاب مل سکتی ہے۔ مسئلہ خود اعتمادی کا ہے۔ اعتماد آپ کو اپنے اندر خود پیدا کرنا ہوگا۔ دل سے ناکامی کا خوف نکال دیں اور طے کرلیں کہ جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ اپنی کوشش میں کمی نہیں کرنی ہے۔ یہ سوچ آپ کو نتائج سے بے پروا کردے گی اور خوف دل سے نکل جائے گا۔

ایک بات مزید کہ آپ کے خط اور تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ خود اعتماد ہیں بلکہ باصلاحیت بھی ہیں' یہ صرف آپ کی سوچ ہے جو آپ کو کچھ نہیں کرنے دیتی۔ اپنی سوچ کا رخ بدل لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

آپ کی بہن یا بھائی نے کبھی آپ کی شادی کے بارے میں نہیں سوچا؟ آپ اس سلسلے میں اپنی بہن سے بات کریں۔ اس مسئلہ کا ایک حل آپ کی شادی بھی ہے۔

ح۔ م..... سیالکوٹ

آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ شوہر خالہ زاد تھے۔ لازماً" آپ نے پہلے دیکھا ہوا تھا۔ انہیں جانتی بھی ہوں گی۔ اب شادی کے ــــ صرف سات ماہ بعد آپ کی کیفیت یہ ہے کہ آپ ان کو قبول نہیں کرپا رہی ہیں۔ زندگی سے بیزار ہو گئی ہیں۔ موت کی دعائیں مانگتی ہیں۔ بال گر گئے ہیں۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں حتیٰ کہ دعا مانگنے اور نماز پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ آپ کو یقین ہے کہ آپ کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

پہلی بات تو یہ جو دعا آپ نے مانگی' وہ ہو سکتا ہے آپ کے حق میں بہتر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

آپ کی پریشانی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ آپ کو اللہ نے جو کچھ دیا ہے۔ اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے دوسروں کو دیکھتی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے کزن کو اچھی سسرال اور شوہر ملا ہے۔

آپ کے شوہر پڑھے لکھے بر سر روزگار ہیں بقول آپ کے اچھے انسان ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ انہیں ذہنی طور پر قبول نہیں کرپا رہی ہیں۔ آپ تو خود نہیں جانتیں کہ وہ آپ کو کیوں پسند نہیں ہیں۔

اچھی بہن! آپ کو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے خود کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ لیکن فیصلہ علیحدگی ہے تو اس کے لیے آپ چند حقائق بھی مد نظر رکھیں۔

(1) کیا علیحدگی کی صورت میں آپ کے والدین آپ کو قبول کرلیں گے۔
(2) شوہر سے علیحدہ ہو کر آپ کے اخراجات کون ـــ اٹھائے گا۔ آپ کہیں جاب وغیرہ کر سکتی ہیں؟
(3) علیحدگی کے بعد کسی ایسی جگہ شادی کا امکان ہے جو آپ کی مرضی کے مطابق ہو۔

بہتر تو یہی ہے کہ آپ سمجھوتا کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ہمارے مذہب نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ خلع لے سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

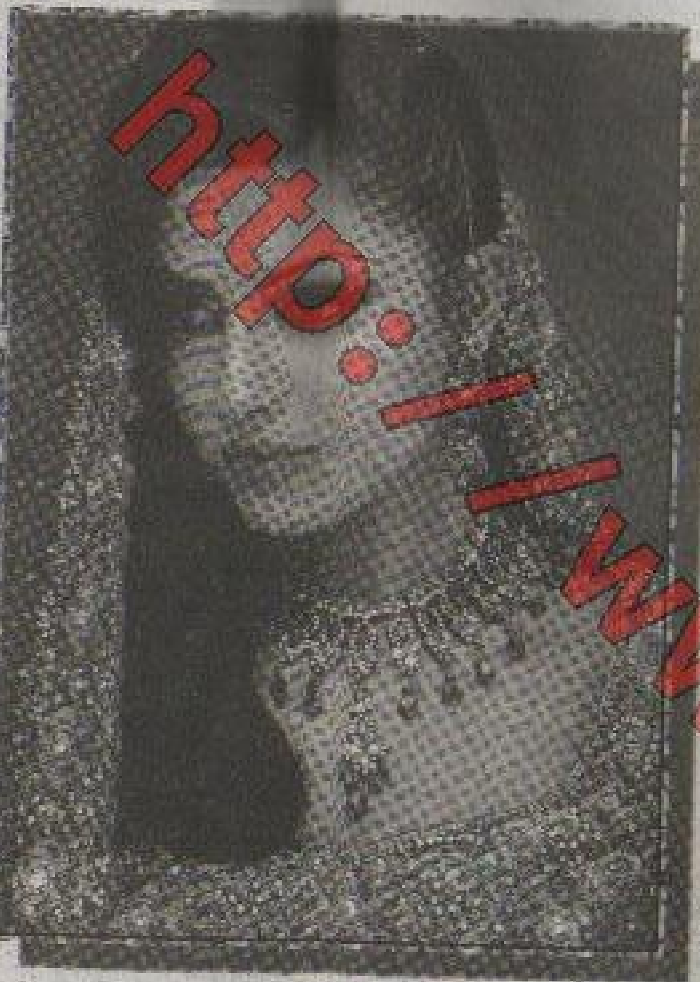

امتہ الصبور

بیوٹی بکس

عید الفطر کی خوشیاں چار سو پھیلی ہوئی ہیں۔ ویسے تو ہر خاتون کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ سب سے خوب صورت' سب سے منفرد نظر آئے' مگر عید تہوار کے مواقع پر یہ خواہش کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے' لہٰذا اس کے لیے کئی جتن بھی کیے جاتے ہیں' جب ہی تو فلک پر عید کا چاند نظر آتے ہی زمیں کی گود بھی کئی "چاندوں" سے بھر جاتی ہے۔

رمضان المبارک میں اکثر خواتین سحر و افطار کے خصوصی پکوانوں کی تیاری میں اپنے آپ کو مکمل نظر انداز کیے رکھتی ہیں' پھر آخری عشرے میں گھر کی خصوصی تزئین و آرائش اور بازاروں کے چکر خود پر توجہ دینے سے محروم رکھتے ہیں۔ ایسے میں چہرہ کمھلا جاتا ہے۔ اس لیے آج ہم ایک نہایت سادہ فیشل' مینی کیور اور پیڈی کیور بتا رہے ہیں' جو آپ گھر پر باآسانی کر سکتی ہیں۔

☆ سب سے پہلے کسی معیاری صابن یا فیس واش سے چہرہ دھو کر خشک کرلیں۔

☆ اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف کرکے ہیئر بینڈ یا

http://www.pakfunplace.com

اسکارف سے باندھ لیں۔

☆ چہرے پر کلینزنگ کریم لگا کر مساج کریں۔ مساج کرتے وقت ہاتھوں کو نیچے سے اوپر کی طرف حرکت دیں۔ کلینزنگ کریم نہ ہو تو اس کی جگہ سیب کا گودا یا دہی بھی استعمال کی جاسکتی ہے یا پھر تھوڑا سا دودھ (کچا ہو تو بہتر ہے) روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں اور دس منٹ بعد چہرہ سادہ پانی سے دھولیں۔ یہ بھی بہترین کلینزر ہے۔

کلینزنگ کریم، دہی یا سیب کے گودے سے دس منٹ تک مساج کریں، پھر نرم اسفنج یا روئی بھگو کر اس سے چہرہ صاف کریں۔

☆ کوئی اسکرب کریم چہرے پر لگا کر ایک بار پھر مساج کریں۔ اسکرب کریم نہ ہو تو کسی بھی موسمی پھل کا گودا چہرے پر لگا کر تقریباً دس منٹ تک مساج کریں۔ نرم اسفنج یا روئی بھگو کر اس سے چہرہ صاف کرلیں۔

☆ اب ماسک لگائیں۔ ماسک کا انتخاب اپنی جلد کی مناسبت سے کریں۔ خشک جلد والی خواتین موئسچرائزنگ ماسک، چکنی جلد والی کلینزنگ ماسک استعمال کریں۔ نارمل جلد کے لیے کوئی بھی معیاری ماسک استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ماسک نہیں ہے تو آپ ماسک گھر پر بھی تیار کرسکتی ہیں۔

☆ ایک انڈے کی سفیدی لیں۔ اس میں ایک کھانے کا چمچہ شہد شامل کرکے خوب پھینٹیں۔ چکنی جلد والی خواتین اس میں چند قطرے لیموں کا رس بھی ملالیں، جبکہ خشک جلد والی خواتین چند قطرے روغن بادام ملالیں۔ یہ آمیزہ چہرے پر لگالیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔

چہرے کی صفائی اور فیشل کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر بھی توجہ دیں، کیونکہ عید روز روز نہیں آتی، لہٰذا اس دن آپ کو سر سے لے کر پیر تک جگمگانا ہے، کچھ اس طرح کہ عید کا چاند بھی آپ سے شرما جائے۔

☆ نیم گرم پانی میں شیمپو اور ڈیٹول (جراثیم کش محلول) کے چند قطرے شامل کرکے ہاتھ اور پیر پانچ منٹ تک بھگوئے رکھیں۔ نرم ٹوتھ برش کی مدد سے ہاتھوں، پیروں کے ناخن، ان کے اطراف کی جلد اور پیروں کی ایڑیاں صاف کریں۔ اس سے میل کچیل اور جلد کے مردہ خلیات صاف ہوجائیں گے۔ اب سادہ پانی سے ہاتھ پاؤں دھولیں۔

☆ کوئی بھی موئسچرائزنگ لوشن یا کریم ہاتھوں پیروں پر لگا کر دس منٹ تک مساج کریں۔ اس سے دوران خون تیز ہوگا اور جلد میں شگفتگی آئے گی۔

☆ اب نیل کٹر کی مدد سے ناخنوں کو شیپ دے لیں۔ پھر فائلر سے انہیں فائل کرلیں۔

☆ آخر میں لیموں کا رس یا شہد روئی کی مدد سے ہاتھوں، پیروں اور ناخنوں پر لگائیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔

☆